بیلی راجپوتوں کی ملکہ

تحریر: نمرہ احمد

پیش لفظ

''بیلی راجپوتاں کی ملکہ'' میری دوسری کتاب ہے۔ اس میں دو کہانیاں شامل ہیں۔ ''بیلی راجپوتاں کی ملکہ'' اور ''مہر النساء'' ان دونوں میں ایک مماثلت ہے' اور وہی مماثلت ہم میں سے تقریباً ہر شخص کی سب سے بڑی خامی ہے۔ ہم انسانوں کو بلیک اینڈ وائٹ دیکھنا چاہتے ہیں' اور کہانی کے کرداروں کے ساتھ بھی ہمارا یہی رویہ ہوتا ہے۔ مرکزی کردار' جنہیں ہیرو یا ہیروئن کہا جاتا ہے' کی کسی خامی یا کمزوری کو ہمارے ہاں پسند نہیں کیا جاتا۔ جبکہ حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں جہاں کوئی اچھی بات ہوتی ہے تو ساتھ کچھ بری باتیں بھی اس کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہیں' مگر ہمیں لوگ تب تک اچھے لگتے ہیں جب تک ان کی اچھی سائیڈ ہمارے سامنے رہتی ہے' اور جیسے ہی ان کی کوئی بری بات کھلے' ہم فوراً ان کو judge جج کرنے لگتے ہیں' اور پھر اپنی زندگیوں میں کتنے ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو ہم اپنی اسی judgemental سوچ کی بنا پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم خود نہیں بدلتے' دوسروں کو بدلنا چاہتے ہیں۔ مہر النساء اور ماہا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

بس اتنا کہوں گی کہ لوگوں کو معاف کرنا سیکھیں' ان کے عیوب پہ ان کو عار نہ دلائیں' ان کی بری باتوں کے پیچھے نہ لگ جائیں۔ ان کو جج مت کریں۔ ہم انسانوں سے محبت صرف تب ہی کر سکتے ہیں جب ان کو جج کرنا چھوڑ دیں۔ سو رب کے بندوں کو معاف کر دیا کریں' بندوں کا رب آپ کو بھی اس بڑے دن معاف کر دے گا۔

آخر میں ''القریش پبلی کیشنز'' کی نہایت ممنون ہوں جنہوں نے بہت خلوص سے میری اس کتاب کا اہتمام اور اپنے نتائج سے مجھے بے حد مطمئن اور مشکور کیا۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

جزاک اللہ خیر۔

نمرہ احمد

جنوری 2011

رات کا دوسرا پہر دم توڑنے کو تھا، سیاہ آسمان پہ ہر سُو تارے بکھرے تھے۔ پورے چاند کی روشنی درختوں کے پتوں کو چمکا رہی تھی۔ وہ بیلی کے جنگل کے درخت تھے، اونچے، مضبوط، تناور اور اتنے گھنے کہ چاندنی گھاس کو نہیں چھو پاتی تھی۔

ان اونچے درختوں کے سائے جنگل کے بیچ بنی شاہراہ پر لمبے گر رہے تھے۔ ایسے میں جب جانور بھی خاموش ہو گئے تھے، گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سناٹے کو توڑ رہی تھی۔

دونوں اطراف سے جنگل کے بیچ گھری کچی پکی سڑک پر ایک بگھی دوڑتی آ رہی تھی۔

بگھی ساگوان کی تھی۔ اس پہ دورویہ ایک مہتابی روشن تھی اور اس میں دو عربی گھوڑے جُتے ہوئے تھے، چکنے چکنے سفید گھوڑے۔ ان کے منہ پر ریشمی پونیاں اور بدن پہ چم چم کرتی جھالر کی دھجیاں تھیں۔

باہری نشست پہ کوچ بان بیٹھا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں ایک چابک اور دوسرے میں مرصع لگام تھی۔ وہ لگام تھامے چابک مارتا فکرمندی سے بار بار اوپر آسمان کو دیکھتا تھا، جہاں صبح کا ستارہ اسے منزل بتا رہا تھا۔

کوچ بان کے پیچھے بگھی کے اونچے دروازے سختی سے بند تھے۔ جنگل کے درخت اسے دیکھ رہے تھے، مگر کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کوچ بان کی سواری کون ہے یا کوئی ہے بھی کہ نہیں۔

بگھی برق رفتاری سے جنگل کے بیچوں بیچ سڑک پہ بھاگتی جا رہی تھی۔ کوچ بان پریشانی سے گردن اُٹھا کر وقفے وقفے سے صبح کے ستارے کو دیکھتا تھا اور ذرا کی ذرا پیچھے بند بگھی پہ نظر ڈالتا۔ اس کے ہاتھوں میں اضطراب تھا اور انداز میں عجلت۔

''رام ناتھ!'' دفعتاً بند بگھی میں سے نسوانی آواز گونجی، ٹھہری ہوئی، مطمئن سی، مگر تمکنت و

بے نیازی سے بھرپور۔

کوچ بان کی لگام پہ گرفت پل بھر کو ڈھیلی پڑ گئی، بگھی کے پہیے قدرے سست ہوئے۔

''جی مالکن؟''

''نیلی کتنا دور ہے ابھی......؟''

''بس چند کوس رہ گئے ہیں مالکن! بھگوان نے چاہا تو صبح ہونے سے قبل ہم حویلی میں ہوں گے۔'' کہہ کر اس نے چابک زور سے گھوڑے کو رسید کی۔ پہیے پھر سے تیز ہو گئے۔

''جلدی کرو رام ناتھ!'' نزاکت اور تھکان بھری خوب صورت آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ''جی مالکن'' کہہ کر رفتار بڑھانے لگا۔ بند بگھی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اب وہ نہیں بولے گی، کوچ بان کو علم تھا۔ یہ چند فقرے بھی پورے سفر میں پہلی بار اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

کوچ بان رام ناتھ ابھی صبح کے ستارے کو دیکھ کر سمت کا حساب ہی لگا رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل سے چند گھڑ سوار نکل کر سامنے سڑک پر آ گئے، ایسے کہ بگھی کا راستہ ایک دم سے رُک گیا۔ گھوڑے زور سے ہنہنائے، رام ناتھ نے تیزی سے لگام کھینچ لی۔

اسے لگام کھینچنا ہی تھی، کیونکہ اب وہ ہو چکا تھا، جس کے باعث وہ رات کے وقت جنگل کے سفر سے ڈرتا تھا۔ نیلی کا جنگل رات کے اس پہر ہنڈاروں کی آماجگاہ ہوتا تھا، اسے علم تھا۔ اس نے بے اختیار ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا۔

بگھی رُکی کھڑی تھی۔ سامنے چار گھوڑے تھے۔ ان میں سے تین کے سوار گھوڑوں سے اُتر کر بگھی کے قریب آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی، دوسرا برچھیت تھا، جبکہ تیسرے کے پاس بڑا سا راجپوتی بلم تھا۔

چوتھا گھوڑا قدرے پیچھے کھڑا تھا، اس کا سوار گھوڑے کی پشت پہ بیٹھا تھا۔ وہ نیچے نہیں اُترا تھا۔ اس کے منہ پہ سیاہ ڈھاٹا بندھا تھا، بس آنکھیں واضح تھیں، باقی چہرہ ڈھاٹے کے پیچھے گم تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا نیزہ تھا جو اس نے گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

تینوں سوار بگھی کے قریب آئے، ان کے چہرے بھی نقاب میں ڈھکے ہوئے تھے۔ برچھیت کے دوسرے ہاتھ میں دستی تھی۔ یہ چھوٹی سی لکڑی تھی، جس کے اوپر دھات کا بڑا سا پیالہ جڑا تھا، اس کے اندر شعلہ جل رہا تھا۔

برچھیت نے دستی کوچ بان کے چہرے کے سامنے لہرائی، ایک دم روشنی سے گھبرا کر کوچ بان نے چہرہ پیچھے کیا۔

بندوق بردار آگے بڑھا۔

''نیچے آؤ۔'' اس کی بندوق کوچ بان پہ تنی تھی، وہ خاموشی سے نیچے اُتر آیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''امرتسر سے، مہاراج!'' رام ناتھ نے ہاتھ عاجزانہ انداز میں جوڑے۔

''کہاں جانا ہے؟''

''گاؤں جا رہے ہیں مہاراج!''

''کون سے گاؤں؟''

''بیلی راجپوتاں، مہاراج۔''

''بیلی میں کیا کام ہے؟'' بندوق بردار غرایا۔

''اپنا گھر ہے مہاراج، پریوار ہے۔''

''ہوں۔'' بندوق بردار نے بگھی پہ نگاہ ڈالی۔'' ساتھ کون ہے؟'' رام ناتھ نے تھوک نگلا۔

''میری پتنی ہے، مہاراج!''

''امرتسر کیوں گئے تھے؟'' وہ سوال در سوال کیے جا رہا تھا۔

''میری پتنی بیمار ہے، اسے بڑے ہسپتال دکھانے لے گیا تھا۔''

برچھیت دستی اونچی کیے بگھی کو بغور دیکھ رہا تھا، یکدم چونک اٹھا۔'' یہ بگھی تو راجپوتوں کی ہے۔'' پھر اس نے شعلے کا رخ رام ناتھ کی جانب کیا۔'' تم ٹھاکر رگھوناتھ کے ملازم ہو؟''

وہ جو سمجھا تھا کہ گلوخلاصی ہو گئی، گڑبڑا کر رہ گیا۔'' جج......جی مہاراج!''

''اس کا مطلب ہے یہ گاؤں کا آدمی ہے۔'' بلم بردار نے آہستہ سے دونوں سے کہا، جیسے مطمئن ہو، مگر برچھیت مطمئن نہیں تھا۔ تم اپنی بیوی کو ٹھاکروں کی بگھی میں کیوں لے جا رہے ہو؟''

''وہ......مہاراج......دراصل......'' رام ناتھ سے بات نہیں بن رہی تھی۔

''دیکھو، سیدھی طرح بتاؤ، ساتھ کون ہے؟ تمہاری بیوی یا ٹھاکروں کا کوئی فرنگی مہمان؟''

چوتھا گھڑ سوار اسی طرح نیزہ رکھے سارا ماجرا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

''مہاراج ......دراصل...'' اور اس سے پہلے کہ وہ بگڑی کو سنورانے کی سعی کرتا، بگھی کے اندر سے آواز ابھری۔

''رام ناتھ!'' فضا میں جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔ کوچ بان نے تھک کر سر جھکا دیا۔ اب جھوٹ سے کام نہیں چلنا تھا۔

''جی مالکن!'' اس کی آواز پست تھی۔ مالکن کے لفظ پہ تینوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا، پھر بندوق بردار نے گردن موڑ کر گھڑ سوار کو اشارہ کیا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بندوق بردار نے جواباً بندوق مزید تان لی۔

''کون لوگ ہیں رام ناتھ؟'' راہ گیر ہیں، یا کمپنی بہادر کے سپاہی؟'' آواز اب بھی بے نیاز سی تھی، مطمئن اور ٹھہری ہوئی، بے فکری سی۔''

''راہزن ہیں مالکن!'' وہ بگھی کے قریب ہو کر ہولے سے بولا، پھر ان کی جانب مڑا۔

''پردے کی بی بی ہے مہاراج! ہمیں جانے دیجئے، ہمارا بیلی پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''پردے کی بی بی رات کے اس پہر تمہارے ساتھ کیوں ہے گاڑی بان؟'' بندوق بردار کے لہجے میں طنز در آیا تھا۔ برچھیت نے بھی قدرے چوکنا ہو کر برچھی کا رخ رام ناتھ کی طرف کر لیا۔

چوتھا سوار اسی طرح خاموشی سے گھوڑے کی لگام تھامے اس کی پیٹھ پہ بیٹھا تھا۔

''مہاراج، ہمارا بیلی پہنچنا...''

''یہ کیا پوچھ رہے ہیں رام ناتھ؟'' بند دروازے کے پیچھے سے پھر سے آواز ابھری، جیسے ویرانے میں کسی قدیم مندر کی ساری گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

''یہ پوچھتے ہیں کہ......'' رام ناتھ بگھی کے قریب آیا۔'' کہ اندر فرنگی تو نہیں ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں، مالکن، یہ بیلی راجپوتاں کے ڈاکو ہیں، صرف فرنگیوں کو لوٹتے ہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔'' ڈھکے چھپے الفاظ میں نہایت ادب سے اپنی سواری کو خاموش رہنے کا کہہ کر وہ راہزنوں کی جانب متوجہ ہوا۔

''مائی باپ!'' اس نے لکھنؤ کے باسیوں کی طرح عاجزانہ ہاتھ جوڑے۔'' بی بی صاحب کی بولی ہے۔'' وہ جانے کون سا حیلہ بہانہ گھڑنے کو تھا کہ وہ آواز پھر سے گونجی۔

''رام ناتھ!'' اب کے لہجہ سخت تھا، تحکم اور رعونت سے بھرپور۔ ''انہیں بتاؤ کہ تمہاری سواری فرنگی ہی ہے۔''

اس سے پہلے کہ کوچ بان جو اپنے قدموں پہ کلہاڑی مارنے والے الفاظ پہ بھونچارہ گیا تھا، یا وہ تینوں راہزن جن کے لئے یہ بہادری غیر متوقع تھی، سنبھلتے بگھی کا دروازہ اندر سے کھلا، سب کی نگاہیں ادھر کو اٹھیں۔

دروازہ کھلتا چلا گیا، اس کے پیچھے کم خواب کا بھاری پردہ پڑا تھا، ایک سپید ہاتھ باہر نکلا اور پردہ ہٹا دیا۔ پرچھیت کی دستی کا شعلہ ہوا سے دھوانسا جارہا تھا، مگر مدھم روشنی میں بھی اندر کا منظر قدرے واضح تھا۔

وہ اندر نشست پہ بیٹھی تھی، یوں کہ رُخ سامنے کو تھا، اس نے سفید میکسی زیب تن کر رکھی تھی۔ جو پاؤں تک آتی تھی، پاؤں میں نازک سی کولہاپوری جوتی تھی، جس کے اوپر سنہرے پکھراج جڑے تھے۔ میکسی کی چوڑی دار تنگ آستینیں کلائیوں تک آتی تھیں، اس کے سپید ہاتھ گود میں دھرے تھے اور ان میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ ہاتھوں کے نیچے ایک بڑا سا سفید ہیٹ رکھا تھا۔ لباس کا گھاٹ کھلا تھا، گردن راج ہنس کی سی لمبی تھی، جس سے ہیرون کا ایک نازک ہار چپکا ہوا تھا۔ راہزنوں کی نگاہیں بے اختیار اس کے پاؤں سے ہوتی چہرے پہ اٹھتی چلی گئیں۔

اٹھی ہوئی تیوری، مغرور سی ناک، موم کی سی گوری جلد، بھرے بھرے ہونٹ، جن پہ سرخی لگی تھی، سنہری مائل بھورے بال، اس نے اکٹھے کر کے بائیں کندھے پہ ڈال رکھے تھے، جو ان کی نگاہ سے پوشیدہ تھا کہ ان کے سامنے اس کا داہنا رخ تھا اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں، جن کے گرد بہت گہرے کاجل کا حاشیہ کھنچا تھا، آنکھوں کا رنگ بہت چمکیلا سنہری اور کاجل اتنا گہرا تھا، جیسے سیاہ پانی میں سورج جھلملا رہا ہو۔

رُعب حسن تھا یا تمکنت جمال کہ اسلحے پہ ان تینوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاید ایک لمحے کو ان کو حقیقت پہ خواب کا گمان ہوا تھا، جیسے آسمانوں سے اتر کر کوئی اپسرا ان کے سامنے آ گئی ہو۔

''رام ناتھ! ان سے پوچھو کہ رات کے اس پہر مسافروں کو اذیت دینے سے کیا حاصل؟'' ہلکے سے گردن ان کی جانب موڑے وہ نخوت سے بولی۔

''گاڑی بان! اپنی میم صاحب کو کہو، اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔'' بندوق بردار

سنبھل چکا تھا۔

رام ناتھ نے بے چارگی و بے بسی سے بگھی کے کھلے دروازے کو دیکھا۔

وہ اسی اعتماد اور تحقیر سے اُن کو دیکھ رہی تھی، بندوق بردار کو بات دہرانی پڑی۔

''میم صاحب! اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔''

''تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔'' اس کے اعتماد میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔'' نہ ہی میں بھیک دینے کی قائل ہوں۔''

''ہم بھکاری نہیں ہیں۔'' برچھیت غرّایا۔

''بھکاری اور ڈاکو میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ رہی زیور کی بات تو وہ میں تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔''

''مادام! آپ کا لہجہ ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ زبردستی کریں۔''

اس کی سنہری آنکھوں میں ناگواری در آئی، خوب صورت پیشانی پہ شکن ابھری۔

''اگر ملکہ عالیہ سے باغی ہوئے اہل ہند، انگریز شرفاء کی عورتوں کا احترام بھول گئے ہیں تو رام ناتھ! انہیں بتاؤ کہ یہ یہاں محکوم ہیں اور ہم حاکم۔''

''نہ ہم محکوم ہیں اور نہ ہی آپ حاکم۔ آپ غاصب، چور اور عہد شکن ہیں، آپ نے ہمارے ہند عظیم کو لوٹا ہے، ہمارا مال، ہماری عزتیں، ہمارا تخت و تاج لوٹا ہے۔ ہم صرف آپ سے اپنی دولت واپس لے رہے ہیں، عزت اور سلطنت کا حساب پھر کبھی لیں گے۔ زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں میم صاحب!''

اس نے بندوق پھر اونچی کی۔ منہ پہ بندھے ڈھاٹے سے محض اس کی آنکھیں واضح تھیں۔ چھوٹی چھوٹی، اہل فرنگ کے لئے نفرت سے لبریز آنکھیں۔

چوتھا گھڑ سوار خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے بھیک دینے کی عادت ہے، نہ لوٹے جانا پسند ہے۔'' عادتاً وہ گردن سے چپکے ہار پہ انگلی پھیرنے لگی۔'' فراموش کر دو کہ تم مجھ سے میرا زیور اتروا نا تو کیا، اس بگھی کے چند قدم قریب بھی پھٹک سکتے ہو۔'' اب اس کے لہجے میں حقارت در آئی تھی۔

''ہم یہ دونوں کام کر سکتے ہیں، گولی بھی چلا سکتے ہیں۔''

''فضول۔'' اس دیوی جیسا حسن و تمکنت رکھنے والی لڑکی نے تمسخرانہ سر جھٹکا۔ ''خوش فہمیاں انسان کو بہت ذلیل کرواتی ہیں۔'' کہتے کہتے اس نے یوں ہی ایک ہاتھ سے بال سمیٹ کر دائیں کندھے پہ ڈال دیئے، جوان کے سامنے تھا۔

اس عمل کے دوران جب وہ بھورے سنہری بالوں کو ہاتھ سے سمیٹے دوسرے شانے پر لا رہی تھی، دستی کا شعلہ اور چاند کی روشنی باہم ہو کر خاص زاویے سے اس پہ پڑی کہ ایک لمحے کو اس کے بالوں میں کچھ زور کا چمکا، اتنا کہ چمک سے دور گھوڑے پہ بیٹھے سوار کی آنکھیں چندھیا گئیں اور بے اختیار اس نے روشنی سے بچنے کو سر پیچھے کیا۔

بس ایک لمحے کا عمل تھا کہ روشنی غائب ہو گئی اور پھر اس نے دیکھا، اس کے لمبے سنہری بالوں میں ایک لڑی تھی، موتیوں کی لڑی، جیسے ایک موٹی سی لٹ میں جڑ سے سرے تک سفید موتی پرو دیے ہوں، اس کے بال کمر تک گرتے تھے، مگر موتیوں کی لڑی کاندھے اور کہنی کے وسط میں ختم ہو جاتی تھی۔

''ہم خوش فہم نہیں ہیں میم صاحب! مگر آپ ہمیں مجبور کر رہی ہیں کہ آپ کے ساتھ زبردستی کی جائے۔'' بندوق بردار جیسے ضبط کھو کر آگے بڑھا، رام ناتھ نے گھبرا کر سامنے آنا چاہا، مگر بندوق کی نال نے اس کے قدم روک دیے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ راہزن بگھی تک پہنچتے، بیلی کے جنگل نے وہ بھاری آواز سنی۔

''نادر!'' سب نے یہاں تک کہ رام ناتھ اور بگھی میں بیٹھی لڑکی نے بھی چونک کر راہزنوں کے عقب میں دیکھا، جہاں وہ گھڑ سوار اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔

''کیا......؟'' بندوق بردار جس کا نام غالباً نادر تھا، حیرت سے پلٹا۔

''انہیں جانے دو۔''

نادر کو جھٹکا لگا۔ ''مگر......''

''میں نے کہا نا، انہیں جانے دو۔'' اس کی آواز اب دھیمی ہو گئی تھی، مگر جنگل کے سناٹے نے محسوس کیا تھا کہ اس میں دباؤ یا غصہ بھی تھا۔

''کیسے جانے دوں؟ زیور دیکھا ہے تم نے؟'' نادر تلملا کر بڑبڑایا۔ چند لمحے خاموشی چھا گئی، پھر گھڑ سوار اور بھی مدھم بولا۔

''اسے جانے دو نادر! یہ بیلی راجپوتاں کی ملکہ ہے، اسے جانے دو۔''

پھر وہ رکا نہیں، گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کو ایڑھ لگا دی۔ سفید گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ پہ لادے دوڑتا ہوا جنگل کے بیچ درختوں میں گم ہو گیا۔

ان تینوں نے ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اگلے ہی پل اپنے اپنے گھوڑوں پہ سوار ہو کر انہیں اس کے پیچھے دوڑاتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، مگر جاتے سمے وہ دیکھ چکی تھی کہ نادر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں غصے اور ناگواری سے بھری تھیں۔

رام ناتھ نے گہرا سانس لیا اور اسے دیکھا، وہ جیسے کسی سوچ میں گم ڈھول کے غبار کو نیچے بیٹھتا دیکھ رہی تھی، جو گھوڑوں کے قدموں نے اڑایا تھا۔

''اگر انہیں علم نہ ہوتا کہ آپ فرنگی ہیں تو وہ ہمیں نہ روک سکتے مالکن۔'' نگاہیں جھکائے رام ناتھ نے ادب سے اسے اس کی ''غلطی'' کا احساس دلایا۔ وہ کچھ سوچتی دور جنگل میں دیکھتی رہی۔

''رام ناتھ!'' وہ جو مڑ کر آگے نشست سنبھالنے جا رہا تھا، وہ پکار پہ واپس پلٹا۔

''جی مالکن!''

''یہ لوگ کون تھے؟''

''راہزن تھے، مالکن!'' اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔

''بے شک، مگر تھے کون؟''

''میں کچھ نہیں جانوں مالکن!'' کوچ بان نے ہاتھ جوڑے۔

''بے شک، مگر وہ جو گھوڑے پہ تھا، اس کا نام کیا تھا؟'' وہ اب بھی پرسکون تھی۔

''میں کچھ نہیں جانوں۔''

وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''جانے دو رام ناتھ، جیسے تمہیں واقعی علم نہیں۔'' اور سکون سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

وہ سر جھکائے ہاتھ جوڑے واپس جانے لگا، جب اسے اپنے عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

''میں جانتی ہوں، وہ کون تھا رام ناتھ!'' وہ حیرت زدہ سا پلٹا۔ اندھیرے میں مدھم چاندنی میں بھی وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا، جس پہ وہی تلخ مسکراہٹ تھی۔

''کون تھا مالکن؟''

''وہ بدر غازان تھا، میں جانتی ہوں۔ اس واقعہ کی خبر گاؤں میں کسی کو نہ ہو۔ اب گاڑی چلاؤ۔ میں صبح سے قبل حویلی پہنچنا چاہتی ہوں۔'' پردہ آگے ڈالا گیا اور دروازہ اندر سے بند ہو لیا۔

رام ناتھ حیرت چھپاتا، سر ہلا کر حکم کی تعمیل کرتا آگے اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

بگھی ایک دفعہ پھر خستہ حال سڑک پر دوڑنے لگی اور پھر جب سڑک ختم ہو کر کچا راستہ شروع ہو گیا، اس لمحے پو پھٹنے لگی۔

صبح کی پہلی کرنیں بیلی راجپوتاں کے کھیتوں پہ گرنے لگیں تو بگھی میں جُتے عربی گھوڑے بڑے پھاٹک کے سامنے رکے، وہاں مجمع سا لگا تھا۔

کوچ بان رام ناتھ پھرتی سے نیچے اترا، سرعت سے سیڑھی نکال کر دروازے سے لگائی اور دروازہ کھولا۔ پردہ اندر سے اس نے خود ہٹایا اور پاؤں باہر نکال کر سیڑھی پہ رکھا۔ اس کی جوتی کے سنہرے پکھراج روشنی میں چمکنے لگے۔ سفید ہیٹ اس نے سر پر رکھ لیا تھا۔

کوچ بان ادب سے پیچھے ہٹ گیا، وہ نزاکت سے زینے اترتی نیچے آئی جیسے پانی پہ چل رہی ہو اور سامنے کھڑے دونوں افراد کو اپنی جانب دیکھتے پایا۔

ان میں سے ایک وردی میں ملبوس گاؤں کا سب انسپکٹر تھا اور دوسرا سوٹڈ بوٹڈ ڈھلتی عمر کا فربہی مائل کمپنی بہادر کا کوئی افسر۔ فرنگی افسر نے اپنا ہیٹ اتار کر جھک کر ''گڈ مارننگ'' کہا۔ اس کی...... تیوری چڑھ گئی۔ سب انسپکٹر نے بھانپ کر، کچھ کہنے کو لب کھولے، مگر صاحب بہادر شروع ہو چکا تھا۔

''آپ یقیناً انگلستان سے آئی ہیں۔ پہلی دفعہ آپ کو ادھر دیکھا ہے۔ میرا نام جان کارلس ہے۔ میں ضلع کا نیا ڈپٹی کلکٹر ہوں۔ مجھے یہاں تعینات ہوئے آج تیسرا روز ہے۔''

''مایا راج، یہ لیڈی......'' سب انسپکٹر منمنایا، مگر جان کارلس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''مجھے بات کرنے دو تھانے دار۔''

''یہ مجمع کیوں لگا ہے ادھر۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی میکسی پہلو سے اٹھاتے بے زار سی کھڑی تھی، اس کا اشارہ اردگرد حویلی کے پھاٹک کے ساتھ کھڑے ہجوم کی طرف تھا۔

''اد مائی لیڈی، آپ کی اردو کتنی صاف ہے۔''

''مجھے فارسی کی شُد بد بھی ہے مسٹر کارلس! مگر یہ مجمع کیوں اِدھر لگا ہے؟''

''کل راجپوتوں کی حویلی میں حادثہ ہو گیا تھا۔''

''حادثہ......؟ کیسا حادثہ؟'' وہ چونکی۔

''آگ لگ گئی تھی، مہمان خانے میں۔''

''کوئی نقصان تو نہیں ہوا ڈی سی صاحب!''

''اور تو نہیں، بس ٹھاکروں کا لڑکا موقع پہ ہی جل کے مر گیا۔''

''کون؟ ٹھاکر رگوناتھ کا بیٹا گوپال؟''

''نہیں، وہ دوسرا لڑکا جو رگوناتھ کا بھتیجا تھا۔''

''شیکھر۔'' وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ''شیکھر، شیکھر مر گیا؟''

''جی وہی، ٹھاکر شیکھر راج۔'' وہ مزید کچھ سنے بغیر تیزی سے پھاٹک پار کر کے اندر چلی گئی۔ جان کارلس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ عورت کون ہے؟'' اب کے اس نے بالآخر سب انسپکٹر کو زحمت دی، جو مسلسل کچھ کہنے کے لئے لب کھول اور بند کر رہا تھا۔ کارلس کے سوال پر گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''میں آپ کو یہ بتانے والا تھا مایا راج! یہ لیڈی شیکھر ہے، ٹھاکر شیکھر راج کی بیوی۔''

کارلس چونکا۔ ''یہ مایا فرینڈس ہے؟''

سب انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی مایا راج!'' کارلس پھر سے گردن موڑے اسے دیکھنے لگا، جو تیزی سے دوڑتی حویلی کے اندر جا رہی تھی۔ اس کا ہیٹ راستے میں مٹی پہ گر گیا تھا۔

***

یہ 1939ء کی ایک تاریک رات تھی۔ ہند عظیم اس وقت تاج برطانیہ کے تحت تھا۔ وہ تاج برطانیہ جس پہ سورج غروب نہیں ہوتا تھا، مگر ہندوستان پہ تاریکی ہر رات اپنے پر پھیلا لیتی تھی۔ بہی چاندنی میں ڈوبا اندھیرا ''بیلی راجپوتاں'' پہ بھی اتر آتا تھا۔

بیلی راجپوتاں ہندوستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ انگریز سرکار نے کئی برس ہوئے اس کا نام بدل کر کچھ اور کر دیا تھا، مگر گاؤں والے آج بھی اسے اس کے برسوں پرانے نام سے ہی

پکارتے تھے، جس میں یہاں کے سرکردہ خاندان کی عظمت کا ذکر تھا۔ ہندو راجپوتوں کے خاندان کا، جو کئی برس سے اس گاؤں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ بیلی راجپوتاں دراصل اس ریاست کا حصہ تھا، جو کسی زمانے میں اس راجپوت خاندان کی ملکیت تھی اور وہ یہاں کے حقیقتاً بادشاہ تھے، پھر بعد میں ریاستیں ٹوٹ گئیں تو یہ محض ایک گاؤں رہ گیا، مگر راجپوت آج بھی یہاں کے مہاراجے تھے اور ان کی عورتیں خود کو مہارانیاں کہلوانا پسند کرتی تھیں۔

گاؤں کی آبادی میں ہندوؤں کا تناسب مسلمانوں سے چند شرح فیصد زیادہ تھا اور سوائے ایک مسلم خاندان کے (جس کی مضبوط حیثیت کی وجہ دولت کی کثرت اور ملکی سیاست میں اثر و رسوخ کے سوا کوئی نہ تھی) ہندو راجپوت پورے گاؤں پہ چھائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے وسط میں راجپوتوں کی عظیم الشان حویلی تھی، جس کے میناروں کے کنگرے دور سے دکھائی دیتے تھے، مگر ہماری اس برسوں پرانی داستان کا مرکز راجپوتوں کی حویلی نہیں، جو اس وقت سوگ میں ڈوبی تھی، بلکہ اس سے کہیں دور وہ کچا راستہ ہے، جو راجپوتوں کی زمینوں سے ہو کر مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی جانب جاتا تھا۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی، گاؤں کے مکین جانے کب سے اپنے اپنے گھروں میں دبکے سو رہے تھے۔ سرما دم توڑ رہا تھا، بہار کی آمد تھی۔ فضا میں خنکی ابھی تک موجود تھی۔ اونچے بوڑھے درخت خاموشی سے شاخوں کا بوجھ لیے سو رہے تھے، کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا تیزی سے چلتے ہوئے پتوں کو جھنجھوڑ دیتا اور ان کی سنسناہٹ سے اندھیرے میں ڈوبا گاؤں ہڑبڑا سا جاتا، مگر چند لمحوں بعد وہی پُرسکون خاموشی چھا جاتی اور آسمان پہ بکھرے تارے اس کے گواہ بن جاتے۔ ایسے میں جب پورا بیلی راجپوتاں سو رہا تھا، مسلمانوں کے پرانے قبرستان میں کوئی جاگ رہا تھا۔

یہ قبرستان آبادی سے ہٹ کر گاؤں کے آخری سرے پہ واقع تھا۔ یہ ایک دفعہ مکمل طور پہ آباد ہونے کے بعد کئی برس ہوئے اب تو کھنڈر بھی بن چکا تھا۔ اب اس قبرستان میں کوئی مردے نہیں دفناتا تھا، بلکہ اس کی جگہ ایک نئے قبرستان نے لے لی تھی، جو گاؤں کے دوسری طرف تھا۔

پرانے قبرستان کی چاردیواری کچی اور چھوٹی تھی۔ داخلے کے لئے نصب لکڑی کا خستہ حال، قدیم پھاٹک رات کے اس پہر کھلا پڑا تھا۔

چاردیواری کے ایک کونے میں برگد کا گھنا بوڑھا درخت جھکا جھکا سا کھڑا تھا۔ اس کی چھایا

تلے کوئی سایہ سا نظر آ رہا تھا۔

اس کی درخت کی جانب کمر تھی، اندھیرے میں وہ کوئی ہیولا سا دکھتا تھا۔ جس نے پاؤں تک آتا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا، سر پہ چغے کے ساتھ ننھی ٹوپی (Hood) ایسے لے رکھی تھی کہ چہرہ واضح نہ تھا۔ وہ سایہ رکوع کے بل جھکا، مسلسل ایک ہی جگہ پہ ہاتھ میں پکڑی کدال مار رہا تھا۔ وہاں دو قبروں کے درمیان ایک گڑھا سا کھد گیا تھا اور چغہ پوش کی کدال اس گڑھے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

دفعتاً بھاگتے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے بیلی راجپوتاں کی خاموش فضا کو لرزا دیا۔ چغہ پوش نے چونک کر کمر سیدھی کی۔ آواز دور کھیتوں سے آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کدال اٹھائی اور بھاگ کر درخت کے تنے کی اڑ لے لی۔ دوڑتے قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، چغہ پوش نے سر اٹھا کر چھوٹی سی چار دیواری کے باہر جھانکا۔ اسی لمحے دور کھیتوں سے دو گھوڑے برق رفتاری سے بھاگتے ہوئے آئے اور دیوار کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ شاید کوئی مسافر تھے۔

چغہ پوش نے آہستہ سے کھڑے ہو کر زمین پہ رکھی کدال اٹھائی اور واپس آ کر گڑھے کے کنارے پہ لگے مٹی کے ڈھیر کو اندر ڈالنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے زمین برابر کر دی، پھر کدال اٹھا کر دھیرے دھیرے چلتے اس نے باہر کی راہ لی۔

پھاٹک پار کر کے اس نے آہستگی سے اسے بند کیا، چغے کی ہڈ درست کی اور اِدھر اُدھر محتاط طریقے سے دیکھتے، اپنے قدم اس کچے دھول مٹی میں گم ہوتے راستے کی جانب بڑھا دیئے۔

چند لمحے بعد اس کا سیاہ وجود بیلی راجپوتاں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

* * *

وہ اس قد آور آئینے کے سامنے کھڑی بے تاثر نگاہوں سے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ دراز قد، شانوں پہ گرتے سنہری بال، ان کے بیچ پھسلتی موتیوں کی لڑی اور آنکھوں میں گہرا کاجل، آج اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ بس سادہ سی سفید ساڑھی میں ملبوس تھی، جس کا پلو فرش کو چھو رہا تھا۔

وہ آئینے سے ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے والی دیوار پہ ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

وہ ساٹھ ستر کے سن کا بوڑھا، مگر بارعب چہرہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، تمکنت سے چمکتی آنکھیں، فہم دفراست سے لبریز نگاہیں، پگڑی میں موتیوں کی لڑیاں تھیں، ماتھے سے عین اوپر پگڑی میں چھوٹا سا مور پنکھ تھا، جس کے ساتھ ایک بڑا سا ہیرا جڑا تھا، اس ہیرے سے پھوٹتی شعاعیں اس چہرے کے رعب داب میں اضافہ کر رہی تھی، نیچے ایک کونے میں لکھا تھا۔

''شبیہ حقیقی، مہاراجہ بلدیو سنگھ۔''

وہ اب دوسری دیوار پہ موجود بڑے سے رنگین پورٹریٹ کے سامنے آ گئی، جو ایک سیاہ سفید تصویر کو سامنے رکھ کر کسی ماہر مصور نے بنایا تھا۔ یہ تصویر اس کی اور شیکھر کی شادی سے تین ماہ قبل لی گئی تھی۔

تصویر میں اس نے سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سنگھار کے نام پہ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا یا لبوں پہ سرخ رنگ کی لپ اسٹک، دائیں کلائی میں سونے کی چوڑیاں اور بائیں میں ہیرے کے دو جڑاؤ کنگن تھے۔

اس کے پہلو میں سیاہ تھری پیس، سفید شرٹ اور سرخ Bow میں ملبوس سینتیس سالہ شیکھر مسکرا رہا تھا۔ وہ سانولی رنگت اور معمولی نقوش کا حامل قبول صورت شخص تھا۔

اس کی بے تاثر نگاہیں شیکھر سے ہٹ کر اپنی سرخ ساڑھی پہ پھیلتی چلی گئیں۔ یہ ساڑھی اس نے شادی کے بعد پھر کب پہنی تھی؟ ہاں اڑھائی ماہ قبل اپنی سالگرہ کی شام میں۔

اس نے اپنی سنہری آنکھیں موند لیں، ذہن کے پردوں پہ ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

دہلی میں موجود شیکھر کی اس عالی شان کوٹھی پہ سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑے سے لان میں برقی قمقموں اور روشنیوں سے چراغاں کیا گیا تھا۔ مہمان گھاس پہ بچھی کرسیوں سے اُٹھ کر لان کے وسط میں رکھی گئی گول میز کے اِردگرد جمع ہو چکے تھے۔

شیکھر ان کے ہمراہ تھا۔ اس کی منتظر نگاہیں بار بار برآمدے کے اس پار گھر کے داخلی دروازے کی سمت اُٹھ رہی تھیں۔ کچھ مہمان کلائیوں پہ بندھی گھڑیاں دیکھنے لگے تھے۔ ان سب کو شیکھر کی بیوی کا انتظار تھا، جس کے اعزاز میں روٴسا و امراء کی یہ محفل سجائی گئی تھی۔

دفعتاً برآمدے کا دروازہ کھلا، سرخ ساڑھی کی جھلک نظر آئی۔ تمام مہمانوں کی نگاہیں اس طرف اٹھیں، پورے لان میں سناٹا چھا گیا۔

دروازے کا پٹ دھکیلتی سرخ ساڑھی میں ملبوس دراز قد سید ھے اور سنہرے بالوں والی لڑکی باہر آئی۔ وہ واقعی کسی قدیم مندر میں پوجا کرانے والی حسن کی دیوی تھی۔

وہ بہت نزاکت و تمکنت سے چلتی ہوئی برآمدے کے ستون تک آئی۔ شیکھر مسکرا کر آگے بڑھا۔ برآمدے کے آگے تین چھوٹے سے زینے بنے تھے، اوپر وہ ان کے آغاز پہ کھڑی تھی۔ شیکھر نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور اسی نزاکت سے ایک ایک قدم نیچے رکھتی زینہ اتر کر لان کے گھاس پہ آ گئی۔ سرخ ساڑھی کا بے حد لمبا پلو اس کے پیچھے زینوں پہ پھسلتا ہوا گھاس پہ آن گرا۔

شیکھر ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے بایاں بازو اس کے شانوں کے گرد حمائل کیے اسے ساتھ لے کر چلتا میز تک آیا۔

"مائی وائف، مایا فرینڈس" کیک کٹنے کے بعد وہ مایا کا ہاتھ تھامے اپنے کسی قریبی عزیز سے اس کا تعارف کرا رہا تھا اور مایا مسکراتے ہوئے شستہ انگریزی اور پھر مقامی زبان میں رسمی کلمات ادا کر رہی تھی۔

پوری تقریب میں ایک فرد سے دوسرے فرد تک جاتے بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بھانت بھانت کی سرگوشیاں اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

"تو یہ ہے ٹھاکر شیکھر کی انگریز بیوی، جس سے اس نے انگلستان میں شادی کی تھی۔"

"ہاں، سنا ہے اس کا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے ہے، کیا واقعی؟"

"ہوگا، تب ہی تو شیکھر نے اس سے شادی کی ہے۔"

"مگر اردو اور ہندی تو اچھی بول لیتی ہے، بہت جلدی سیکھ لی۔"

"نہیں، میں نے سنا ہے اس کی نینی ہندوستانی تھی۔ اسی نے سکھائی ہے اسے۔"

وہ بہت اعتماد سے مسکراتے ہوئے شیکھر کے پہلو میں مہمانوں سے تعارف حاصل کر رہی تھی، جن میں زیادہ تعداد دہلی کے امرا و رؤسا کی تھی، چند برطانوی بھی الگ سے کھڑے تھے۔

مایا نے آنکھیں کھول دیں۔

دہلی کی روشنیوں میں ڈوبی تقریب غائب ہوگئی۔ وہ بیلی راجپوتاں میں راجپوتوں کی حویلی کی بالائی منزل کے کمرے میں اپنے پورٹریٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے بے اختیار موتیوں کی لڑی پہ انگلی پھیری، وہاں موتی تصویر کی نسبت کم تھے اور آخر میں گرہ سی لگی تھی۔ مایا کی انگلی گرہ پہ آ کر تھم گئی۔ ایک مبہم مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

''احمق...... گدھا'' اس نے مسکرا کر سر جھٹکا، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اسی پل دروازہ بجا۔ اس نے ہاتھ سے لڑی چھوڑ دی۔

''کون......؟''

''مایا دیوی! وکیل صاحب نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ٹھاکر صاحب نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔''

''ہوں، ان کو بولو میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔'' بے تاثر لہجے میں کہہ کر وہ بالوں میں پھر سے کنگھا پھیرنے لگی۔ نگاہیں آئینے میں موجود اپنے دلکش چہرے پہ جمی تھیں۔ بہت سپاٹ برف سا چہرہ تھا وہ۔

پھر بہت سے لمحے سرک گئے تو اس نے ساڑھی کا پلو ہاتھ سے چھوڑا اور باہر نکل آئی۔

سیڑھیوں کے آغاز پہ کھڑے ہو کر اس نے نیچے جھانکا۔ نیچے ہال کمرے میں لکڑی کے قیمتی صوفوں پہ سیاہ کوٹ میں ملبوس وکیل صاحب اور تایا رگھوناتھ بیٹھے تھے۔

آہٹ تھی یا اس کی موجودگی کا کوئی فسوں، ان دونوں نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

وہ ہاتھ ریلنگ پہ رکھے، پلکیں جھکائے ایک ایک زینہ نیچے اترنے لگی۔ سفید ساڑھی کا پلو چند زینے اوپر سے اس کے پیچھے پھسلتا آ رہا تھا۔ لمبی ایڑی کی ٹک ٹک ایک ردھم سے خاموش فضا میں گونج رہی تھی اور وکیل صاحب دم سادھے اسے سیڑھیوں سے نیچے اترتے دیکھ رہے تھے۔

اس کے ملکوتی حسن اور سحر انگیز شخصیت کے جتنے قصے انہوں نے سنے تھے، بیلی راجپوتاں کی وہ مہارانی اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔

''گڈ مارننگ جنٹل مین!'' نہایت اعتماد سے گردن اٹھائے وہ ان کے مقابل مخملیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔ وہ دیوان خانہ گاؤں کے ماحول کے برعکس فرنگی طرز سے آراستہ تھا۔

''بیٹھیے۔'' ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، کہنی صوفے کے بازو پہ ٹکائے وہ اسی پر تمکنت انداز میں بولی تو وکیل صاحب جیسے ہوش میں آ کر بیٹھ گئے۔ تایا رگھوناتھ پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ وکیل

صاحب کو "بیٹھئے" کہنا ان کا فرض تھا کہ وہ حویلی ان کی تھی مگر شیکھر کی اس مہارانی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ ایسے ہی کنفیوزڈ ہو جاتے تھے۔

"آپ کاغذات لے آئے وکیل صاحب؟" وہ سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"جی...... جی لیڈی شیکھر...... میں......"

"لیڈی فرنینڈس۔" سنہری بال کندھے سے پیچھے کرتے اس نے تصحیح کی۔

"جی لیڈی فرنینڈس!" وکیل صاحب جلدی سے بولے، پھر ایک نظر تایا رگھوناتھ پہ ڈالی اور دوبارہ مایا کو دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں اتنی مقناطیسیت اور کشش تھی کہ وکیل صاحب نگاہیں جھکا کر تیزی سے بریف کیس کھول کر کاغذات نکالنے لگے۔

"شروع کریں؟" ایک فائل کا مطلوبہ صفحہ کھول کر انہوں نے ایک سوالیہ نگاہ مایا پہ ڈالی، جس نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو جنبش دی۔ وہ فوراً سر جھکائے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی غلطی دہرائے بغیر پیشہ ورانہ انداز میں پڑھنے لگے۔

"یہ وصیت ٹھاکر شیکھر راج نے اپنی موت سے چند ہفتے قبل لکھوائی تھی۔ اس کے مطابق انہوں نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد و اثاثوں کا نگراں اور وارث اپنی بیوی مایا لیڈی مایا فرنینڈس کو قرار دیا ہے۔"

تایا رگھوناتھ کے چہرے پہ ناپسندیدگی بکھر گئی۔

"جبکہ اس حویلی میں موجود اپنا پچاس فیصد حصہ بھی انہوں نے لیڈی مایا کے نام کر دیا ہے، باقی پچاس فیصد حصہ پہلے سے ہی ٹھاکر شیکھر کے تایا ٹھاکر رگھوناتھ کے نام ہے۔"

تایا رگھوناتھ نے اب کے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہوں اور کچھ؟" وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"جی نہیں۔" وکیل صاحب نے فائل میز پہ رکھ دی۔

ہال کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مایا کے چہرے پہ بلا کا اطمینان و سکون تھا، جیسے اس نے تمام فیصلے کر لیے ہوں۔

''مجھے شیکھر کی جائیداد نہیں چاہئے۔'' اسی بے تاثر لہجے میں چند لمحے بعد وہ بولی تو دونوں اشخاص بری طرح چونکے۔

''میں حویلی میں اپنے نصف حصے کو ٹھاکر رگھوناتھ کے نام کرنے پہ تیار ہوں، ٹھاکر صاحب آپ کاغذی کارروائی کر لیں، جبکہ باقی جائیداد...... '' وہ سانس لینے کو رکی، ٹھاکر رگھوناتھ دم سادھے اس کی بات کی تکمیل کے منتظر تھے۔ ''باقی جائیداد میں کسی فلاحی ادارے کے نام کرنا چاہتی ہوں، شیکھر کی بہت خواہش تھی کہ ہم دونوں مل کر کوئی ٹرسٹ یا خیراتی ادارہ قائم کریں۔ شیکھر کو تو زندگی نے مہلت نہیں دی۔'' سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

''مگر میں اس کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ ٹھاکر صاحب مجھے اُمید ہے کہ آپ یہ جائیداد بکوانے میں میری مدد کریں گے، شکریہ۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، ایک آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ پھسلتا گیا۔ ''آپ بیٹھئے، میں چلتی ہوں۔''

ساڑھی کا پلو دائیں ہاتھ میں سنبھالتی، وہ ان کے سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی، ریلنگ پہ ہاتھ دھرے پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ایک ثانئے کو اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''میں اُمید کرتی ہوں یہ سب کچھ جلد ہو جائے گا۔ میں اس مہینے واپس انگلستان جانا چاہتی ہوں۔ اب اس ملک میں شیکھر کی یادوں کے ساتھ رہنا میرے لئے کٹھن ہو گیا ہے۔ امید ہے آپ میری ذہنی حالت سمجھ سکیں گے۔''

پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ان دونوں کی نگاہوں نے اس کا اوپر تک تعاقب کیا، یہاں تک کہ وہ اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

''شیکھر اور فلاحی ادارہ...... '' ٹھاکر رگھوناتھ نے گہرا سانس بھرا۔ ''تھا تو میرا بھتیجا، مگر اس سے یہ توقع ناممکن سی لگتی ہے۔ وہ عیاش سا شخص تھا، پتا نہیں۔'' انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

وکیل صاحب خاموشی سے کاغذات سمیٹنے لگے، جیسے ٹھاکر کی بے زاری کی وجہ سمجھ رہے ہوں۔

'بے چاری مایا۔' فائلیں بریف کیس میں رکھتے ہوئے انہوں نے ترحم سے سوچا۔ 'اتنی خوب صورت عورت، محبت کی شادی اور محبت بھی ایسی کہ برطانوی شہزادی نے محل چھوڑ دیئے، اس قبول

صورت ٹھاکر شیکھر کے پیچھے اور پھر یوں بھری جوانی میں بیوگی اور دل ایسا خالص کہ اتنی بڑی جائیداد سے ایک ٹکا لینے کا لالچ نہیں۔ اتنی ہی آسانی سے سب چھوڑ دیا، مگر جانے یہ ٹھاکر اس کو اتنی ہی آسانی سے چھوڑیں گے یا نہیں، بے چاری انگریز لڑکی کدھر پھنس گئی ہے، ان راجپوتوں میں۔'

ٹھاکر رگھوناتھ اور وکیل صاحب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

***

رات کی کالی چادر میں غبار کی تہہ لگی تھی۔ شام میں ہلکے ہلکے جھکڑ چلے تھے اور پھر ہوا ساکن ہو گئی تھی، مگر معمولی سا گرداب بھی فضا میں ٹھہرا تھا۔

آج مسلمانوں کا کھنڈر ہوا پرانا قبرستان بھی معمول سے زیادہ گرد آلود تھا۔ برگد کا بوڑھا درخت دُکھ سے سارے میں چھائی ویرانی دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر رسیدہ کمزور شاخیں زمین کی جانب جھکی جھکی سی تھیں، جہاں موجود ایک سیاہ لبادے میں ملبوس ذی نفس کی کدال کچی زمین کھود رہی تھی۔

مٹی اُڑ کر اوپر آتی، چغہ پوش کا لباس مٹی سے اَٹ چکا تھا، مگر اس کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے کمر سیدھی کی اور چہرے پہ آیا پسینہ صاف کیا۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا، انداز میں تھکان سی تھی۔ برگد کا بوڑھا درخت گواہ تھا کہ اس کا جسم پچھلے کئی گھنٹوں سے یہ مشقت اٹھا رہا تھا۔ اب شاید اسے تھکاوٹ ہونے لگی تھی۔

چند لمحے سستا کر اس نے پھر سے جھک کر کھودنا شروع کر دیا۔ تین، چار دفعہ ہی کدال ماری تھی کہ دور کسی کے بولنے کی آواز سناٹے کو چیرنے لگی۔

چغہ پوش نے چونک کر سر اٹھایا، قبرستان کے کھلے پھاٹک کے اس پار دو اشخاص باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے قدموں تلے کچے راستے کی دُھول اٹھ رہی تھی۔ ایک ان میں کرم دین تھا اور دوسرا اس کا چچازاد حاجی بشیر۔

کرم دین نفی میں سر ہلاتے ہوئے کسی بات پر بحث کر رہا تھا کہ یکا یک کھلا پھاٹک دیکھ کر ٹھٹکا۔

''حاجی! اتنی رات گئے پھاٹک کیوں کھلا ہے؟'' بات حیرت کی تھی، قبرستان کا یہ پھاٹک عموماً بند ہی ہوتا تھا اور اس پر ایک موٹی زنجیر اور تالا چڑھا ہوتا تھا۔

''معلوم نہیں۔'' حاجی بشیر ہچکچایا۔'' گاؤں والے کہتے ہیں کہ عرصہ ہوا یہاں سایہ ہو گیا ہے، رات کو اِدھر سے آوازیں آتی ہیں۔ جانے کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ، تالا تو عرصہ ہوا ٹوٹ چکا ہے۔''

دونوں کھلے پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔

''چل او حاجی! چل کر ایک دفعہ دیکھیں تو اندر ہے کیا؟''

''رہنے دو کرم دین!'' حاجی بشیر بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔

''ڈرتے کیوں ہو؟ گاؤں والے تو پر کا پرندہ بنا ڈالتے ہیں، ایک دفعہ دیکھئے تو سہی کہ ہے کیا؟ آواز تو ابھی مجھے بھی آ رہی ہے۔''

کرم دین نے پہل کی اور پھاٹک پار کیا۔ حاجی بشیر ہچکچاتا ہوا چند قدم پیچھے تھا۔

سامنے چند قبروں کے ایک طرف بڑا سا گڑھا تھا اور ارد گرد مٹی کی ڈھیریاں تھیں۔

''اس گڑھے میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟'' کرم دین سوچتا بڑبڑاتا قریب آیا، رات کی وحشت یا قبرستان کی ہیبت، اسے تھوڑا تھوڑا خوف محسوس ہوا، جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گڑھے کے قریب آئے۔ کرم دین نے آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اندر جھانکا۔ گڑھا تاریک اور خاموش تھا، بہت گہرا نہیں تھا، اندر ایک سیاہ سی گٹھڑی پڑی تھی، جیسے کپڑے کی گٹھڑی ہو۔

اس سے پہلے کہ کوئی جھکتا، گٹھڑی آن کی آن میں کھڑی ہو گئی اور دھول کا ایک طوفان ان کی طرف آیا۔ گرد ان کی آنکھوں میں پڑی اور وہ بے اختیار آنکھیں ملتے چیختے چلاتے پیچھے ہٹے۔ چغہ پوش نے انہیں دھکیلا اور جست لگا کر پھاٹک پار کر گیا۔

کچھ دیر بعد ہر رات کی طرح چھائے اندھیرے نے اسے نگل لیا۔

* * *

''مایا دیوی!'' روپا اسے تلاش کرتی زنان خانے کے دالان تک آئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے اونچے ستونوں کا برآمدہ تھا، برآمدے کے آگے تین سیڑھیاں بنی تھیں۔ وہ سب سے اونچی سیڑھی پہ بیٹھی سامنے فضا میں جانے کیا کھوج رہی تھی، روپا کی آواز پہ آہستہ سے سر اٹھایا۔

وہ بہت اطمینان اور تحمل سے ہر کام کرتی تھی۔ شاید ہی کبھی روپا نے اسے چونکتے دیکھا ہو۔

''مایا دیوی! بڑے ٹھاکر آپ کو ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں، داروغہ صاحب آئے ہیں

جی۔"

وہ ایک لفظ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے آج بھی سادہ سفید ساڑھی پہن رکھی تھی، بال فرانسیسی طرز کی چوٹی میں مقید تھے، چوٹی کے بلوں میں کہیں کہیں سے موتی جھلک رہے تھے۔ پاؤں میں پتلی اونچی ایڑی والی نازک سی جوتی تھی، جس پہ سفید نگینے جڑے تھے۔

دیوان خانے میں اس روز جہاں وکیل صاحب بیٹھے تھے، آج ادھر وردی میں ملبوس تھانے دار تھا، اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔مایا کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

تایا رگھوناتھ سامنے اسی صوفے پہ بیٹھے تھے، حقے کی نے منہ سے لگا رکھی تھی اور مسلسل گڑگڑا رہے تھے۔

سامنے کرسیوں پہ تھانے دار کا عملہ بیٹھا تھا۔ان کے پاس قلم اور کاغذ تھے، غالباً بیانات قلمبند کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

وہ سب کو جیسے نظر انداز کرتی اسی اعتماد اور بے نیازی سے چلتی تھانے دار کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی۔ٹانگ پہ ٹانگ یوں چڑھائی کہ جوتی کی نوک اوپر تھی، شاید یہ مقابل کو بتانے کا اشارہ تھا کہ وہ اس کی جوتی کی نوک پہ ہے۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک عمر رسیدہ دیہاتی بیٹھا خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا، چہرے مہرے سے وہ تھانے کے عملے کا حصہ ہرگز نہ لگتا تھا، جانے کون تھا۔

"میم صاحب! آپ کو زحمت اس لئے دی کہ جیسا کہ آپ جانتی ہیں۔" تھانے دار بیٹھ گیا تھا۔" ٹھاکر شیکھر راج کی موت آگ لگنے سے ہوئی ہے۔پولیس کو کچھ کارروائی مکمل کرنا ہوتی ہے۔سو آپ لوگوں کے بیانات درکار ہوں گے، کچھ سوال پوچھے جائیں......"

"تمہید کو چھوڑ کر سوالات شروع کریں۔"

مایا کے لہجے کا سرد پن محسوس کر کے اس نے سر ہلایا اور ٹھاکر رگھوناتھ کی جانب متوجہ ہوا۔

"مرحوم سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟"

ٹھاکر رگھوناتھ نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی۔" اتنا تو تم جانتے ہو انسپکٹر شاہ کہ وہ میرا بھتیجا تھا۔" انداز میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

"ٹھاکر صاحب! میرے ساتھ تعاون کیجئے۔" وہ اثر لئے بغیر ٹھنڈے انداز میں بولا۔

''مرحوم شیکھر کے سرپرست کی ذمہ داری آپ نے کب سنبھالی تھی۔''

''یہ ہی کوئی پندرہ برس ہوئے جاتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، اس کی پتنی پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھی، شیکھر اس وقت غالباً بائیس برس کا تھا۔''

''یعنی موت کے وقت ٹھاکر شیکھر راج کی عمر لگ بھگ سینتیس برس ہو گی۔'' انسپکٹر شاہ کا ایک اپنا انداز تھا۔ تیکھا سا، پے در پے سوالات کرنے کا، بات کاٹنے کا، جانے کیوں مایا کو لگا وہ پہلے اس سے مل چکی ہے۔

''درست۔ وہ اس وقت بچہ تو تھا نہیں کہ میں اس کی نگرانی کرتا، کچھ عرصے بعد تعلیم کے لئے انگلستان چلا گیا، پیچھے سے اس کی زمین، جائیداد میں سنبھالتا تھا، اس نے گویا مجھے اپنی زمینوں کا نگراں مقرر کر رکھا تھا۔''

''اگر اسے آپ پہ اتنا اعتماد تھا تو اس نے چند سال پیشتر زمین کا بٹوارہ کیوں کرایا تھا؟ اور کچھ لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ شاید اس کے ساتھ بد دیانتی ہوئی ہے؟''

ٹھاکر رگھوناتھ گڑبڑا سے گئے۔ ''نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ پہلے شیکھر اور ہماری زمینیں مشترکہ تھیں، پھر اس نے بٹوارہ کرا لیا۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

مایا خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''شیکھر انگلستان سے کب واپس آیا؟''

''وہ آتا جاتا رہتا تھا، اب آخری دفعہ شادی کر کے آیا تھا۔'' ٹھاکر رگھوناتھ نے ذرا کی ذرا نظر مایا پہ ڈالی۔ وہ اسی طرح سپاٹ سا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

''یہاں میں آپ کو کچھ زحمت دوں گا میم صاحب!'' انسپکٹر شاہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''شیکھر سے آپ کی شادی کب ہوئی؟''

''چھ ماہ قبل۔''

''انگلستان میں ...؟''

مایا نے سر کو معمولی سی جنبش دی۔

''آپ نے اس سے شادی کیوں کی؟ آپ کی عمروں میں تقریباً سترہ سال کا فرق تو ہو گا۔''

''تیرہ سال کا۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''شیکھر ایک رئیس تھا، مگر دیسی رئیس، جیسا کہ آپ کو علم ہو گا کہ میرا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے ہے۔'' کہتے ہوئے گردن قدرے تفاخر سے بلند ہوئی۔

''سو ظاہری بات ہے، میں ایک native cheiftain سے شادی دولت کی بنا پہ تو کرنے سے رہی۔ ہم میں بس ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی محبت، سو ہم نے شادی کر لی۔''

''شادی انگلستان میں ہوئی؟''

''جی۔''

''آپ شادی کے کتنے عرصے بعد ہندوستان آئیں؟''

''تقریباً دو ماہ بعد میں دہلی پہنچی تھی، کچھ عرصہ ادھر رہی، پھر دلہوزی چلے گئے۔ تقریباً تین ماہ قبل شیکر مجھے بیلی راجپوتاں لایا تھا۔''

''آپ کی اردو بہت صاف ہے۔'' انسپکٹر شاہ مسکرایا۔

''میری فارسی بھی بہت صاف ہے۔''

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بات کرتی تھی۔ یہ انداز ایسا تھا کہ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''سنا تھا اہل فرنگ بے باک ہوتے ہیں، آج یقین بھی آ گیا، وگرنہ برِ اعظیم میں نگاہیں ملانے کو بے ادبی تسلیم کیا جاتا ہے۔''

''اور ہمارے یہاں نگاہیں جھکانے یا چرانے کو بد دیانتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ راست گو انسان میں اتنی ہمت ہونی چاہئے کہ وہ دوٹوک بلا خوف وخطر بات کر سکے۔''

''بجا فرمایا، شیکھر سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے خوشگوار یا درمیانے؟''

''ویسے جیسے ہر خوش وخرم میاں، بیوی میں ہوتے ہیں۔''

''مثلاً کیسے ...؟''

''جیسے ہفتے بھر میں ایک لڑائی، دو چار بار تلخ کلامی، کیوں؟ کیا آپ نے کوئی ایسا جوڑا دیکھا ہے جس کی آپس میں لڑائی نہ ہوتی ہو؟''

''آخری بار آپ کی تلخ کلامی کس بات پر ہوئی تھی؟''

''یہ ہی کوئی پانچ روز پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ ہندوستان میں خاصی گندگی ہے، یہاں کے لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔'' وہ آرام سے کہے جا رہی تھی۔

''تو اس نے آگے سے کیا کہا؟''

''اس نے کہا کہ کم از کم وہ فرنگیوں سے تو بہتر ہیں، جو مہینے میں بس ایک بار غسل کرتے ہیں اور یہ کہ وہ کمپنی بہادر کے جتنے افسروں کو جانتا تھا وہ ایسے ہی تھے۔''

''یہ تو معمولی بات ہے، کبھی کوئی غیر معمولی تلخ کلامی ہوئی؟''

''جو عورت ایک شخص کی محبت میں محل چھوڑ دے اور اس گاؤں میں آن کر بس جائے وہ کیوں غیر معمولی تلخ کلامی کرے گی؟''

انسپکٹر شاہ لاجواب سا ہو کر خاموش ہو گیا، پھر ٹھاکر رگھوناتھ کی جانب مڑا۔

''وقوعہ کے روز شیکھر کو آخری بار آپ نے کب دیکھا تھا؟''

''صبح ناشتے پہ۔ میں ناشتے کے بعد زمینوں پہ چلا گیا، تھوڑی دیر بعد ہی نوکر بھاگتا ہوا آیا کہ مہمان خانے میں آگ لگ گئی ہے، جب تک میں پہنچا سب کچھ جل چکا تھا۔ آگ کے بجھنے تک اس کی کوئلہ صورت لاش ملی۔ اس کے قد بت اور گھڑی اور دیگر چیزوں سے اس کی شناخت ہوئی۔ میں نے فوراً ایک ملازم کو امرتسر مایا دیوی کو لینے بھیجا۔''

''وہ بھی ایک سست رفتار بگھی پہ اور میرے پہنچنے سے قبل ہی شیکھر کی چتا جلا دی گئی۔'' وہ اتنے سرد و چبھتے ہوئے انداز میں بولی کہ انسپکٹر بری طرح چونکا۔ تو ٹھاکروں کے مابین اختلافات ابھی تک موجود تھے؟

''موٹر خراب کھڑی تھی اور کوئی حل نہیں تھا۔ ہم نے رات تک آپ کا انتظار کیا، مگر لاش کی حالت اتنی خراب تھی کہ چتا جلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''مگر مجھے رام ناتھ نے یہ نہیں بتایا کہ شیکھر مر گیا ہے، مجھے صرف یہ ہی بتایا کہ شدید ایمرجنسی ہے، شیکھر نے بلوایا ہے۔ میں دو روز پہلے امرتسر کچھ کام سے گئی تھی، پیغام سن کر جلد از جلد پہنچ گئی، مگر تب تک شیکھر کی راکھ بھی بہائی جا چکی تھی۔''

''اس ساری بات سے آپ کا کیا مطلب ہے مایا دیوی؟'' انسپکٹر نے سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مطلب صاف ہے، میرے پتی کو قتل کیا گیا ہے۔"

ٹھاکر رگھوناتھ بری طرح چونکے، حقہ ایک طرف ہٹا دیا گیا۔

"شک تو مجھے بھی یہی ہے، بہر حال میم صاحب! آپ کو کسی پہ کوئی شک ہے؟"

انسپکٹر کی بات پہ وہ پل بھر کو خاموش ہوگئی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، لیکن میں تفتیش کا مطالبہ کرتی ہوں۔"

ٹھاکر رگھوناتھ نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ مایا نے چہرہ ان کی طرف موڑا۔

"آپ کو کوئی اعتراض بڑے ٹھاکر؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے اور نفی میں گردن کو جنبش دی۔

"یہ آگ نہایت پُراسرار طریقے سے لگی ہے، لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہو سکا، لیکن ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ اسی لیے میں فضل الٰہی کو ساتھ لایا ہوں۔"

اس نے کونے میں بیٹھے عمر رسیدہ دیہاتی کی جانب اشارہ کیا۔ مایا نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ کون ہے......؟"

"یہ کھوجی ہے۔" انسپکٹر شاہ اُٹھ کھڑا ہوا، عملے نے پیروی کی۔ "میں شیکھر اور کسی ایسے شخص کے کھرے تلاشنا چاہتا ہوں، جو پرسوں صبح مہمان خانے میں آیا ہو۔"

"اب تک تو کھرے تباہ ہو چکے ہوں گے۔"

"جی نہیں، بڑے ٹھاکر نے یہ عقل مندی کی کہ لوگوں کو جائے واردات سے دور رکھا۔ کسی نہ کسی حد تک کھرے تباہ ضرور ہوئے ہوں گے، مگر مجھے اُمید بہر حال ہے۔"

مایا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں یہ کارروائی آپ کے ہمراہ دیکھنا چاہوں گی۔"

چند لمحے بعد وہ انسپکٹر شاہ اور کھوجی کے ساتھ کوئلہ ہوئے مہمان خانے کے سامنے کھڑی تھی۔

مہمان خانہ حویلی سے ہٹ کر بنا تھا۔ اس کی چوکھٹ کے آگے باغیچے کی گھاس تھی، وہاں کھروں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مہمان خانے کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔

"میرا قیاس ہے کہ اس روز شیکھر پچھلے دروازے سے مہمان خانے میں داخل ہوا تھا۔"

''یہ کمرہ دراصل شیکھر کی لائبریری تھا، یہاں اس کی ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں اور وہ فرصت میں اِدھر وقت گزارتا تھا۔'' وہ سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی بتارہی تھی، اس کا رویہ نسبتاً بہتر تھا۔

وہ چلتے ہوئے کمرے کے اندر سے ہوکر پچھلے دروازے تک آئے۔

کھوجی دروازے کی چوکھٹ پہ جھک کر دیکھنے لگا۔

''کھرے موجود ہیں، آگے سارا کچا ہے، یقیناً کھرے مل جائیں گے۔'' پھر وہ جھک کر دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں پیروی کرتے باہر آئے۔ مایا کو کچی زمین پہ مدھم سے بجھے بجھے نشانات دکھائی دیے۔

''چھوٹے ٹھاکر کا کھرا میں پہچانتا ہوں، مگر اس کے دو کھرے ہیں۔ شیکھر پہلے دروازے تک آیا تھا، پھر پلٹ گیا تھا۔ پھر دوبارہ اندر آیا، مگر وہ پلٹ کر کدھر گیا؟ ٹھہریں شروع سے دیکھتے ہیں۔'' کھوجی آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں کھروں سے بچتے اس کے پیچھے آئے۔

''یہ دیکھیں، یہ شیکھر ٹھاکر چلتا ہوا آ رہا ہے، انداز میں سستی ہے، تھکاوٹ سے آہستہ آہستہ چل رہا ہے، شاید کسی گہری سوچ میں ہے۔''

کھوجی زمین پہ بیٹھا مٹے مٹے نشان دیکھ کر بول رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے سامنے پوری فلم چل رہی ہو۔

مایا نے ان نشانوں کو دیکھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''یہ دیکھئے، اب چوکھٹ سے چند قدم دور ٹھاکر رکا ہے اور کچھ دیر جیسے سوچ کر اس طرف پیچھے کو مڑا ہے۔ پہلے وہ حویلی کے اندر کے راستے سے اِدھر آیا تھا، اب اس طرف باہر کو جارہا ہے۔ تیز تیز چل رہا ہے، غصے میں ہے۔''

وہ بولتے بولتے کھروں کا پیچھا کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی روح گھس گئی ہو اور وہ وقت میں پیچھے جاکر لمحے امر کررہا ہو۔

''اب وہ حویلی کے پچھلے پھاٹک تک پہنچا ہے، یہاں رک کر اس نے اپنا جوتا جھاڑا ہے۔''

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا، آپ کو کیسے علم کہ اس نے اِدھر رک کر جوتا جھاڑا ہے؟'' مایا بے زاری سے بولی۔

کھوجی نے سر اٹھایا، اس کے خزاں رسیدہ چہرے پہ تجربے کی لکیریں تھیں۔

"عمر گزری ہے اس کام میں بٹیا رانی! بچپن میں جو کھرے اپنے باپ کے ساتھ دیکھتا تھا، وہ آج تک ذہن میں نقش ہیں۔ تمہاری انگریز سرکار کھوجیوں کی نشاندہی کو بطور ثبوت نہیں مانتی، مگر گاؤں کے ہر دار وغے کو ہمارے کام کا پتا ہے، تب ہی تو آج بھی تھانے دار صاحب ہمیں بلا لیتے ہیں۔"

پھر وہ جھک کر مٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ اپنے کام میں پُر اسرار حد تک ماہر ہوتے ہیں میم صاحب!"

اس نے شانے اچکا دیے، گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"اب اِدھر وہ جوتا جھاڑ کر پھر سے چل پڑا ہے۔ حویلی کے پھاٹک کے قریب اسے کوئی ملا ہے، غالباً ملازم ہے کہ یہ نوکیلی جوتی کا کھرا میں نے پچھلی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر ملازم سے بات کی ہے، پھر شاید غصے میں اسے جھاڑا ہے، ملازم سہم کر پیچھے ہو گیا ہے، چھوٹا ٹھاکر اب پھاٹک پار کر کے باہر نکل آیا ہے۔"

وہ حویلی سے باہر نکل آئے تھے، کھوجی کمر پہ ہاتھ رکھے سوچتی نگاہوں سے سامنے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

"کھیتوں کے اندر سے تو شاید کھرا نہ ملے، مگر نہیں، وہ پگڈنڈی سے اِدھر جا رہا ہے۔ یہاں بہت سے کھرے ایک دوسرے پہ چڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ اِدھر سے گزرتے رہتے ہیں، مگر مجھے دیکھنے دیجیے۔"

وہ دونوں کھیتوں کے کنارے کھڑے ہو گئے، جبکہ کھوجی پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا مٹی کی زبان پڑھنے لگا۔

اور پھر جب وہ یہ زبان پڑھتے پڑھتے کھیتوں کے اختتام تک پہنچ گیا تو اشارے سے انہیں اپنی طرف بلایا۔

"وہ پگڈنڈی سے گزر کر اس طرف آیا ہے۔ یہاں سے آگے کھرے واضح ہیں، مگر اس کے کھروں پہ اس کا اپنا ہی کھرا چڑھا ہے، مطلب چھوٹا ٹھاکر بعد میں ان ہی قدموں واپس بھی آئے گا۔"

وہ انہیں اپنے پیچھے لئے جھک کر مٹی کو دیکھتا آگے بڑھتا رہا، پھر ایک دم رک گیا۔

''داروغہ صاحب! وہ کچے راستے کی طرف مڑ گیا ہے۔''

''گاؤں کے تو سارے راستے کچے ہیں۔'' مایا حیرانی سے بولی۔

''نہیں بٹیا رانی! ہم اس راستے کو بولتے ہی کچا راستہ ہیں، جو مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف جاتا ہے۔ آگے چلنا ہے داروغہ جی؟'' کھوجی شش و پنج میں مبتلا پوچھ رہا تھا۔

''ہاں چلنا ہے۔''

''ایسا کیا ہے کہ آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟'' مگر دونوں نے مایا کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''وہ کچے راستے پہ چلتا پرانے قبرستان کی طرف جا رہا ہے۔ ادھر اس سے کوئی آ کر ملا ہے۔'' اب کھوجی بیٹھ کر بغور نشانات کو دیکھنے لگا۔ ''آنے والا اونچے قد کا مرد ہے، ڈیل ڈول اچھا ہے۔ اس نے ٹھاکر شیکھر سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہے، مگر ٹھاکر پلٹ گیا ہے، پھر چند قدم واپس جا کر پھر دوبارہ نو وارد کی جانب آیا ہے۔ یہاں لگتا ہے کہ جیسے نو وارد کافی دیر ہوئی، اس کے انتظار میں ٹہلتا رہا ہے۔ اب ٹھاکر نے اس سے ہاتھ ملا لیا ہے یا گلے ملا ہے یا نو وارد نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا ہے۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اِدھر تک آئے ہیں۔''

سامنے پرانے قبرستان کا لکڑی کا خستہ حال پھاٹک تھا۔ اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔

''وہ یہاں کھڑے کافی دیر باتیں کرتے رہے ہیں، پھر دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے۔ شاید ہاتھا پائی بھی ہوئی ہے۔ اب شیکھر نے مقابل کو اِدھر دھکا دیا ہے اور تیز تیز چلتا واپس آیا ہے۔ انداز میں غصہ ہے۔''

یہ کہہ کر کھوجی کھڑا ہو گیا اور کپڑوں سے مٹی جھاڑی۔ ''اس کے بعد تو آپ کو علم ہے کہ ٹھاکر واپس مہمان خانے میں چلا گیا تھا۔''

''ایک آخری بات فضل الٰہی! کیا یہ شخص جو اس سے ملا ہے، اس کے پیچھے مہمان خانے تک آیا ہے؟''

''کچے راستے پہ کچھ ایسے نشان ہیں، جیسے کسی نے کھرے مٹا ڈالے ہوں، ہو سکتا ہے وہ پیچھے آیا ہو، مگر راستہ بدل کر۔''

''شکریہ فضل الٰہی۔''

''دلچسپ کارروائی تھی انسپکٹر صاحب! آپ اس نو وارد کے کھرے کا مولڈ تیار کروالیں اور کسی بھی قسم کی پیش رفت سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے گا۔ میں شنکر کے قاتلوں کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ کہہ کر جانے لگی۔

''میم صاحب! آپ کو کسی پہ شک ہے تو بتا دیجئے۔''

''نہیں ہے۔'' پھر ٹھہر کر بولی۔'' ٹھاکر رگھوناتھ کا بیٹا گوپال آج کل گاؤں سے باہر شکار پر گیا ہوا ہے، واپس آئے تو اس کا بیان ضرور لیجئے گا۔'' کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے کھیتوں کی جانب بڑھ گئی۔

انسپکٹر شاہ اس کی پشت پہ گرتی ساڑھی کے پلّو کو دیکھتا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

* * *

کرم دین نے صدمہ سہار لیا تھا، مگر حاجی بشیر اگلے کئی روز تک بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ گاؤں والے اس کی عیادت کیلئے آتے تو اپنے ہمراہ کئی کہانیاں دوسروں کو سنانے کیلئے لے کر پلٹتے۔

''کوئی کہتا ان کے دیکھتے ہی دیکھتے قبر شق ہوئی اور اندر سے وہ بھوت نکلا۔''

''اس کا قد دس فٹ تھا، اس نے منتر پھونک کر حاجی بشیر کو بے بس کر دیا۔''

''انہیں چت کر کے وہ خوف ناک قہقہے لگاتا آسمان پہ اڑتا چلا گیا۔

''اس کی آنکھوں اور منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔''

بات اپنے حجم سے کئی گنا بڑھ کر بیلی راجپوتاں کے چپے چپے تک پھیل گئی۔ حاجی بشیر کو اس کی بیوی، بچوں نے مولوی سے کئی بار دم کروایا، تب وہ جا کر سنبھلا لیکن پھر گاؤں والوں نے پرانے قبرستان کے قریب سے گزرنا بھی چھوڑ دیا، جو بات پہلے لوگ دبی دبی زبان سے کہتے تھے، اب اس کا ثبوت بھی انہیں مل چکا تھا۔

* * *

اس نے بالکونی کی جانب کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ لکڑی کے دونوں پٹ چر چراہٹ کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔ چمکیلی تیز دھوپ اس سے لپٹنے لگی۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنائے، پلکیں سکوڑ کر ادھر اُدھر کا جائزہ لیتی باہر بالکونی میں آ گئی۔

بیلی راجپوتاں پہ جاتی سرما کی چمکیلی دوپہر اتری تھی۔ بالکونی سے دور دور تک پھیلا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔

ایسے منڈیر پہ ترچھی بیٹھی، زرد دیوار سے سر ٹکائے وہ کسی مصور کا خوب صورت پورٹریٹ لگ رہی تھی۔ چہرہ اب بھی برف سا تھا، بالکل بے تاثر اور بھوری آنکھوں میں چمکیلی دھوپ کا عکس اتر

آیا تھا۔ بال اکٹھے کر کے گردن کے دائیں جانب آگے کو ڈال لئے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے دور پھیلے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔

تب ہی ملازمہ روپ وتی اس کے لئے چاندی کی طشتری میں تازہ پھلوں کے رس سے بھرا گلاس لے آئی۔

وہ گلاس تھامے گھونٹ گھونٹ رس پیتی رہی۔ نگاہیں دور کھیتوں پہ تھیں۔

''جانے کس نے جادو ٹونا کر دیا ہے اس حویلی پہ۔''

اس کو خاموش پا کر روپ وتی وہیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی کہنے لگی۔ ''چند ماہ پہلے کی ہی تو بات ہے، جب چھوٹے ٹھاکر آپ کو لے کر پہلی دفعہ حویلی آئے تھے۔ کتنا جشن منایا تھا، کیسا چراغاں کیا تھا بڑے ٹھاکر نے۔ پورا گاؤں سج گیا تھا۔ کتنی دعوتیں کی تھیں ٹھاکروں نے، پر ہائے بھگوان، بس ایک دن کیلئے آپ امرتسر گئیں اور پیچھے سے مہمان خانے میں آگ لگ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی تو لاش پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ بس انگوٹھی اور گھڑی سے پہچانا، ورنہ چہرہ تو بالکل ہی......''

''شیکھر صبح اس مہمان خانے میں کیوں گیا تھا؟'' اس کی بات کاٹ کر مایا نے پوچھا، وہ ابھی تک باہر دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے کسی نے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔''

''مجھے تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر گئے ہیں، جانے کس وقت گئے تھے۔ میں نے تو انہیں شام میں آخری بار دیکھا تھا، کچے راستے پہ۔''

''کچا راستہ؟ کون سا کچا راستہ؟'' مایا نے گردن پھیر کر استعجاب سے اسے دیکھا۔ یہ معلومات اس کے لئے نئی تھیں۔

''وہ جو مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف جاتا ہے، وہ والا راستہ میم صاحب!''

''مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف؟'' مایا نے حیرت سے دہرایا۔ ''شیکھر کا مسلمانوں کے قبرستان میں کیا کام تھا؟''

''بھگوان جانے میم صاحب! میں نے تو آخری دفعہ انہیں ادھر ہی دیکھا تھا، جب میں اپنی موسی کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔''

''کیسے اتنی اچانک سے ہو گیا یہ سب کچھ۔'' مایا زیر لب بڑبڑائی۔ ''میں بس ایک روز کے

لئے امرتسر گئی اور واپس آئی تو شیکھر کی چتا تیار رکھی تھی۔ مجھے تو کسی نے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا۔ بس ایک روز میں اتنا کچھ جیسے موت اس کے تعاقب میں بیٹھی تھی۔"

مایا کو بے اختیار یاد آ گیا، وہ دن جب وہ پہلی دفعہ حویلی میں آئی تھی۔

روشنیوں اور دیوں سے چراغاں کیا گیا تھا، پوری حویلی کسی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ جب وہ اور شیکھر اپنی موٹر سے اترے تو ٹھاکر رگھوناتھ ان کے استقبال کے لئے دروازے پہ کھڑے تھے۔

"مایا ڈارلنگ! یہ میرے تایا ٹھاکر رگھوناتھ ہیں۔ میری تائی کا کئی برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے گوپال جو کہ......" اس کا تعارف کراتے کراتے شیکھر نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے ٹھاکر رگھوناتھ کا چہرہ دیکھا، جنہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"وہ دوستوں کے ساتھ شکار پہ نکلا ہے، صبح تک آ جائے گا۔"

"اوکے بہرحال مایا ڈیئر! تایا ہی میری کل فیملی ہیں، انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔"

اور رات کو اپنے کمرے میں، اس کے قریب بیڈ پہ بیٹھے شیکھر نے اسے بتایا تھا۔

"یہ خبیث بڈھا شروع سے ہی میری جائیداد کے پیچھے ہے اور اس کا وہ کمینہ بیٹا۔ ان دونوں کا بس چلے تو شیکھر کو گولی مار کر اس کی ساری پراپرٹی ہتھیا لیں۔" اور مایا نے جھٹ سے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور شیکھر نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ روپ وتی ابھی تک اس کے سر پہ سوار کچھ کہے جا رہی تھی۔ مایا پھر سے دور فصلوں کو دیکھنے لگی، جہاں کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پہ ایک لڑکی چلتی آ رہی تھی۔

بالوں کا جھولتا پراندہ، گردن میں لاپروائی سے پڑا دوپٹہ اور ہاتھ میں پکڑا بھٹہ جسے وہ چلتے ہوئے ساتھ ساتھ کھاتی جا رہی تھی۔

پگڈنڈی سے اتر کر اب وہ حویلی کے سامنے والے راستے سے گزر رہی تھی۔ فاصلہ کم ہونے کے باعث مایا اس کا چہرہ بغیر کسی دقت کے دیکھ سکتی تھی۔

گندمی رنگت، تیکھے نقوش، مغرور سی بڑی بڑی آنکھیں، وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی،

اتنی جتنی پنجاب کے کسی گاؤں کی کوئی الہڑ مٹیار ہوسکتی تھی۔

"یہ زہرہ ہے، ہلکوں کی دھی۔" روپ وتی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "سارے گاؤں میں اس جیسی سندر لڑکی کوئی نہیں ہے۔"

وہ بلا ارادہ اس لڑکی کو دیکھے گئی۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور کم سن بھی، تقریباً سترہ، اٹھارہ برس کی۔ اب وہ لاپروائی سے بھٹہ کھاتی حویلی کے بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔

دفعتاً کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی جیپ راستہ بدل کر اس کے سامنے آگئی۔ لڑکی ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی۔ جیپ رک چکی تھی۔ اس میں چار افراد بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو وہ جیپ کی کھلی چھت کے باعث بخوبی پہچان گئی تھی۔

وہ ٹھاکر رگھوناتھ کا بیٹا گوپال تھا۔ شیکھر کا تایازاد بھائی۔

"اے...... راستہ کیوں روکا ہے؟" لڑکی بھٹہ ایک طرف پھینک کر ماتھے پہ تیوری ڈالے غصے سے پوچھ رہی تھی۔

جواب میں گوپال اور اس کے دوست ایک ساتھ اس پہ فقرے کسنے لگے۔ ان کا لہجہ دیہی پن سے بھرا تھا، مایا کو الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

"میرے ساتھ زبان سنبھال کر بات کرو۔" لڑکی ہاتھ کمر پہ رکھے تیزی سے بولی۔ "میں بدرغازان کی منگ ہوں، میرے ساتھ بدتمیزی کی تو لاش بھی نہیں ملے گی تمہاری۔"

آن کی آن میں گوپال کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے موڑ کر آگے لے گیا۔ لڑکی نے فاتحانہ انداز میں دھول اڑاتی دور جاتی جیپ کو دیکھا اور استہزائیہ سر جھٹک کر کچھ زیرلب بڑبڑائی۔

"روپا دیوی! جاؤ اس کو میرے پاس لے آؤ۔" مایا نے تحکم سے کہا اور چند لمحوں بعد وہ لڑکی روپ وتی کے عقب میں اس کے کمرے میں سے ہوکر بالکونی میں داخل ہوئی۔

مایا ابھی تک منڈیر پہ ترچھی بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ اپنی راج ہنس سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کے لہجے میں ٹھاکرانیوں کی سی رعونت در آئی تھی۔

"زہرہ جی، زہرہ بتول۔" وہ ویسی ہی لاپروائی سے کھڑی تھی، مگر نگاہوں میں راجپوتوں کی

گوری بہو کے لئے بے پناہ ستائش تھی۔ ''آپ ٹھاکر شیکھر کی بیوہ ہو؟''

مایا نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بے نیاز سی نگاہ سے زہرہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''بڑا افسوس ہوا جی ٹھاکر شیکھر کی موت کا، کچھ پتا چلا آگ کیسے لگی تھی؟'' زہرہ منہ زور اور نڈر ہونے کے ساتھ بڑا اعتماد بھی تھی۔

''تم بتاؤ آگ کیسے لگی تھی؟ تمہیں کچھ پتا چلا؟'' مایا خاموشی سے اس کی بات سننے کے بعد ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

''میں......جی......وہ...... پتا نہیں جی۔'' پٹر پٹر بولنے والی زہرہ گڑ بڑا کر خاموش ہوگئی۔

منڈیر پہ بیٹھی اس مہارانی کے سامنے بولنا اب اسے قدرے مشکل لگ رہا تھا۔

''یہ گوپال تم سے کیا کہہ رہا تھا؟'' وہی بے تاثر، دلچسپی و تجسس سے خالی لہجہ۔

''کہنا وہنا کیا ہے جی!'' زہرہ کے ماتھے پہ بل پڑ گیا۔'' جہاں اکیلی لڑکی دیکھی، کتوں کی طرح بھونکنے آ جاتے ہیں ٹھاکروں کے لڑکے۔''

روپ وتی نے گھبرا کر زہرہ کو دیکھا، جو ٹھاکروں کی حویلی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔

''تو کتوں کو خاموش کرانے کا گُر کہاں سے سیکھا، اس اکیلی لڑکی نے؟'' اس کا لہجہ ابھی تک کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''میں نے بھی کہہ دیا کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، میں بدر غازان کی منگ ہوں۔ بس بدر کے نام سے تو جان جاتی ہے ٹھاکروں کے لڑکوں کی۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔

''ہوں۔'' مایا گہری سانس بھر کر، گردن موڑے پھر سے کھیتوں کو دیکھنے لگی، جیسے پیچھے موجود ان دو نفوس سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔'' میں جاؤں جی؟''

مایا نے گردن پھیرے بغیر ''ہاں'' کہہ دیا تو زہرہ چلی گئی۔ جاتے سمے وہ کچھ کنفیوزڈ سی تھی، شاید اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹھاکرانی نے اسے کیوں بلوایا تھا۔

ان کے جانے کے کتنی ہی دیر بعد گوپال کی جیپ حویلی کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک منڈیر پہ بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ گوپال کو دیکھ کر، اسے چند روز پرانی وہ شام یاد آ گئی، جب وہ اس سے پہلی دفعہ حویلی میں ملی تھی۔

یہ اس کا پہلی راجپوتاں میں دوسرا روز تھا۔

وہ شیکھر کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھی، جب اس نے ایک اونچے لمبے تیس پینتیس برس کے شخص کو جیپ سے نکل کر سامنے کمروں کی جانب جاتے دیکھا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی، جیسے وہ نشے میں ہو۔

''یہ کون ہے؟'' مایا نے شیکھر کا ہاتھ ہلایا۔ وہ بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، متوجہ کرنے پہ گردن موڑ کر ایک نظر پیچھے دیکھا۔

''مائی کزن! گوپال راج!'' شیکھر سر جھٹکتے ہوئے پھر سے فائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''شاید نشے میں ہے۔'' مایا نے چائے کی پیالی میز پہ رکھ دی۔ گوپال اب اندر جا چکا تھا، اس نے اگر شیکھر کو دیکھا بھی تھا تو ملنے کی یا بات کرنے کی سعی نہیں کی تھی۔

مایا گھونٹ بھرتی اس تناؤ کو محسوس کرتی رہی جو شیکھر اور تایا رگھوناتھ کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا۔

شام کی سرد ہوا کا تیز جھونکا آیا تو وہ چونکی اور منڈیر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا، سورج جانے کب کا ڈوب چکا تھا۔ وہ ساڑھی کا پلّو ہاتھ سے سنبھالے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

⁂ ⁂ ⁂

چاچی باورچی خانے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی، زہرہ اِدھر اُدھر سے اسے آوازیں دیتی باورچی خانے کے دروازے تک آئی۔

''چاچی، بدر کہاں ہے؟''

'کل سے شہر گیا ہوا ہے، کیوں خیریت میری دھی؟'' چاچی ہاتھ روک کر پوچھنے لگی۔ زہرہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار سمٹ آتا تھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' وہ نڈھی سی دھپ سے چوکی کھینچ کر اس کے ساتھ آن بیٹھی۔

''کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟''

''نا یہ ٹھاکروں کے لڑکوں کا مسئلہ کیا ہے؟'' وہ کچی سبزی اٹھا کر کھانے لگی۔

چاچی نے چھری رکھ دی۔ ''کسی نے کچھ کہا ہے تجھے؟''

''آہو، ٹھاکر گوپال ہے نا، اس نے اپنی موٹر سے میرا راستہ روکا۔''

''پھر......؟'' چاچی پریشان ہوگئی۔

''میں نے بھی بدر کے نام کی دھمکی دے دی، ایسے بھاگا کہ بس!'' وہ مزہ لے کر کھلکھلائی، پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔ ''ویسے بدر کب آئے گا؟ بتاؤں تو سہی اسے وہ خود ہی نمٹ لے گا۔''

''پاگل مت بن زہرہ! گوپال دبک گیا، بس اتنا ٹھیک ہے، اب بدر کو نہ بتانا میری دھی، تجھے اس کے غصے کا پتا تو ہے، خوامخواہ بات بڑھے گی۔''

''پر چاچی! بدر ایک دفعہ اس کی طبیعت تو ٹھیک کرے نا۔'' وہ منمنائی۔

''ارے جھلی! ہر بات گھر کے مردوں کو بتانے کی نہیں ہوتی، ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا اور تجھے کتنی دفعہ کہا ہے یوں اکیلی نہ لور لور پھرا کر، اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ خیال کیا کر۔'' چاچی نے ڈپٹ دیا۔

''اچھا'' وہ خفا سی ہوگئی، پھر ایک دم جوش سے بولی۔ ''تو نے ٹھاکر شیکھر کی گوری میم دیکھی ہے؟ راجپوتوں کی نئی ٹھاکرانی؟''

''ٹھاکر شیکھر کی بیوہ؟ نہیں ان سے کون سا ایسے تعلقات ہیں جب......'' چاچی سر جھٹک کر سبزی کاٹنے لگی۔

''مجھے روپ وتی نے آج کہا کہ تمہیں مہارانی بلا رہی ہے تو میں راجپوتوں کی حویلی چلی گئی۔''

''زہرہ!'' چاچی دنگ رہ گئی۔ ''تو راجپوتوں کی حویلی چلی گئی؟ بدر کو علم ہوا تو جانتی ہے کیا ہو گا؟''

''اور بدر کو کیسے علم ہوگا؟'' وہ ہنس دی۔ ''پر چاچی! وہ بہت شان والی ہے۔''

''شیکھر کی بیوہ؟ کیا بہت حسین ہے؟''

''حسین تو پتا نہیں مگر......مگر......'' زہرہ کو جیسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ''بس میں تجھے کیا بتاؤں چاچی! وہ بہت شان والی ہے، بالکل جیسی مہارانیاں ہوتی ہیں، اتنی خوب صورت نہیں ہے، مگر بالکل مہارانی لگتی ہے، آنکھ نہیں ملائی جاتی اس سے۔''

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چاچی بدر آئے تو مجھے بتانا، مجھے کام ہے اس سے۔''

''ہاں پتا ہے مجھے، کیا کام ہے تجھے؟'' چاچی ہنس دی تو وہ جھینپ کر وہاں سے بھاگ گئی، مگر بھاگنے سے پہلے چاچی نے زہرہ کے چہرے پہ بکھرے دھنک رنگ دیکھ لئے تھے۔

* * *

گھاس شبنم کے قطروں سے لدی تھی۔ وہ ان قطروں پہ اپنے سپید پاؤں رکھتی کیاری کی طرف چلی آئی، جہاں بڑے بڑے تازہ سرخ گلاب لگے تھے۔ سامنے گھاس پہ سرخ پتیاں بکھری تھیں۔

شاید کوئی باسی گلاب ٹوٹ کر گرا تھا اور ہوا نے اس کی پتیاں بکھیر دی تھیں۔

مایا وہیں کیاری کے قریب جھک کر پتیاں چننے لگی۔ دور باغیچے کے آغاز پہ کوئی تیزی سے چلتا برآمدے کی جانب بڑھ رہا تھا، اسے دیکھ کر جیسے ٹھٹک کر رک گیا۔

تازہ سرخ گلابوں کے قریب گھاس پہ ننگے پاؤں بیٹھی لڑکی سر جھکائے پتیاں چن کر اپنی گود میں بھر رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کی پاؤں تک آئی نائٹی میں ملبوس تھی اور شہد رنگ بال شانوں پہ بکھرے تھے۔

ٹھاکر گوپال راج اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے گھاس پہ آ گیا۔ بھاری جوتوں تلے نرم گھاس دبتی، کچلتی گئی، مگر مایا اسی طرح مگن کیاری سے پھول توڑ کر گود میں ڈال رہی تھی۔

وہ اس کے بالکل سامنے آ گیا۔

''گلاب پسند ہیں آپ کو مایا دیوی؟''

''سب کو ہوتے ہیں۔'' وہ بغیر چونکے، اسی اطمینان سے گود میں رکھے پھولوں کی ٹہنیاں برابر کرتی رہی، سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔

جانے کیسی بے نیازی اور غرور تھا اس چند قدم کے فاصلے پہ بیٹھی لڑکی کے اندر کہ گوپال کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ حسین تھی، مگر گوپال نے اس سے کہیں زیادہ حسین عورتیں دیکھی تھیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ گوری میم تھی، گوپال نے بہت سی میمیں، پھیکے شلجم جیسی گوریاں دیکھ رکھی تھیں۔ یہ حسن نہیں تھا، جو اس عورت کو دوسروں سے بالکل ممتاز بناتا تھا، یہ ایک سحر، کشش اور تمکنت تھی، جو گوپال راج نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی عورت میں دیکھی تھی۔

''آپ...... آپ انگلستان واپس جا رہی ہیں؟''

''نہ جاؤں......؟'' اس نے گلدستہ بناتے بناتے رک کر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں تو...... ہاں مگر۔''

وہ کوئی وضاحت سنے بغیر سر جھکائے گلدستے کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

''آپ شیکھر کی تمام جائیداد بیچنا چاہتی ہیں؟'' گفتگو شروع کرنے کی ایک اور کوشش۔

''ہاں۔''

''اس سلسلے میں پتا جی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔''

''وہ کر رہے ہیں۔'' ایک لمبی ٹہنی کو مروڑ کر گلدستے کے گرد باندھا۔

''اوہ اچھا'' وہ شرمندگی چھپانے کو کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔ ''آپ کی اور شیکھر کی پسند کی شادی تھی؟''

''ہوں۔''

''آپ دونوں ساتھ بہت خوش تھے، کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائے گا۔''

وہ گلدستہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود سے بہت سی پتیاں گھاس پہ آن گریں۔ وہ کیاری سے کھڑے کھڑے جھک کر کچھ پتے توڑنے لگی۔

''آپ واپس انگلستان جا کر کیا کریں گی؟''

''یہ بدر غازان کون ہے؟'' پتے توڑ کر گلدستے کو سجاتے اس نے پوچھا۔

گوپال اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا، یہ سوال اس کے لئے قطعاً غیر متوقع تھا۔

''جی......؟ بدر غازان؟ آپ کو کس نے بتایا؟''

''کل جس لڑکی کو آپ حویلی کے باہر چھیڑ رہے تھے، اس نے بدر غازان کے نام کی ہی دھمکی دی تھی نا آپ کو۔''

گوپال کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کون ہے یہ بدر غازان؟'' وہ نگاہیں گلدستے پہ جھکائے اسے بڑے بڑے سبز پتوں سے سجا رہی تھی۔

''مُسلا ہے اور کچھ نہیں۔'' کوئی موٹی گالی لبوں پہ روک کر، بس اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم [illegible]

وہاں سے چلا گیا۔

مایا نے اطمینان سے گلدستہ مکمل کیا، گھاس پہ گری پتیاں چن کر کیاری میں ڈالیں اور شبنم کے نرم قطروں پہ پاؤں رکھتی باغ سے باہر آئی۔ کنارے پہ رکھی اپنی نازک جوتی پہنی اور ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

روپ وتی کو اس وقت یقیناً رسوئی میں ہونا چاہئے تھا، وہ کچھ سوچ کر ہال کمرے سے دائیں جانب ہولی۔ چند راہداریاں عبور کر کے وہ رسوئی کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

''روپا دیوی۔'' اس نے ہلکا سا دروازہ بجایا۔

ناشتہ بناتی روپ وتی چونک کر پیچھے مڑی۔ بیچ چوکھٹ میں گلابی نائٹی پہنے، ہاتھ میں گلدستہ لئے مایا کھڑی تھی۔

''مہارانی جی! آپ؟ خیریت؟'' روپا ہاتھ دھو کر، ساڑھی کے پلو سے خشک کرتی اس تک آئی۔

''مجھے باہر جانا ہے، میرے ساتھ چلو۔''

''ناشتہ کر کے یا......؟''

''نہیں میں بس......'' مایا نے ایک نظر اپنے شب خوابی کے لباس کو دیکھا۔'' لباس تبدیل کر لوں۔''

''جانا کدھر ہے جی؟''

''زہرہ کے گھر، جو کل آئی تھی۔'' کہہ کر وہ گلدستہ ہاتھ میں لیے واپس راہداری میں مڑ گئی۔

''ایں؟ زہرہ کے گھر؟'' روپا حیران پریشان کھڑی رہی۔ یہ نئی مہارانی بھی ایک معمہ تھی۔

چند منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے پھر سے رسوئی کے دروازے پہ کھڑی تھی۔

''چلو۔'' تحکم سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

سفید لانگ سکرٹ، ہلکا گلابی بلاؤز اور شانوں پہ سفید رنگ کی چھوٹی سی اسٹول پھیلائے، وہ بہت بے نیازی سے چل رہی تھی۔

زہرہ کے گھر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ وہیں ان کو کھیتوں کے اس طرف اپنی کسی سہیلی کے ہمراہ ٹہلتی مل گئی۔

اس کا تعلق اونچے گھرانے سے تھا، گاؤں میں مسلمانوں کے اونچے گھرانوں کی جوان بیٹیاں یوں نہیں پھرا کرتی تھیں، مگر زہرہ کو اس کی کم سنی اور غالباً لاڈلی ہونے کے باعث خاصی رعایت مل جاتی تھی۔

''مایا دیوی...... آپ۔'' وہ سہیلی کو بھگا کر ان کی طرف آ گئی۔

''ہاں زہرہ! مہارانی جی تم سے ہی ملنے آ رہی تھیں۔''

''یہ تمہارے لئے۔'' مایا نے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ ''کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، سو تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر سکی۔''

کل کی نسبت آج مایا کے چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ تھی، مگر پھر بھی انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اپنی عادت کے برعکس اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر سکی۔

''شکریہ ٹھاکرانی جی!'' اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ گلدستہ قبول کیا۔

''تم اچھی بہادر لڑکی ہو۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ روپا ان سے چند قدم پیچھے تھی۔

''بننا پڑتا ہے جی! ٹھاکروں کے لڑکے ورنہ جینے نہیں دیتے۔''

سورج نکل چکا تھا اور نرم گرم دھوپ سے اس کے سنہری مائل شہد رنگ بال چمکنے لگے تھے۔

''شیکھر کیسا لگتا تھا تمہیں؟''

''ان کے بارے میں گاؤں والے زیادہ جانتے نہیں ہیں۔ وہ بچپن سے ہی تعلیم کیلئے دہلی چلے گئے تھے، پھر کاروبار کے بعد تو دہلی ہوتے یا ولایت، گاؤں تو کبھی کبھار ہی آتے تھے۔''

''اور یہ بدر غازان کون ہے؟''

زہرہ کے چہرے پہ دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے۔ مایا نے بہت غور سے انہیں دیکھا تھا۔

''میرے چچا کا بیٹا، میرے ماں باپ کے بعد میرے چچا، چاچی نے ہی مجھے پالا ہے۔'' وہ سر جھکائے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے کچے راستے پہ دور نکل آئی تھیں۔

''کرتا کیا ہے؟''

''وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے، اب تو باپ دادا کی زمینیں سنبھالتا ہے۔''

"کیا بیلی راجپوتاں کے سارے زمین داروں سے ٹھاکر گوپال اسی طرح ڈرتا ہے؟" مایا کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

"ہمارا خاندان گاؤں کا واحد مسلم خاندان ہے۔ ہماری زمینیں راجپوتوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کم بھی نہیں ہوں گی۔ پہلے یہ لوگ بات بات پہ ہندو مسلم فسادات بھڑکا دیتے تھے، مگر اب کئی برس سے کوئی فساد نہیں ہوا۔ یہ بدر سے ڈرتے ہیں، جانتے ہیں اس کے پاس طاقت بھی ہے اور اثر و رسوخ بھی۔"

"بس اسی لئے ڈرتے ہیں؟"

"تو آخر ہے کوئی اس پورے گاؤں میں بدر جیسا؟" اپنے پراندے سے کھیلتی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، ایک دم رک گئی۔ "ادھر نہ جائیں مایا دیوی۔"

وہ جو اس کے ساتھ چلتے چلتے اس کچے راستے پہ کافی آگے تک آ گئی تھی، ٹھٹک کر رک گئی۔

"مگر کیوں؟ ادھر کیا ہے؟" اس نے حیرت سے کچے راستے کو دیکھا اور پھر روپ وتی اور زہرہ کے چہروں پہ چھائے خوف کو۔

"مہارانی جی! یہ راستہ پرانے قبرستان کو جاتا ہے، وہاں...... وہاں سایہ ہے جی!" روپ وتی کی آواز میں خوف در آیا تھا۔

"سایہ؟ کس چیز کا سایہ؟"

"بھوت کا سایہ، کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے جی!"

"کیا بات کر رہی ہو روپا؟" مایا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"روپا دیوی ٹھیک کہہ رہی ہے ٹھاکرانی جی! پرانے قبرستان میں سایہ ہے۔ لوگ اب اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتے بلکہ اس دن تو اچھو کمہار نے خود اس بھوت کو دیکھا ہے، سیاہ چغہ پہن رکھا تھا اور قبرستان کے آس پاس چکر کاٹ رہا تھا، تین روز تک اچھو کمہار کو بخار رہا۔"

"اور گاؤں والے کہتے ہیں کہ روز رات کو سیاہ چغے میں ملبوس ایک لمبا سا بھوت پرانے قبرستان میں آتا ہے اور پھر ایسی آوازیں آتی ہیں، جیسے وہ کچھ کھود رہا ہو۔"

"گاؤں والوں نے کبھی اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی؟" مایا کو ابھی تک یقین نہ تھا۔

"نہ جی، توبہ کریں۔ ہوائی چیزوں کا بھی پیچھا کیا جاتا ہے کیا؟" روپا نے کانوں کو ہاتھ

لگائے۔

''اور ٹھاکرنی جی! کسی نے آج تک اسے آتے جاتے نہیں دیکھا، کسی قبر سے اٹھتا ہے وہ شاید۔''

''شاید!'' اس نے طنزاً دہرایا۔ ''ہوگا کوئی عامل بابا، کوئی چلہ وغیرہ کر رہا ہوگا، تم گاؤں والے بھی نا۔''

''بدر بھی یہی کہتا ہے۔'' زہرہ نے تاسف سے سر جھٹکا، جیسے مایا اور بدر، دونوں کی عقل پہ ماتم کر رہی ہو۔

''کیا کہتا ہے وہ؟'' بلاارادہ بھی وہ متوجہ ہوگئی۔

''یہی کہ یہ گاؤں کا ہی کوئی بندہ ہے، کسی واردات میں ملوث، یقیناً کسی کو قتل کر کے دبایا ہوگا اور اب لاش ڈھونڈ رہا ہے۔''

''بہت معقول آدمی ہے تمہارا تایازاد، ملوانا مجھے کبھی اس سے، ابھی تو چلو تمہارا وہ قبرستان دیکھتے ہیں۔''

روپ وتی اور زہرہ روکتی رہ گئیں، مگر بیلی راجپوتاں کی وہ مہارانی کہاں کسی کی سنا کرتی تھی۔

وہ پھاٹک کھول کر اندر چلی گئی۔ قبرستان بہت قدیم تھا، جیسے کوئی صدیوں پرانا کھنڈر ہو۔ اس کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ کونے میں برگدے کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تھا، جس کی جھکی شاخیں اور قبرستان کی پراسرار فضائیں اس بیلی راجپوتاں کے بھوت کی گواہ تھیں، جس نے پورے گاؤں کو متوحش کر رکھا تھا۔

وہاں کی خاموش فضا بہت پُراسرار تھی، اپنے اندر بہت سے صدیوں پرانے راز دفن کیے۔ ایسے لگتا تھا، جیسے وہاں سفید لبادے اوڑھے ان دیکھی روحیں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ بالکل، ان کے آس پاس۔

''تو ادھر آتا ہے وہ بھوت؟'' سینے پہ ہاتھ باندھے وہ طائرانہ نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

''چلئے مہارانی جی! مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔''

وہ دونوں مارے باندھے اس کے پیچھے آئی تھیں اور اب خوف سے روپ وتی کا برا حال

تھا۔

"کیا خیال ہے، رات تک انتظار نہ کریں؟ میں اس سورما کو دیکھنا چاہتی ہوں، جو معصوم لوگوں کو جانے کتنے عرصے سے ڈرا رہا ہے۔"

"بھگوان نہ کرے جو ہم رات ادھر بسر کریں، چلئے مہارانی جی! بڑے ٹھاکر کو علم ہوا تو بہت خفا ہوں گے۔"

"کیوں؟" مایا تیزی سے پلٹی۔ "تمہارے بڑے ٹھاکر کو میرے گاؤں میں چلنے پھرنے پر بھی اعتراض ہے؟ میرا گھر برباد ہو گیا، میرا پتی مجھ سے چھن گیا، اس کا آخری بار منہ نہیں دیکھنے دیا مجھے کیا یہ ظلم کم تھا جو اب مجھے حویلی میں قید کرنا چاہتے ہیں؟"

روپ وتی اور زہرہ ششدر رہ گئیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہارانی جی؟"

"کیا غلط کہا میں نے؟ کیوں پڑے ہیں یہ شیکھر کی جائیداد کے پیچھے؟ کیا انہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کو مرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟" بہت دن کا لاوا جیسے اس کے اندر سے نکلا تھا۔

"ٹھاکروں کو بھی چھوٹے ٹھاکر کی موت کا اتنا ہی دکھ ہے مہارانی جی! آپ یوں دل برا نہ کریں۔"

"جانے بھی دے، روپا۔" وہ سر جھٹک کر تیز تیز قدموں سے چلتی کھلے پھاٹک سے باہر چلی گئی۔

روپ وتی اور زہرہ بتول ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

* * *

زہرہ پراندہ جھلاتی ہمیشہ کی طرح بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی اور پھر ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

سامنے چارپائی پہ بدر بیٹھا تھا، اس کی زہرہ کی طرف کمر تھی اور وہ چاچی کی کوئی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

ایک دم سے برآمدے میں جیسے دھنک اتر آئی تھی۔ زہرہ کو ہر شے خوب صورت لگنے لگی۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی اور سلام کیا۔

وہ ماں کی کسی بات پہ الجھا بیٹھا تھا، چونک کر سر اٹھایا اور سلام کا جواب دیا، پھر وہ دوبارہ ماں سے بات کرنے لگا۔ وہ وہیں خاموشی سے چارپائی کی پائنتی پہ ٹک گئی۔

''زہرہ! صبح صبح کدھر چلی گئی تھی، میں تجھے ڈھونڈ رہی تھی۔'' چاچی بات ادھوری چھوڑ کر زہرہ سے کہنے لگی۔

زہرہ نے سر اٹھایا اور ایک چور نگاہ اس پہ ڈالی، جو کچھ سوچتا ہوا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے دیوار پہ جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں اُلجھا تھا۔

''بس نسیمہ کے ساتھ کنویں تک گئی تھی۔'' وہ پلکیں جھکائے کہنے لگی۔ بدر کے سامنے اس کی پلکیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔

''اتنی دیر کر دی کنویں پہ، بدر تمہارا پوچھ رہا تھا۔''

زہرہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر بدر کو دیکھا۔ وہ اسی مغرور، بے نیاز انداز میں چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ گیلے سیاہ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور آستینیں کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں، شاید وہ ابھی نہا کر آیا تھا۔

پتا نہیں وہ اس کا پوچھتا بھی تھا یا چاچی ایسے ہی اس کا دل رکھنے کو کہتی تھی۔

''بس چاچی! وہ ٹھاکر شیکھر کی بیوی مل گئی تھی راستے میں، وہ پرانے قبرستان لے گئی تو وہیں دیر ہو گئی۔''

بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم پرانے قبرستان کیوں گئیں؟''

''میں نہیں گئی ٹھاکر شیکھر کی بیوی لے گئی تھی، وہ گوری ٹھاکرنی۔'' وہ نظریں جھکائے بدر کے تنومند ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ٹھاکر شیکھر کی بیوی؟'' بدر ایک دم چونکا۔ ''وہ جو انگلستان سے آئی ہے؟''

''ہاں۔'' زہرہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اتنا وجیہہ و خوبرو تھا کہ وہ زیادہ دیر اسے دیکھ نہ سکی۔

''وہ واپس نہیں گئی ابھی تک؟''

''نہیں، ابھی تک تو ادھر ہی ہے، مگر خوش نہیں لگتی۔''

"ظاہر ہے اس کا شوہر مرا ہے۔" وہ بظاہر لاپروائی سے کہہ کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"تم نے اس انگریز لڑکی کو دیکھا ہے بدر؟"

"لڑکی ......؟" بدر کو بس اس لفظ پہ حیرت ہوئی تھی۔ "ٹھاکر شیکھر کی ٹھاکرانی لڑکی ہے؟"

"ہاں۔" زہرہ ہنس دی۔ "اور اتنی حسین ہے کہ تم دیکھے رہ جاؤ۔"

"میں کیوں دیکھتا رہ جاؤں؟" وہ ناگواری سے شانے جھٹک کر رہ گیا۔

"نہیں بدر! اس کا واقعی شیکھر سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔ شیکھر تو چالیس کے قریب تھا، سانولا سا، معمولی قد کا اور وہ تو مہارانی ہے، لوگ کہتے ہیں برطانیہ کی شہزادی ہے۔"

"ہو گی۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"مگر وہ خوش نہیں لگتی۔ وہ کہتی ہے اسے ٹھاکروں نے قید کر رکھا ہے اور اسے واپس انگلستان نہیں جانے دے رہے۔"

"تو کس نے کہا تھا اسے راجپوتوں میں شادی کرے؟ کیا برطانیہ میں لڑکے ختم ہو گئے تھے؟ اب خود بھگتے۔" بدر نے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہہ کر پیالی خالی کر کے رکھ دی۔ اس کے مغرور چہرے پہ تناؤ سا آ گیا تھا۔

"ہاں پتا نہیں، اس نے شیکھر سے شادی کیوں کی؟"

"اور یہ پرانے قبرستان کا کیا قصہ ہے؟ تم کیوں گئیں ادھر؟" وہ ماتھے پہ بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔ یہ حق جتاتا، رعب جماتا انداز زہرہ کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

"مایا دیوی لے گئی تھی، کہتی تھی یہ کوئی انسان ہے جو بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے اور ہم سب ایسے ہی ڈر رہے ہیں۔ وہ قبرستان دیکھنا چاہتی تھی۔ بس اسی کے ساتھ میں چلی گئی۔"

"زیادہ میل جول نہ رکھا کرو راجپوتوں کی عورتوں سے، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

وہ خفگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس سے خاصا اونچا تھا، لمبا چوڑا، وجیہہ مرد، جس کے ساتھ وہ خود کو ہمیشہ محفوظ تصور کرتی تھی، مگر جانے وہ واقعی اس کا پوچھتا تھا، یا چاچی خود ہی...... ؟ وہ سوچتے ہوئے اس کو لمبے ڈگ بھر کر دور جاتے دیکھتی رہی۔

* * *

روپ وتی بہت خاموشی سے برتن دھو رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں دور الجھا ہوا تھا۔

''روپا دیوی، کدھر گم ہو؟'' رتن بوا رسوئی میں آئی تو اسے یوں گم صم پانی میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''ہوں......؟'' روپا چونکی، پھر بے دلی سے سرنفی میں ہلا دیا۔'' کچھ نہیں رتن بوا۔''

''کسی نے کچھ کہا ہے؟'' رتن بوا اس کے قریب آئی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''بس بوا، مجھے مایا دیوی کی حالت پہ ترس آتا ہے۔''

''اے کیا ہوا مایا دیوی کو؟'' رتن بوا آخری عمر میں بھی اپنی متجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی، مارے تجسس کے وہیں بیٹھ گئی، کیونکہ روپا کا انداز اسے کچھ اور بتا رہا تھا۔

''بڑے ٹھاکر کی نظر ٹھاکر شیکھر کی جائیداد پہ ہے اور وہ مایا دیوی کو حویلی میں محصور کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔''

رتن بوا ہکا بکا رہ گئی۔

''تجھے کس نے کہا؟''

''خود مایا دیوی کہتی ہے۔ شاید ٹھاکر اس کی زمین ہتھیانا چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ مایا دیوی کو واپس انگلستان نہیں جانے دے رہے۔''

''ہائے بھگوان! ایسے نہ بول روپا، ٹھاکر جیسے بھی ہیں ٹھاکرانی کو عزت دیتے ہیں، آخر وہ شیکھر کی دلہن تھی۔''

''تجھے بھی پتا ہے کہ ٹھاکر کیسے ہیں اور مجھے بھی پتہ ہے۔ اب تو دیکھنا بوا یہ مایا دیوی کو کسی بہانے حویلی میں محصور کرنے کی کوشش کریں گے۔'' روپ وتی دل کا بوجھ ہلکا کر کے مطمئن سی برتن دھونے لگی، جبکہ رتن بوا کو تو ہول اٹھ رہے تھے۔

انکشاف چھوٹا نہ تھا، گاؤں والے تو بس اتنا جانتے تھے کہ ٹھاکروں کے آپس کے تعلقات بہترین ہیں، مگر اب یہ نیا انکشاف خاصا خطرناک تھا۔ اگر ٹھاکر اپنی حویلی میں مایا دیوی کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے تو یہ خبر ان کی برسوں کی ساکھ کو توڑنے کیلئے کافی تھی۔

رتن بوا کو اب جلد از جلد اپنے دل کا یہ بوجھ ہلکا کرنا تھا، سو اس نے فوراً ہی گھر جا کر اپنی بیٹی کو بتا دیا، جس نے چار مزید لوگوں اور یوں۔

شام تک آدھے نیلی راجپوتاں کو خبر مل چکی تھی کہ راجپوت اپنی انگریز بہو کی جان کے درپے

ہیں اور اس کی جائیداد ہتھیانے کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

* * *

دروازے پہ مدھم دستک ہوئی۔

مایا نے بال سنوارتے ہوئے ''آ جاؤ'' کہا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ڈھیلی سی چوٹی گوندھ رہی تھی۔

دروازہ ہلکی سی چر چراہٹ کے ساتھ کھلا۔

روپ وتی نے چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔

''مہارانی جی! بڑے ٹھاکر شام کی چائے پہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' چوٹی گوندھتے اس نے مصروف انداز میں محض سر کو جنبش دینے پہ اکتفا کیا۔

روپ وتی سر جھکائے دروازہ بند کرتی واپس پلٹ گئی۔

لمبی سنہری چوٹی اس نے گردن کے دائیں آگے کو ڈال دی، سفید ساڑھی کا پلو درست کیا اور آئینے میں خود پہ ایک آخری نگاہ ڈال کر باہر آ گئی۔

اپنی ازلی نزاکت سے زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو ہال کمرہ خالی پڑا تھا، یقیناً ٹھاکر رگھوناتھ باہر برآمدے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ سیڑھیوں سے اتر کر آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ سیڑھیوں کے اس طرف ایک بڑا سا پیانو رکھا تھا۔

مایا کسی معمول کی طرح چلتی پیانو تک آئی۔ اس کا کیس سیاہ لکڑی کا بنا تھا اور اوپر دیوار پہ ہم رنگ لکڑی کا بنا بیضوی آئینہ نصب تھا۔

اس نے ہاتھ سے پیانو کی کیز کو ہلکا سا چھوا، پھر ایک ہی رو میں انگلی تمام کیز سے گزاری۔

خاموش فضا میں انوکھا سا راگ گونج اٹھا۔

مایا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے آئینے میں اس کا عکس نمایاں تھا۔ بالوں میں پروئی موتیوں کی لڑی کے عین وسط میں لگی ایک بدصورت گرہ..... اس کی انگلی خود بخود اس گرہ پہ جا ٹھہری۔

سامنے لگا آئینہ یکدم جیسے سکرین بن گیا، ماضی کی ایک یاد فلم کی طرح اس پہ چلنے لگی تھی۔

اسے اس سکرین میں ایک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اونچی نیچی سی چڑھائی، سرسبز پہاڑی اور ہاتھ

میں ہاتھ ڈالے، اوپر چڑھتے دو نفوس اور پیچھے ڈلہوزی کا ڈوبتا سورج۔

''شام ہو رہی ہے، واپس چلنا چاہئے۔'' وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس سرسبز پہاڑی پہ اوپر چڑھتے جا رہے تھے، جب شیکھر نے رک کر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

''میں سورج دوبتے دیکھنا چاہتی ہوں، آج ہماری ڈلہوزی میں آخری رات ہے۔ یہ ہمارے ہنی مون کا آخری غروب آفتاب ہے۔''

اس نے ہلکا پنک سویٹر پہن رکھا تھا، شہد رنگ بال شانوں پہ بکھرے تھے۔

''تمہیں ڈلہوزی اتنا پسند آیا کیا؟''

''نہیں، مجھے تم پسند آئے۔'' اور دونوں ہنس پڑے۔

''ہم اگلی دفعہ......'' وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ اسے لگا اس نے کسی کی کراہ سنی ہے۔

شیکھر ہنستے ہوئے کچھ کہتے کہتے چند قدم آگے بڑھ گیا تھا، اسے ساتھ نہ پا کر پیچھے دیکھا۔ وہ وہیں کچھ کنفیوز سی کھڑی تھی۔

''آؤ ڈارلنگ! رک کیوں گئیں؟''

''ایسے ہی۔'' وہ سنبھل کر مسکراتی دو قدم آگے بڑھی اور پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے، باتیں کرتے آگے بڑھتے رہے۔ اسی دوران مایا نے دوسرے ہاتھ سے سویٹر کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر غیر محسوس انداز میں زمین پہ گرا دیا۔

سڑک عبور کر کے وہ دونوں اپنے بنگلے کے گیٹ کی طرف آ گئے۔ وہاں قطار میں چند بنگلے بنے تھے، جو دہلی، امرتسر اور بمبئی کے امراء کی ملکیت تھے، جہاں وہ ہر سال چھٹیاں منانے آتے تھے۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ شیکھر اندر داخل ہوا۔ مایا نے اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رک گئی۔

''میری الماری کی چابیاں، شیکھر!'' اس نے پاکٹ الٹ دی، وہ خالی تھی۔

''کدھر گئیں؟'' وہ بھی رک گیا۔

''اوہ! جس پتھر پہ ہم بیٹھے تھے، وہیں میں نے نکالی تھیں، ادھر ہی رہ گئی ہوں گی۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''

وہ جانے کو پلٹی تو اس نے روکا۔ ''میں بھی چلتا ہوں، اکیلی نہ جاؤ۔''

''اوہ ڈارلنگ! دو منٹ ہی تو لگیں گے۔ تم اندر جا کر فریش ہو لو، میں بس ابھی آئی۔'' پھر جاتے جاتے مڑی۔ ''اور اگر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔''

''دیر ہو جائے گی کیا؟''

''بتایا تھا نا، میں ڈلہوزی کا ڈوبتا سورج دیکھنا چاہتی ہوں۔'' مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپا کر وہ آگے سڑک پہ چلی گئی۔ شیکھر کشمکش میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر اندر کو ہو لیا۔

مایا تیز قدموں سے اس جگہ واپس آئی، جہاں اس نے چابیاں گرائی تھیں، جھک کر گچھا اٹھایا اور جیب میں ڈالتی نیچے اترتی گئی۔

شام کی روشنی ابھی باقی تھی۔ سورج کی کرنیں ابھی تک درختوں سے لپٹی تھیں۔ وہ بغیر دقت کے دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔

اب وہ سڑک سے اتر کر پہاڑی کی ڈھلان اترنے لگی۔ اسی جگہ کے آس پاس اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی تھی۔

وہ احتیاط سے سنبھل سنبھل کر پتھروں پہ قدم رکھتی، ادھر ادھر دیکھتی اتر رہی تھی۔ وہ جو بھی تھا، اسے ادھر ہی آس پاس ہونا چاہیے تھا۔

اور پھر وہ اسے نظر آ ہی گیا۔

چند درختوں کے بیچ گرا ایک نڈھال وجود۔

مایا آہستہ آہستہ درختوں کا سہارا لیے، خشک پتوں پہ قدم رکھتی اس تک آئی۔

وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ نڈھال سا گرا کراہ رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے والے درخت کی اوٹ میں سے سر نکالے اسے دیکھنے لگی۔

پہلی نظر میں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کا خوش شکل مرد تھا۔ چہرے پہ ہلکی ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد سا پڑ رہا تھا اور وہ مسلسل درد سے کراہ رہا تھا۔

''اے... کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ اب درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ زخمی نے شاید سنا نہیں تھا، وہ آنکھیں تکلیف کی شدت سے بند کیے کراہ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب

آئی اور اس کا شانہ ہلایا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ سنسان درختوں کے درمیان ایک دراز قد، سنہری چوٹی والی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''مسٹر! کیا ہوا ہے؟ کیوں بچوں کی طرح رو رہے ہو؟'' وہ چہرے پہ ناگواری لیے پوچھ رہی تھی۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر شاید اس میں لمبی بات کرنے کا دم نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر مایا کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے اوپر درخت کی لٹکتی شاخ پہ ڈالی۔

مایا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سر اٹھایا۔ شاخ پہ ایک سیاہ رنگ کا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

''اوہ.....'' سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ بہت آرام سے جھکی اور ایک وزنی پتھر اٹھایا، پھر شاخ کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ سانپ نیچے آن گرا، دوسرے ہی لمحے وہ بہت اطمینان سے وزنی پتھر سے اس کا سر کچل چکی تھی۔

''اب بتاؤ، کدھر کاٹا ہے تمہیں سانپ نے؟'' وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور زخمی کا ہاتھ اس کی پنڈلی سے ہٹایا۔

وہاں ٹخنے کے قریب سانپ کے کاٹنے کا نشان تھا، زخم بالکل تازہ تھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے، سو ڈرو مت۔'' اس نے رومال نکال کر زخم سے کچھ اوپر کس کر باندھ دیا اور پھر زخم پہ اپنا چہرہ جھکایا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' زخمی گھبرا کر پیچھے ہونے لگا۔

''چپ رہو۔'' وہ ناگواری سے جھڑک کر دوبارہ زخم پہ جھکی اور قدیم ویدوں کے سے انداز میں چوس کر زہر نکال لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے زخم کو صاف کر رہی تھی۔

''میں کسی کو بھیج کر تمہیں ہسپتال پہنچا دیتی ہوں، مگر تمہیں سونا نہیں ہے، سو گئے تو مر جاؤ گے، ویسے کس نے کہا تھا اس سے دلہوزی کے جنگلوں میں بھٹکتے رہو۔'' اس کے زخم کا آخری جائزہ لیتی وہ کہہ رہی تھی۔ زخمی کچھ کرب سے مسکرا دیا۔

''آپ بھی تو اسی سے ادھر بھٹک رہی تھیں۔''

''مگر مجھے یہ سانپ نہیں کاٹتے۔''

''اچھا؟ وہ کیوں؟'' وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔

''یہ جس نسل کا سانپ ہے، اس کے بارے میں جانتے ہو؟'' اس نے سر کچلے سانپ کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا، نگاہیں مسلسل مایا کے چہرے پہ تھیں۔

''یہ دلہوزی اور شملہ میں پائے جانے والے خاص نسل کے سانپ ہوتے ہیں، اصل نام مجھے یاد نہیں، مگر ان کے بارے میں ایک صدیوں پرانا لیجنڈ مشہور ہے کہ یہ مہارانیوں اور مہاراجوں کو نہیں ڈستے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں بیلی راجپوتاں کی مہارانی ہوں، یہ مجھے نہیں ڈس سکتا تھا۔'' وہ فخر سے مسکراتے ہوئے ہاتھ جھاڑتی اٹھنے لگی۔

''چلتی ہوں۔''

''نہیں رکو۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر مایا کو روکنا چاہا، مگر وہ کھڑی ہو رہی تھی، اس کے ہاتھ میں موتیوں کی لڑی آ گئی۔ مایا اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

''میرا شوہر میرا انتظار کر رہا ہوگا، مجھے جانا ہے۔'' اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

''میری جان بچانے کا شکریہ۔'' لڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی، وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوب رہا تھا۔

'مگر مجھے روک کر تم میری جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے جیسے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ زخمی نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے...... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

''مجبوری ہے، مگر......'' مایا نے اس کا ہاتھ لڑی سے ہٹایا اور پھر جہاں اس شخص نے ہاتھ رکھا تھا، وہاں سے اس نے کھینچ کر ایک جھٹکے سے لڑی کو توڑ دیا۔ چمکتے دمکتے موتی نیچے گرنے لگے۔

جب چند موتی گر گئے تو اس نے وہاں پھر سے گرہ لگا دی۔ وہ نیم غنودگی اور نقاہت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جن پہ تم نے ہاتھ رکھا، وہ تمہارے ہوئے۔ یہ شاہی خاندانوں کا دستور ہوتا ہے۔'' مٹی میں گرے وہ سارے موتی اس نے مٹھی بھر کر اٹھائے، بہت سی مٹی بھی ان کے ساتھ اس کے ہاتھ

میں بھر گئی۔ ریت مٹی میں لتھڑے موتی اس نے اس شخص کی جیب میں ڈال دیے اور ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے جنگلوں میں بھٹک کر لوگوں کی جان بچانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے، نہ ہی مجھے تم سے کوئی ہمدردی ہے۔ مجھے دلہوزی کا ڈوبتا سورج دیکھنا تھا، جس کے لئے قدرت نے یہ بہانا بنا دیا۔ ہاں اوپر جا کر کسی کو نیچے بھیج دوں گی، اگر یاد رہا تو۔'' وہ اسی بے نیازی سے کہہ کر مڑی اور واپس اوپر چڑھنے لگی۔

''سنو'' اس نے پیچھے سے پکارا۔

مایا جیسے بادل نخواستہ رکی۔

''تم کون ہو؟'' غنودگی میں ڈوبنے سے پہلے وہ بمشکل بول پا رہا تھا۔

درخت کی لکڑی پہ ہاتھ رکھے، مایا نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔'' میں بیلی راجپوتاں کی ملکہ ہوں اور کچھ نہیں۔'' اس کی سنہری آنکھوں میں ڈوبتے سورج کا عکس جھلملا رہا تھا۔

وہ ابھی تک ایسے ہی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ویسے..... تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے غنودگی میں جانے سے قبل بس آخری دفعہ لب کھولے۔

''بدر..... بدر غازان۔'' اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

مایا نے لاپروائی سے شانے اچکائے اور اپنے جوگرز کی مدد سے واپس اوپر چڑھنے لگی۔

بے دھیانی میں پھر سے اس کی انگلیوں نے پیانو کی کیز کو چھیڑا تھا۔ خاموش فضا میں پھر سے راگ گونج اٹھا، وہ جیسے چونک کر حال میں واپس آئی۔

قدآور آئینے میں اس کا عکس اب بھی وہیں تھا، جیسے کوئی خوب صورت تصویر ہمیشہ کیلئے امر کر دی گئی ہو۔

اس نے سر جھٹکا، ساڑھی کا پلو درست کیا اور اسی پُرتمکنت انداز میں گردن اونچی اٹھائے باہر چلی آئی۔

برآمدے میں کرسیاں میز کے گرد بچھی تھیں، وہاں ٹھاکر رگھوناتھ اور گوپال بیٹھے تھے۔ مایا کو

آتا دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''آئیے مایا دیوی!''

وہ اسی سپاٹ چہرے کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کرسی پہ بیٹھ گئی۔'' چائے لیجئے۔'' گوپال نے ایک پیالی اس کے سامنے کی۔ یہ وہ واحد عورت تھی جس کے لئے گوپال یہ سب کر سکتا تھا۔

''شکریہ۔'' مایا نے پیالی اٹھالی۔

''مایا دیوی! آپ نے جائیداد بکوانے کی بات کی تھی۔'' ٹھاکر رگھوناتھ نے گلا کھنکار کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کا کپ ان کے سامنے ان چھوا رکھا تھا۔ ''میں نے ایک دو فریقوں سے بات کی ہے، اس میں کچھ عرصہ لگ جائے گا۔''

وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی، گرم چائے کے گھونٹ حلق میں اتارتی رہی۔

''نہر والی زمین خریدنے میں دو فریق دلچسپی رکھتے ہیں، میں ابھی ان سے معاملات طے کر رہا ہوں۔ کاغذات وغیرہ بھی تیار ہو رہے ہیں، پٹواری سے بھی بات کر لی ہے۔''

اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب وہ بہت توجہ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کچھ عدالتی کارروائی مزید ہوگی، جس کے لئے آپ کو واپس برطانیہ جانے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے، مگر میری کوشش ہوگی کہ زیادہ تاخیر نہ ہو اور جیسے آپ چاہتی ہیں، ویسے ہی ہو۔ باقی جب تک آپ کی مرضی آپ حویلی میں رہیں، گاؤں میں گھومیں پھریں، زمین کے معاملات میں خود دیکھ لوں گا، آپ کو محض دستخط کرنے ہوں گے، کیا خیال ہے آپ کا؟''

''یہ بیلی راجپوتاں کے بھوت کا کیا قصہ ہے؟''

سوال ان دونوں کی توقع کے اس قدر برعکس تھا کہ ٹھاکر رگھوناتھ نے حیرت سے دیکھا۔

''بیلی راجپوتاں کا بھوت؟'' وہ کیا پوچھ رہے تھے اور وہ کیا پوچھ رہی تھی۔

''جی! بیلی راجپوتاں کا وہ بھوت، جو روز رات کو مسلمانوں کے پرانے قبرستان میں گھومتا پھرتا ہے۔''

''مسلمانوں کے پرانے قبرستان پہ سایہ ہے جی!'' گوپال، ٹھاکر صاحب سے پہلے ہی بول اٹھا۔ کوئی بھٹکتی ہوئی آتما ہے، کافی عرصے سے رات کو گاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ اب تو گاؤں

والوں نے اس طرف جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''مگر میں نے سنا ہے کہ بدر غازان کہتا ہے، وہ کوئی کریمنل ہے، جو اپنے کسی جرم کا ثبوت مٹانے کیلئے بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔''

''بدر غازان تو خود بھی......'' کوئی موٹی گالی اس کے لبوں تک آتے آتے رکی، شاید اسے مایا کی وہاں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔''وہ سایہ ہے جی، آپ مسلموں کی باتوں پہ مت جائیں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ وہ سایہ ہے۔''

''انٹرسٹنگ۔'' مایا گردن موڑ کر باغیچے کو دیکھنے لگی۔

''بہار کا موسم آ ہی گیا ہے۔ آپ کے بیلی راجپوتاں میں پھول بہت پیارے لگتے ہیں۔'' وہ دلچسپی سے پھولوں کو سراہتی کہہ رہی تھی۔ جائیداد کے معاملات اس کی معمولی سی توجہ کے بھی حامل نہیں تھے۔

ٹھاکر رگوناتھ گہری سانس بھر کر پیچھے کو ہو گئے، کبھی کبھی مایا فرینڈس انہیں اسی طرح بہت بے عزت کر دیا کرتی تھی۔

* * *

''بال بنادوں مہارانی جی؟'' روپا اسے بالکونی میں دیکھ کراس طرف آ گئی۔

وہ بالکونی میں کرسی ڈالے کتاب پڑھ رہی تھی۔ رُخ سامنے کو تھا، جہاں سنہری گندم کی تیار فصل کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

روپا کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ وہ ہاتھ میں کنگھا لئے منتظر کھڑی تھی۔ ''ہاں، چوٹی بنا دو۔'' اس نے نگاہیں کتاب پہ جھکا دیں اور ایک ہاتھ سے ڈھیلے سے جوڑے کی گرہ کھول دی۔ سارے بال کسی آبشار کی طرح کمر پہ گرتے چلے گئے۔

روپا بہت نرمی سے اس کے سنہری بال سمیٹنے لگی۔ مایا پھر سے کتاب میں منہمک ہو گئی تھی۔

''کل سویرے بڑے میدان میں ہمارا میلہ لگ رہا ہے۔'' اس کے بال اکٹھے کرتے روپا کو اچانک جیسے یاد آیا۔

''اچھا۔'' وہ کتاب پڑھتی رہی۔

''نیزہ بازی کا مقابلہ بھی ہوگا۔''

''ہوں۔'' اس نے صفحہ پلٹایا۔

''پورے گاؤں کو اس مقابلہ کا انتظار ہے سال بھر سے۔ بڑا کانٹے دار مقابلہ ہو گا جی! اس دفعہ۔'' روپا اس کے بالوں میں کنگھا اوپر سے نیچے لا رہی تھی۔ اس دفعہ مایا نے جواب بھی نہیں دیا۔

''چھوٹے ٹھاکر گوپال راج بھی حصہ لے رہے ہیں، اب تو اس مقابلے کی ہار جیت پہ بڑی بڑی شرطیں لگ چکی ہیں۔'' وہ اب چوٹی گوندھ رہی تھی۔

''گوپال کی جیت پہ؟'' غیر دلچسپی سے محض روپا کا دل رکھنے کو مایا نے پوچھا۔

''نہیں دیوی جی! بدر غازان کی جیت پہ، گوپال تو اس سے پچھلے چار برس سے ہار رہے ہیں۔''

وہ کتاب بند کر کے ایک جھٹکے سے مڑی، چوٹی روپا کے ہاتھ سے پھسل گئی، سارے بل کھلتے چلے گئے۔

''بدر غازان گوپال کو ہراتا ہے؟'' بے اختیار وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاں جی، پچھلے چار برسوں سے، چھوٹے ٹھاکر کو بہت غصہ ہے اس بات کا، اس دفعہ انہوں نے پوری تیاری کی ہے، بھری پنچائیت میں دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس دفعہ وہ بدر غازان کو ایسی شکست دیں گے کہ اس کی اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔''

''پھر......؟''

''پھر بدر نے ایک محفل میں کہا، اس دفعہ جو شکست ٹھاکر گوپال رام کو ملے گی، اس کی اگلی کیا، پچھلی بھی سات نسلوں کو خبر مل جائے گی۔'' روپا کہہ کر کھلکھلائی، پھر ایک دم سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔

''میں جانتی ہوں تمہاری ہمدردی زہرہ کے چچازاد کے ساتھ ہے، اچھی بات ہے، میں یہ مقابلہ دیکھنا چاہوں گی، کب ہے؟''

''کل سویرے۔'' روپا شہ پا کر جوش سے اسے تفصیلات بتا رہی تھی، مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں ڈوبی کھڑی رہی۔

* * *

گاؤں کے بڑے میدان میں رنگ و بو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ روایتی انداز میں سجا میلہ اور خوشی اور جوش چہروں پہ لیے سجے سنورے دیہاتی ... وہ واقعی ان کا سب سے حسین تہوار تھا۔

مایا روپ وتی کے ساتھ بصد اصرار مقابلہ دیکھنے آ ہی گئی تھی۔

''یہ نیزہ بازی کیا ہوتی ہے روپا؟'' وہ مقابلے میں دلچسپی لیے بغیر ساتھ موجود روپ وتی سے پوچھنے لگی۔

''وہ جی... '' روپا ہچکچائی۔ ''وہ دیکھیں نا، ابھی آپ کو خود ہی سمجھ آ جائے گا۔''

اور اسی پل ایک طرف سے الہڑ سی زہرہ نکل کر ان کے قریب آئی۔

"مس کرائن، آپ بھی آئی ہیں مقابلہ دیکھنے؟" وہ اسے دیکھ کر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

مایا نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔

اس نے آج بھی بے داغ اجلی سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آنکھوں کے گرد بہت گہرا کاجل ڈالا تھا، جیسے کالی رات میں چمکتا سورج۔

"بڑا کانٹے دار مقابلہ ہوگا جی آج۔" بڑے سے میدان میں بھاگتے گھوڑوں کو دیکھ کر زہرہ کہہ رہی تھی۔ آج تو اس کے چہرے پر اور ہی رنگ بکھرے تھے۔

مایا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوڑے بھگاتے، نیزوں سے میخیں اکھاڑتے گھڑ سواروں کو دیکھا اور پھر گہری سانس بھری۔

"یہ تو Tent pegging ہے۔"

روپا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "آپ کو اس کھیل کا علم ہے جی؟"

"ہاں، مگر میری نینی نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ Tent pegging نیزہ بازی کو کہتے ہیں۔"

سامنے دو گھوڑے، ایک سفید اور ایک سیاہ، بھاگتے آرہے تھے۔ سیاہ گھوڑا گوپال راج کا تھا، وہ پہچان گئی تھی۔

"نیزہ بازی کا اوریجن مسلم فوجوں کی شب خون کی ٹیکنیک تھی۔" جب وہ موڈ میں ہوتی تو بہت بولا کرتی تھی۔ "اس کھیل میں تو صرف میخیں گاڑی جاتی ہیں، پورے پورے خیمے نہیں لگائے جاتے، مگر در حقیقت 'شب خون' میں مسلمان فوجیں رات کو دشمن کے سو جانے پہ اپنے تیز ترین گھڑ سوار دشمن کی کمین گاہ میں بھیجا کرتی تھیں، جو اپنے نیزوں کی مدد سے ان کے خیموں کے میخیں اکھاڑ دیتے تھے، پھر خیموں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دی جاتی تھی اور سویا ہوا دشمن......"

بولتے بولتے وہ رک گئی۔ گوپال کے ساتھ والا سفید گھوڑا ابھی اس کے سامنے سے گزر کر گیا تھا۔ یہ چہرہ اسے ڈلہوزی کے جنگل میں ٹرازخمی یاد آیا۔ "یہ سفید گھوڑے پہ کون ہے؟"

"بدر ہے، میرے چچا کا بیٹا۔" زہرہ بہت مسرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

مایا کی نگاہیں دور تک سفید گھوڑے کے پیچھے گئی تھیں، گھڑ سوار بہت مہارت سے اسے دوڑاتا اب میخیں اکھاڑتا جا رہا تھا۔

پھر جب نیزہ بازی کا مقابلہ ختم ہو گیا اور پانچویں برس بھی ٹھاکروں کے لڑکے کو مسلمانوں کے لڑکے نے شکست دے دی اور تالیوں اور نعروں کا شور قدرے تھما تو کتنی ہی دیر بعد اس نے سفید گھوڑے کی لگام تھامے اس اونچے لمبے مغرور دکھنے والے نیزہ باز کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ شاید زہرہ کو دیکھ کر ادھر آ گیا تھا۔

ان کے قریب آتے ہی اس کے قدم سست پڑ گئے، وہ حیرت زدہ سا مایا کو دیکھ رہا تھا، پھر گھوڑے کی لگام تھامے آہستہ آہستہ چلتا ان تک آیا۔

''آپ؟'' مغرور تنے ہوئے نقوش دھیمے پڑ گئے تھے، وہ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم سانپ کے کاٹے سے بچ گئے؟'' مایا مسکرائی، ہنی محظوظ سی مسکراہٹ۔

بہت چپکے سے دلہوزی کی ڈوبتی شام دونوں کے آس پاس اتر آئی تھی۔

''آپ......ادھر؟''

''تم نے مجھے پہچان لیا؟'' وہ اس کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''میں بیلی راجپوتاں کی ملکہ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' وہ دھیما سا مسکرایا۔ شاید روپا ٹھیک کہتی تھی، وہ گاؤں کا سب سے وجیہہ مرد تھا۔

''بھولنا بھی نہیں چاہئے تھا۔''

''مگر آپ...... ادھر؟'' وہ چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس میں واحد گوری لڑکی ٹھاکر شیکھر راج کی بیوہ تھی، بظاہر وہ جیسے کڑیاں ملا رہا تھا۔ ''آپ شیکھر کی......''

''ہاں، میں مایا فرنینڈس ہوں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔''

''شیکھر راج اچھا آدمی تھا، گاؤں کے ساتھ مخلص تھا، اس کی موت کا افسوس ہوا۔'' اس نے مایا کا آخری فقرہ نظر انداز کیا تھا۔

''شکریہ، مگر کیا دوسرے ٹھاکر مخلص نہیں جو تم نے آج گوپال کو پانچویں دفعہ ہرایا ہے؟''

''شکریہ۔'' وہ بس ہنس دیا، پھر سفید گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہ ایک وفادار جانور ہے، اس نے بہت وفا نبھائی ہے میرے ساتھ۔''

''کبھی راجپوتوں کی حویلی آؤ، میں تمہیں گوپال کے ایسے تین گھوڑے دکھاؤں گی۔''

''آپ کبھی ملکوں کی حویلی آیئے، میں آپ کو اپنا پورا اصطبل دکھاؤں گا۔''

وہ ہنس دی۔''ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟''

''آپ کی خادمہ آپ کو لے آئے گی۔''

''مگر میں نے تو نہیں کہا کہ میں آؤں گی۔''

بدر بے ساختہ مسکرا دیا۔''آپ کوشش کیجئے گا، میں انتظار کروں گا۔''

''تم انتظار کرنا، مگر میں نہ وعدہ کرتی ہوں، نہ کوشش کروں گی۔''اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر وہ جانے کیلئے پلٹی۔''چلو روپا۔''

''سنئے۔''

مایا نے مڑے بغیر، محض گردن ترچھی کر کے عقب میں دیکھا۔

''میں انتظار کروں گا۔''

''ضرور کرنا۔'' واپس جاتے ہوئے اس نے ایک نظر زہرہ کے تاریک پڑتے چہرے کو دیکھا، جو کتنی ہی دیر سے خاموش کھڑی تھی۔ آج پہلی دفعہ بدر نے گاؤں کی سب سے سندر لڑکی کو یوں نظر انداز کیا تھا۔

مایا اثر لیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ روپ وتی اس کے پیچھے تھی۔

وہ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھامے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

ڈلہوزی کی ڈوبتی شام کا فسوں ابھی تک باقی تھا۔

* * *

چوہدری منگل سنگھ کا تعلق گاؤں کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ وہ ذات کے راجپوت تھے، مگر امارت کے لحاظ سے ٹھاکروں سے کہیں کم۔ بہرحال گاؤں کے متوسط طبقے کے زمینداروں میں چوہدری منگل سنگھ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

منگل سنگھ کا پچھلے آٹھ ماہ سے ایک سکھ زمیندار سے جائیداد کا تنازع چل رہا تھا۔ یہ تنازع بیری کے ایک درخت کی ملکیت سے شروع ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے جانی دشمنی تک پہنچ گیا تھا۔ اس درخت کے دوسرے دعوے دار شوبھا سنگھ نے جس کی زمین منگل سنگھ کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھی، بھری پنچائیت میں منگل سنگھ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔

1939ء میں انگریز کے قانون کی عملداری کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ پے در پے سیاسی محاذوں پہ شکست کھا کر سرکار خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ ڈکیتی اور قتل کی وارداتیں عام سی بات بنتی جا رہی تھیں۔ ایک مہینے میں جائیداد کے تنازع پہ دو، چار قتل ہو جاتا تو اب معمول بن چکا تھا۔

اس رات شوبھا سنگھ کا ارادہ اسی معمول کو دہرانے کا تھا۔ معاملہ اب بیری کے درخت کا نہیں رہا تھا۔ شوبھا سنگھ نے سنا تھا کہ منگل سنگھ یار دوستوں میں بیٹھ کر کہتا ہے کہ "اگر شوبھا سنگھ نے درخت والی جگہ میرے حوالے نہ کی تو میں اس کی بہن کو اٹھا لوں گا۔"

شوبھا سنگھ کی بہن نرملا جوان، خوب صورت عورت تھی۔ جب بات نرملا پہ آئی تو شوبھا سنگھ کی غیرت نے جوش مارا اور اس نے بھری پنچائیت میں دعویٰ کیا کہ اگر منگل سنگھ باز نہ آیا تو وہ اس کا خون کر دے گا۔

مگر منگل سنگھ باز نہ آیا اور اس رات شوبھا سنگھ نہر کے کنارے گھات لگا کر منگل سنگھ کی تاک میں بیٹھ گیا۔ اسے علم تھا کہ منگل سنگھ آج اپنے بھائی کے گھر ہے اور وہاں محفل جمی ہو گی، جسے چھوڑ کر وہ رات گئے گھر واپس لوٹے گا۔ اسے ٹھکانے لگانے کا یہ وقت بہترین تھا۔

رات گہری ہو گئی تو منگل سنگھ اپنے بھائی کے گھر سے نکلا۔

پورا گاؤں خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ گھروں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں اور گاؤں کے مکین بستروں میں دبکے بے خبر سو رہے تھے۔

منگل سنگھ کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستے میں کھیت پڑتے تھے اور آگے نہر تھی۔ نہر کے ایک طرف کچا راستہ تھا جو پرانے قبرستان سے ہو کر دوسرے گاؤں جاتا تھا، جبکہ دوسری جانب منگل سنگھ کے گھر کا راستہ تھا۔

وہ خاموشی سے کھیتوں کے درمیان بنی کچی پگڈنڈی پہ چل رہا تھا۔ سامنے نہر تھی اور اس طرف کچا راستہ جس کے ساتھ ساتھ درختوں کی باڑ لگی تھی۔

چلتے چلتے یونہی منگل سنگھ نے سر اٹھایا تو ایک دم اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ وہیں اپنے قدموں پہ رک گیا۔

درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ کوئی دبے قدموں کچے راستے پہ چل رہا تھا۔ منگل سنگھ شاید کبھی توجہ نہ دیتا مگر اس شخص کا رخ پرانے قبرستان کی جانب تھا۔ اگر وہ کوئی دوسرے گاؤں جانے

والا مسافر ہوتا تو اسے کسی سواری یا گھوڑے وغیرہ پہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ پیدل چل رہا تھا۔

"رات کے اس پہر کوئی شخص کیوں پرانے قبرستان جائے گا؟"

اس کے ذہن میں گاؤں والوں کی باتیں گونجنے لگیں۔

بیلی راجپوتاں کا بھوت۔

ایک چغہ پوش جو رات کو پرانے قبرستان کے آس پاس منڈلاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے اور روز رات کو کسی قبر کو پھاڑ کر نکلتی ہے اور پھر صبح ہونے سے قبل دوبارہ کوئی قبر کھود کر اندر خود کو دفن کر لیتی ہے۔ قبرستان میں کھدائی کے آثار تھے، جس سے لوگوں نے شروع شروع میں یہی قیاس ظاہر کیا اور جیسے جیسے بات پھیلی گاؤں والوں نے رات تو کیا دن میں بھی ادھر جانا چھوڑ دیا۔

وہ چغہ پوش کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا اور پرانے قبرستان میں وہ روز رات کو کیا کرتا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

چوہدری منگل سنگھ کے ذہن میں انسان کا فطری تجسس بیدار ہوا۔ گھر جانے کا ارادہ ترک کر کے کچے راستے کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات چاند نہیں نکلا تھا، تاروں کی روشنی میں منگل سنگھ کو وہ سیاہ ہیولہ سا نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے بیچ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

سایہ درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتے احتیاط سے چل رہا تھا۔ منگل سنگھ دبے قدموں اس کے پیچھے چل دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا تعاقب بھی اسی طرح کچھ فاصلے سے ہو رہا ہے۔

تاریک سایہ پرانے قبرستان کے قریب جا کر رکا، اِدھر اُدھر دیکھا اور لکڑی کا پھاٹک دھکیلا۔ وہ بھاری چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

سایہ اندر داخل ہو گیا۔ شاید ابھی تک وہ اپنے تعاقب میں آتے منگل سنگھ سے بے خبر تھا۔

منگل سنگھ پھاٹک کے اس طرف کھڑا چند لمحے سوچتا رہا۔

قبرستان میں اس وقت ہُو کا عالم تھا۔ دور دور تک پھیلی قبریں اور فطری خوف، ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کے دل نے کہا کہ لعنت بھیجو اس پہ اور بھاگ چلو۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جی کڑا کر

اس چغہ پوش کو بے نقاب کرنے کا تہیہ کر لیا۔ دور سے اس کو ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکتا تھا، مگر ایک بات کا اسے چند منٹوں میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ سایہ کوئی انسان تھا، بھوت نہیں۔

سایہ اب برگد کے گھنے بوڑھے درخت کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کدال تھی اور اس کا ارادہ زمین کھودنے کا تھا۔

منگل سنگھ نے خود کو تسلی دی، واہ گرو کا نام لیا اور قبرستان میں قدم رکھ دیئے۔

سایہ اب زمین پہ جھکا، لکیر کھینچ رہا تھا۔ اس کا سیاہ چغہ کافی کھلا سا تھا اور اس میں اس کی جسامت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سر پہ چغے کی ٹوپی تھی اور اس کی منگل سنگھ کی جانب کمر تھی۔

منگل سنگھ آہستہ آہستہ چلتا چغہ پوش کے سر پہ پہنچ گیا۔ آہٹ تھی یا کوئی اور احساس چغہ پوش نے بوکھلا کر پیچھے دیکھا۔

ٹوپی اس کے سر پہ تھی اور تاروں کی روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ منگل سنگھ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

چغہ پوش نے ایک دم کدال چھوڑ دی اور بھاگ کر درخت کی اوٹ لی۔ ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کو اس حرکت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ وہ بمشکل ہی اس شاک سے نکل پا رہا تھا کہ ایک دم وہ سایہ یوں غائب بھی ہو گیا تھا۔ منگل سنگھ بے اختیار درخت کی جانب لپکا، مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ پاتا، کسی نے پیچھے سے کرپان کا وار کیا۔

پے در پے چند وار کر کے حملہ آور باہر کو بھاگ گیا، یہ یقینی تھا کہ حملہ آور نے وہ ''بھوت'' نہیں دیکھا تھا۔

دبے قدموں وہ سایہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور قریب آ کر منگل سنگھ کا چہرہ دیکھا۔ وہ چند منٹ کا مہمان تھا، یہ اس کی حالت سے ظاہر تھا۔

''معاف کرنا مجھے تمہاری موت کا افسوس ہوا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بچانے آ جائے تو اسے کہنا کہ آئندہ جو بیلی راجپوتاں کے بھوت کا پیچھا کرے گا، اس کا انجام یہی ہو گا۔''

چند لمحے بعد سایہ کچے راستے پہ گم ہو چکا تھا۔ منگل سنگھ ابھی تک پڑا کراہ رہا تھا۔

* * *

''مایا دیوی..... مایا دیوی۔'' روپ وتی بھاگتی ہوئی بدحواس سی اس کے کمرے تک آئی۔

وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بالوں کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ شاید گاؤں میں مایا کے پاس کرنے کو اور کوئی کام نہیں تھا۔

''کیا ہو گیا روپا؟'' چوٹی کے بل ڈالتے ہوئے اس نے تنقیدی نگاہوں سے خود کو آئینے میں دیکھا۔

''مایا دیوی......وہ......'' بھاگنے کے باعث روپ وتی کی سانس چڑھ گئی تھی۔ ''وہ چوہدری ہری سنگھ کا بیٹا......وہ......''

''وہ کیا......؟'' اس نے ہاتھ بالوں میں روک کر گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''وہ چوہدری ہری سنگھ کے بیٹے کو بھوت نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش پرانے قبرستان سے ملی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بھوت نے قتل کر دیا؟ مگر کب، کیسے؟'' وہ حیران پریشان سی کھڑی تھی۔

''رات کو کسی وقت جی۔''

''مائی گڈنیس۔'' وہ حیرت سے کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ ''اٹس ٹیریبل۔ میں تو سمجھی تھی، وہ کوئی چور اچکا ہو گا، مگر......''

''وہ بھٹکی ہوئی آتما ہے جی! اب تو آ گیا نا آپ کو یقین؟''

''مگر روپا، قتل کیسے ہوا ہے؟ کیا گولی ماری ہے؟''

''پتا نہیں جی، پولیس کا کہنا ہے کہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا ہے۔ ابھی لاش کا وہ نہیں ہوا۔'' وہ جیسے لفظ یاد کرنے لگی۔

''پوسٹ مارٹم؟'' مایا نے فوراً کہا۔ روپ وتی سر ہلانے لگی۔

''مگر اس کا کیا ثبوت ہے یا تم لوگ کیسے یہ کہہ رہے ہو کہ قتل بھوت نے ہی کیا ہے؟''

''بدر غازان نے خود سنا ہے، مرتے سمے چوہدری منگل سنگھ نے بھوت کا ہی ذکر کیا ہے۔''

''بدر غازان؟'' وہ بری طرح چونکی۔

''جی، ملکوں کا بیٹا، بدر غازان۔''

''وہ ادھر کیا کر رہا تھا؟'' وہ تیزی سے بولی۔

"وہ ساتھ والے گاؤں سے واپس آ رہا تھا، اپنے گھوڑے پہ، پرانے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے منگل سنگھ کی چیخوں کی آواز سنی۔ وہ پہنچا تو منگل سنگھ کا آخری سانس تھا۔"

"اور آخری سانس میں منگل سنگھ نے پورے صفحے کا بیان بھی دے دیا؟"

"پتا نہیں جی، میں نے تو منشی کرم دین سے سنا ہے کہ منگل سنگھ نے بدر غازان کو بھوت کا بتایا ہے، بدر کسی سے ذکر کر رہا تھا۔"

مایا شش و پنج میں مبتلا کھڑی اسے دیکھتے رہی، پھر سر جھٹک کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"عجیب سی بات ہے۔ آدھی رات کو قبرستان میں قتل ہو جاتا ہے، جو بقول تم لوگوں کے، کوئی سو کالڈ بھوت کرتا ہے اور پھر اتنا اتفاق کہ عین موقع پہ بدر غازان پہنچ جاتا ہے اور مقتول سے نزعی بیان بھی لے لیتا ہے۔" وہ مشکوک سی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اونہوں، کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔"

"کیا غلط ہے مہارانی جی! مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا۔"

"سوال یہ ہے روپا کہ اتنی رات کو بدر غازان قبرستان میں کیا کر رہا تھا؟"

"چھوٹا ملک دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔" روپ وتی نے دہرایا۔

"پتا نہیں روپا! مگر بار بار میرے ذہن میں ایک شک سا ابھر رہا ہے۔" وہ کھڑکی کے باہر نگاہیں جمائے سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بند شیشے کے اس پار گاؤں کی زندگی رواں دواں تھی۔

"کیسا شک مایا دیوی؟"

"کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔ یہ بدر غازان مجھے کچھ۔" پھر گردن پھیر کر اسے دیکھا اور کہتے کہتے رک گئی۔ "کچھ نہیں تم جاؤ۔"

اور روپ وتی اس کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی الٹے قدموں واپس مڑی۔

"سنو۔"

روپا جاتے جاتے پلٹی۔

"جی، مہارانی جی؟"

''ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟''

''قریب ہی ہے جی، کھیتوں سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔''

''اچھا...... ٹھیک...... چلنا پھر میرے ساتھ۔''

''ابھی......؟'' روپا حیران ہوئی۔

''اونہوں۔'' وہ پھر سے کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔

''کچھ دن تک چلیں گے۔'' روپ وتی سر جھکائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے مایا کی دھیمی بڑبڑاہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''میں بھی دیکھتی ہوں، آخر کون سور ما ہے، جو بھوت بن کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔'' روپ وتی نے دروازہ بند کر دیا۔

* * *

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اجے!'' اس کا کھانا برتنوں میں نکالتے ہوئے روپ وتی غمگین سی بولی۔ اس کی آواز میں کسی حسین خواب کے ٹوٹنے کا غم تھا۔ اجے نے برتن اپنی طرف کرتے کرتے رک کر اسے دیکھا۔ وہ کنفیوزڈ سی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

''کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' اجے شاید کھانا کھانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ روپا پریشان ہو، اس سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا۔ وہ کئی برس سے روپ وتی کے ہمراہ حویلی میں ملازم تھا اور اس کی فطرت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ آج بہت غمزدہ لگ رہی تھی۔

''ایک بات تو بتاؤ'' اس نے جیسے اجے کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ ''تمہیں کس نے کہا کہ بدر بابو نے منگل سنگھ کے منہ سے بھوت کا ذکر سنا ہے۔''

''منشی کرم دین سے۔''

''تمہیں منشی کرم دین کی بات پہ کتنا اعتبار ہے؟''

''وہ راست گو انسان ہے، میں اسے عرصے سے جانتا ہوں مگر......''

''کیا منشی کرم دین کو بدر غازان نے خود یہ بات بتائی ہے؟''

''نہیں، وہ کسی سے کہہ رہا تھا، منشی نے سنا ہے۔''

''کیا منشی جھوٹ نہیں بول سکتا ہے؟''

''منشی کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' روپا کے سوال اب اجے کو پریشان کر رہے تھے۔

''مگر ہوسکتا ہے بدر غازان نے مرتے سے منگل سنگھ سے بات ہی نہ کی ہو۔''

''اس نے خود تھانے دار کو بتایا ہے کہ اس نے منگل سنگھ کے منہ سے کیا سنا ہے؟''

''کس نے؟''

''چھوٹے ملک نے۔'' روپا ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

''چھوٹے ملک نے خود یہ بیان دیا ہے، تھانے دار کو اجے؟''

''ہاں روپا، مگر ہوا کیا ہے؟''

''سوال یہ ہے کہ اجے کہ چھوٹا ملک اس وقت قبرستان میں کیا کر رہا تھا؟''

''مگر تم سے یہ سوال کس نے کیا ہے؟''

''کسی نے بھی کیا ہو، کچھ گڑبڑ تو ہے نا اجے۔''

''کیا گڑبڑ ہے اس میں۔ چھوٹا ملک سفر سے لوٹا تھا، دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔'' روپ وتی نفی میں سر ہلاتی، گردن جھکائے برتن سمیٹنے لگی۔

''بس اجے! یہ بدر غازان اتنا اچھا آدمی ہے نہیں، جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔'' اس کی آواز میں دکھ بھرا تھا۔

''وہ اچھا آدمی ہے روپا! تم راجپوتوں کی باتوں میں نہ آؤ۔''

''پر مایا دیوی راجپوت نہیں ہیں۔'' وہ بے اختیار بولی۔

''تو یہ سب تم سے مایا دیوی نے کہا ہے؟''

''وہ کہنا نہیں چاہتی تھیں، سو انہوں نے بات لبوں پہ روک لی۔''

''لیکن مایا دیوی ایسی بات کیوں کریں گی؟'' اجے سوچ میں پڑ گیا۔

''کوئی تو بات ہوگی اجے!''

''چھوڑو روپا، مایا دیوی کو گاؤں کے لوگوں کا کیا پتا۔ انہیں تو باہر دو قدم تک جانے کے لئے تمہارا سہارا چاہیے ہوتا ہے، انہیں حویلی سے باہر گاؤں کے رستے تک تو پتا نہیں، یہاں کے معاملوں کا کیا پتا ہوگا۔''

مگر روپا مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''کچھ تو ہے اجے!'' پھر سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گی۔

* * *

''بدر غازان سے ملنا ہے۔'' بس اسے اتنا کہنا پڑا اور ملکوں کے ملازم پورے پروٹوکول سے اسے اور روپا کو مہمان خانے میں لے آئے۔ یقیناً بدر نے ٹھاکر شیکھر کی بیوہ کے لئے کوئی خصوصی ہدایت دے رکھی تھی۔

ملکوں کی حویلی مایا کی توقع سے بڑھ کر عالی شان اور خوب صورتی سے آراستہ تھی۔ اس کی آرائش وزیبائش میں جدید انگریزی طرز کی جھلک تھی۔ شاید اس لئے کہ بدر غازان انگلستان سے پڑھ کر آیا تھا اور اس نے ایک دیہی حویلی کو دہلی کے کسی انگریز اعلیٰ افسر کے بنگلے کی طرز پہ راستہ کر لیا تھا۔

''آپ اندر تشریف رکھئے، چھوٹے ملک ابھی آتے ہیں۔''

''وہ ہیں کدھر؟'' مایا نے واپس مڑتی ملازمہ کو روک دیا۔

''اپنے اصطبل میں، ان کا گھوڑا بیمار ہے، امرتسر سے ایک ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ ابھی اسی کے ساتھ ہیں۔''

''روپا! تم یہیں ٹھہرو، میں وہیں چلی جاتی ہوں۔''

وہ ملازمہ کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر باہر نکل آئی۔ اصطبل حویلی کی پچھلی طرف تھا، اسے اچھا خاصا چلنا پڑا تھا۔

ملازمہ اسے اصطبل کے احاطے کے آغاز پر چھوڑ کر چلی گئی۔

اصطبل خاصا وسیع تھا۔ تین اطراف میں گھوڑے قطاروں میں بندھے تھے۔ وہ چوکھٹ پہ کھڑی سامنے دیکھنے لگی، جہاں بدر مخالف سمت سے ایک ملازم کے ہمراہ چلتا آ رہا تھا۔

شاید وہ ابھی ابھی گھوڑے کا معائنہ کر کے ہٹا تھا۔ آستینیں فولڈ کر کے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور مسلسل قدرے برہمی سے ملازم کو کچھ کہہ رہا تھا۔ تب ہی اچانک...... اس کی نگاہ چوکھٹ میں پاؤں تک آتا لمبا سا سفید فراک پہنے اس لڑکی پر پڑی۔ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ چہرے پہ خوش گوار حیرت اتر آئی تھی۔

ملازم کو جانے کا کہہ کر وہ ہاتھ جھاڑتا اس کی طرف آیا۔

''آپ......؟'' وہ ابھی تک حیران تھا۔

''ہاں، میں!'' وہ کہہ کر بے نیازی سے اِدھر اُدھر بندھے گھوڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے فراک کی آستینیں کافی چھوٹی تھیں اور دودھیا سنہری بازو دھوپ میں مزید سنہری لگ رہے تھے۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں۔''

''مگر میں تو اصطبل دیکھنے آئی ہوں۔'' وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ مایا کی برجستگی اسے محظوظ کرتی تھی۔

''تو پھر میں آپ کو اصطبل دکھاتا ہوں۔ انہیں دیکھ کر راجپوتوں کے گھوڑے بھول جائیں گی آپ۔''

''بہت لگتی ہے تمہاری راجپوتوں کے ساتھ؟'' وہ دونوں باڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

''معذرت کے ساتھ، مگر ٹھاکر رگھوناتھ کا خاندان اس گاؤں کے ماتھے پہ بہت بڑا کلنک ہے۔''

''مگر میں نے تو گاؤں میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔''

''آپ نے ابھی گاؤں دیکھا ہی کہاں ہے؟'' وہ مسکرا کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ وہ شانے اچکا کر آگے بڑھ گئی۔

بدر وہیں کھڑا رخ پھیرے اسے دیکھنے لگا۔

''تمہارے اور ٹھاکروں کے درمیان جھگڑے کی وجہ کیا ہے؟'' وہ جھک کر ایک گھوڑے کی پیشانی پہ نرمی سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''وہ ہندو ہیں مایا دیوی اور ہم مسلمان۔ وہ dominant ہیں اور اسی..... حاکمیت کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پہ ظلم کرتے ہیں، مگر پچھلے کافی عرصے سے ان کو یہ ہمت نہیں ہوئی۔''

''ہوئی تو نہیں، لیکن.....'' گھوڑے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ ''کیا ہو گی بھی نہیں؟''

''جب تک بیلی راجپوتاں کا بدر غازان زندہ ہے، انہیں یہ ہمت نہیں ہوگی۔'' اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''بیلی راجپوتاں کا بدر غازان! دلچسپ نام ہے، کیا مطلب ہوا اس کا؟'' وہ قطار میں بندھے گھوڑوں کو دیکھتے آگے چلتی جا رہی تھی۔

''بیلی کا مطلب مجھے معلوم نہیں، راجپوتاں، البتہ یہاں کے سرکردہ راجپوت خاندان کے حوالے سے ہے، جیسا کہ عموماً پنجاب کے دیہاتوں کے نام ہوتے ہیں۔ انگریز سرکار نے اس کا نام بدل کر کچھ اور کر دیا ہے، مگر ہم اسے اسی پرانے نام سے پکارتے ہیں۔''

''مگر میں تو تمہارے نام کی بات کر رہی تھی۔'' وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''میں سمجھا اگر آپ یہاں محض اصطبل دیکھنے آئی ہیں تو نام میں دلچسپی بھی بس بیلی راجپوتاں تک محدود ہوگی۔''

''اصطبل بھی تو تمہارا ہے۔'' وہ اب تک ایک گھوڑے کے نسواری بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''شکریہ، غازان میرے دادا کا نام تھا، ان کا انتقال میری پیدائش کے روز ہوا تھا، اسی لئے میرے اباجی نے میرے نام کے ساتھ ان کا نام جوڑ دیا۔''

''اور اس کا مطلب......؟''

''اگر مجھے علم ہوتا بیلی راجپوتاں کی ملکہ کبھی مجھ سے یہ سوال کرے گی تو میں اس کا مطلب جاننے کی کوشش ضرور کرتا۔''

''تم اب بھی کر سکتے ہو۔'' وہ نیچے بیٹھی جھک کر ایک مریل سے گھوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ''یہ مجھے بیمار لگ رہا ہے۔''

''یہ بیمار ہے، اسی کے لئے ابھی ڈاکٹر بلایا تھا۔ ویسے سانپوں کے علاوہ گھوڑوں کو بھی بہت پہچانتی ہیں آپ۔'' وہ چلتا ہوا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ ''کافی چہرہ شناس ہیں آپ۔''

''چہرہ نہیں، یہ آنکھیں ہوتی ہیں جو دل کا حال بتاتی ہیں۔''

''انسانوں کی آنکھیں پڑھ لیتی ہیں، مادام؟''

وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''بہت اندر تک۔''

''اور اپنی آنکھیں؟''

''وہ میں پڑھنے نہیں دیتی۔''

اور بدر نے دیکھا، اس کی سنہری آنکھیں آج بھی بے تاثر تھیں۔ کوئی سوچ، کوئی خیال، کوئی نفرت، کوئی محبت، کوئی جذبہ نہیں تھا ان میں۔

''ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ پھر سے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ ''یہ چوہدری منگل سنگھ کا قتل کس نے کیا ہے؟''

''بلی راجپوتاں کے بھوت نے۔''

''میں نے سنا ہے اس نے نزعی بیان تمہیں دیا ہے۔''

''آپ نے درست سنا ہے۔'' وہ چلتے چلتے اصطبل کے کھلے دروازے تک آ گئے تھے۔

''تو کیا واقعی منگل سنگھ نے اعتراف کیا ہے کہ اسے مارنے والا بھوت تھا؟''

''نہیں......''

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''تو پھر......؟''

''وہ بھوت نہیں ہے مایا دیوی! وہ انسان ہے، جو بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ مجھے اس کا نام منگل سنگھ نے بتا دیا ہے۔'' وہ دروازے کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

* * *

''کیا واقعی؟'' مایا کی آنکھوں میں تجسس واشتیاق در آیا تھا۔''تو کون ہے وہ شخص؟''

''ایک انسان جس نے بھوت کا ڈھونگ اس لیے رچایا ہے تاکہ روز رات کو وہ پرانے قبرستان میں جا کر اپنا کام کر سکے، بغیر کسی مداخلت کے۔''

''کیسا کام؟''

''یہ ابھی تک میں نہیں جان سکا، مگر پرانے قبرستان میں یقیناً کچھ ایسا ہے، جس کے لیے اتنا بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کسی جرم کی نشانی، کسی لاش کی تلاش، مگر کس کی لاش؟ اس سوال کا جواب ہمیں تب ملے گا، جب ہم منگل سنگھ کے بتائے ہوئے نام پہ یقین کریں۔''

''تم مجھے وہ نام بتا سکتے ہو۔''

''آپ کیا کریں گی؟'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

''مجھے اس سارے قصے سے کسی سازش کی بو آ رہی ہے اور اگر یہ واقعی کوئی بھوت نہیں ہے تو میں انگلستان جانے سے قبل اس گاؤں کے لوگوں کی محبت کے عوض انہیں اس عفریت سے نجات دلانا چاہتی ہوں، جو معصوم جانوں سے کھیل رہا ہے۔''

''آپ کا قیاس کیا کہتا ہے؟''

''یہی کہ یہ کوئی کریمنل ہے اور اب تو یہ پولیس کیس بھی بن چکا ہے۔''

''پولیس کیس......؟'' بدر نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

''گاؤں کا توہم پرست مسلم تھانے دار اس کیس کو کسی ہوائی چیز کی کارروائی گردان کر کب کا بند بھی کر چکا ہے لیکن انگریز سرکار کو اصل معاملہ کون بتائے گا؟''

''میں بتاؤں گی، اور ...... اور تم بتاؤ گے۔ چوہدری منگل سنگھ نے کس کا نام لیا تھا؟''

''اگر وہ نام میں نے آپ کو بتا دیا تو آپ اس کیس کا بندر ہنا ہی بہتر سمجھیں گی۔'' وہ اداسی سے مسکرایا، مایا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''تو کیا تم مجھے وہ نام نہیں بتاؤ گے؟''

''جب وقت آئے گا تو بتا دوں گا، مگر مجھے نہیں معلوم کہ آپ یقین کریں گی یا نہیں۔''

''میں کرلوں گی، تم مجھے کھرے آدمی لگتے ہو، مگر......'' وہ ایک لمحے کو رکی اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم آدھی رات کو قبرستان میں کیا کر رہے تھے؟''

بدر ہولے سے ہنس دیا۔

''اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ بھوت میں ہوں تو میرے پاس بہت ٹھوس ثبوت ہے۔ میں ساتھ والے گاؤں میں اپنے دوست کی شادی میں گیا ہوا تھا۔''

''ہوں۔'' مایا نے مبہم سا سر ہلایا۔ بدر فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی بات پہ یقین آیا ہے یا نہیں۔

''خیر اب میں چلوں گی۔''

''کھانا کھا کر جائیے، ملکوں کی حویلی سے مہمان ایسے نہیں لوٹتے۔''

''پھر کبھی سہی۔''

''یعنی آپ وعدہ کر رہی ہیں کہ پھر کبھی دوبارہ آئیں گی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کا راستہ چھوڑا۔

''نہ وعدہ کر رہی ہوں اور نہ کوشش کروں گی، موڈ بنا تو آ جاؤں گی۔'' وہ اسی بے نیازی سے کہہ کر چوکھٹ پار کر گئی۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا دور اسے جاتے دیکھتا رہا۔

* * *

اور اسی شام مایا کا گوپال سے سامنے ہوا۔

وہ سٹول پہ بیٹھی پیانو کی کیز کو انگلیوں سے چھوتی فضا میں اداس نغمے بکھیر رہی تھی، جب کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

وہ جو کسی اور دھیان، کسی اور دنیا میں تھی، کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیچھے گوپال کھڑا تھا۔

''جی فرمائیے؟'' ساڑھی کا پلو کندھے سے درست کرتی وہ ناگواری سے بولی۔ اسے گوپال

کی یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔

''آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔'' پُرسکون سی باز پرس کے پیچھے دباد باسا غصہ تھا۔

''پہلے کب آپ کو پوچھنے سے قبل اجازت درکار ہوئی ہے ٹھاکر صاحب؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ ترش ہو گیا۔

''آپ ملکوں کی حویلی گئی تھیں؟''

''ہاں، گئی تھی۔''

''آپ جانتی ہیں مایا دیوی! ملکوں اور راجپوتوں کی دیرینہ دشمنی ہے۔''

''ہاں، جانتی ہوں۔''

''اور یہ بھی کہ راجپوتوں سے کوئی شخص کبھی ملکوں کی حویلی نہیں جاتا۔''

''مجھے سب علم ہے، وہ بھی جو آپ کو نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو گوپال ٹھٹکا، پھر سنبھل کر بولا۔

''اس کے باوجود آپ ملکوں کی حویلی گئیں؟''

''ہاں میں گئی تھی۔'' وہ گردن اٹھائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہی تھی۔

''مگر کیوں......؟'' اشتعال سے گوپال کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

''اس لیے کہ......'' مایا نے اطمینان سے ہاتھ سے بال پیچھے کیے۔ ''میں راجپوت نہیں ہوں۔''

اس کے لہجے کا تفاخر گوپال کو اپنی انسلٹ محسوس ہوا، وہ بھڑک اٹھا۔

''آپ راجپوتوں کی بہو ہیں۔''

''تھی۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''شیکھر کی موت کے ساتھ سارے رشتے ختم ہو گئے۔ میں ایک آزاد برطانوی شہری ہوں اور جب تک ہندوستان برٹش راج کے تحت ہے، میں اس کے کسی بھی کونے میں جا سکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے ٹھاکروں کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی، سفید ساڑھی کا پلّو اس کے پیچھے فرش پہ پھسلتا گیا۔

''جانتا ہوں مایا دیوی! بدر غازان خاصا خوب صورت مرد ہے۔ گاؤں کی بہت سی عورتیں اس پر دل ہار بیٹھی ہیں۔''

طنز بھرا نشتر تھا، مایا اطمینان سے واپس پلٹی۔

"جب گاؤں کی عورتوں کو دل ہارنے کے لیے بدر غازان اور گوپال رام جیسے امیر زادے ملے ہوں تو ظاہر ہے چوائس ان کے لئے خاصی آسان ہو جاتی ہے۔ سنا ہے بدر غازان نے مسلسل پانچ برس آپ کو نیزہ بازی کے مقابلے میں ہرایا ہے۔" اس کی دکھتی رگ پہ مایا نے ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک اٹھا۔

"تم اس کی حویلی کے جتنے چکر لگا لو۔ وہ مسلمان ہے اور تم عیسائی وہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔"

"شادی کرنی کس کو ہے؟" وہ تپانے والے انداز میں مسکرائی۔

گوپال پاؤں پٹختا اس کے ایک طرف سے نکل گیا۔

مایا نے آرام سے فرش پہ گرا پلو اٹھایا اور اوپر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

***

پرانا قبرستان ہر رات کی طرح اس رات بھی تاریک اور سنسان پڑا تھا۔ برگد کے بوڑھے درخت کا سایہ قبروں پہ چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں خستہ حال قبریں اور بھی خوف ناک لگ رہی تھیں۔

ایک ، جو قبرستان کے کونے میں کھڑا کدال سے مسلسل زمین کھود رہا تھا۔ گڑھا کئی فٹ گہرا کھد چکا تھا، جیسے کوئی کھلی ہوئی قبر ہو، اس کا سیاہ چغہ مٹی سے اٹ چکا تھا، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس کی کمر اور سر جھکے تھے اور ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

تاریک آسمان پہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہوائیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ برگد کی بوڑھی شاخیں جھولنے لگیں، زمین پہ گرے پتے دور تک اڑتے بکھرتے جا رہے تھے۔

چغہ پوش نے سر اٹھا کر اوپر آسمان کو دیکھا۔ وہاں وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو ایک لمحے کو پورا قبرستان روشنی میں نہا جاتا اور ایک کھلی قبر کے سرہانے کھڑا سایہ کوئی بھوت سا دکھتا تھا۔

ہوائیں تیز ہو گئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی تو اس نے تھکے تھکے انداز میں واپس مٹی بھرنا شروع کر دی۔ مسلسل تیز بارش اور طوفانی ہوائیں اس عمل کو مشکل بنائے دے رہی تھیں۔ مٹی بھیگ

کر کیچڑ بنتی جا رہی تھی۔

اس نے کچھ دیر مزید کوشش کی اور پھر جیسے تھک کر کدال چھوڑ دی۔ بجلی ایک لمحے کو زور سے چمکی۔

اس نے بے اختیار نڈھال سے انداز میں خود کو زمین پہ گرا لیا۔ چغہ کیچڑ میں لتھڑ گیا اور وہ سایہ خود میں سمٹتا سا گیا۔

بادل اسی طرح گرج رہے تھے، طوفان اپنے عروج پہ تھا۔ چغہ پوش نے کسی چھوٹے معصوم بچے کی طرح بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور سر ان میں چھپا کر ایک دم رونا شروع کر دیا۔

طوفان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے درمیان میں دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ بہت تھکی تھکی، زخموں سے چور سسکیاں، دکھ اور ناکامی کی آخری حد کو چھوتی بے بس آہیں۔

''کدھر ڈھونڈوں میں اسے؟'' ایک بھرپور انسان کی روتی آواز چغے میں سے ابھری۔ ''کدھر تلاش کروں میں اسے؟ پورا قبرستان کھود ڈالا میں نے، مگر وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ میں کدھر ڈھونڈوں اسے؟ کوئی کونہ نہیں بچا، جسے میں نے نہ کھودا ہو، پھر...... پھر کہاں گیا وہ؟'' سسکیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں، جیسے کسی عزیز ترین شے کے کھو جانے پہ کوئی بین کر رہا ہو۔ ''میری برسوں کی ریاضت رائیگاں چلی گئی۔ میری برسوں کی محنت ضائع ہو گئی۔''

کھلی قبر کے دہانے بیٹھا وہ وجود ابھی تک رو رہا تھا۔

* * *

وہ دالان میں کرسی ڈالے کسی کتاب میں منہمک تھی۔ جاتی سردیوں کی نرم گرم دھوپ سارے میں بکھری تھی۔ اس کی کتاب پہ جھکی آنکھوں میں دم توڑتے سرما کے آخری سورج کا عکس تھا۔

''مہارانی جی! مہارانی جی!'' روپ وتی کوئی خبر دینے بھاگتی آئی تھی، مگر اسے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''ہائے بھگوان یہ کب پہنا آپ نے؟''

مایا نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اس کی حیران نگاہوں کے تعاقب میں خود کو دیکھا۔

سفید چوڑی دار تنگ پاجامہ اور ہم رنگ لمبا سا کرتا، شانوں پہ پھیلا یہ بڑا سا بے داغ اجلا سفید دوپٹہ...... اور بھورے سنہری بالوں کی ڈھیلی سے چوٹی سامنے کندھے پہ ڈالی ہوئی۔

''کیا تمہیں یہ خوبصورت نہیں لگا؟''

''ہائے نہیں دیوی جی! بہت سندر ہے۔'' روپا اشتیاق سے اس کے چاروں اطراف میں گھوم کر اسے دیکھتی واپس اس کے سامنے آئی۔ ''یہ خود سلوایا آپ نے؟'' وہ جو بات کہنے آئی تھی، وہ بول کر پوچھنے لگی۔ اس نے ابھی تک مایا کو ساڑھیوں اور مغربی لباس میں دیکھا تھا، یہ نیا روپ اس کے لیے بہت منفرد تھا۔

''اونہوں، تمہارے دہلی میں کسی نے تحفتاً دیا تھا۔'' وہ پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ہمارا دہلی کیوں مہارانی جی، کیا دہلی آپ کا اپنا نہیں لگتا۔'' روپا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''کیا فائدہ ہندوستان کے شہروں کو اپنانے کا روپا؟ مجھے تو واپس انگلستان چلے جانا ہے، چند دنوں میں۔''

روپ وتی نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ سفید کرتا پاجامہ پہنے کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھی وہ شہزادیوں کی تمکنت والی لڑکی کیا ٹھاکر گوپال راج کے قابل تھی؟

اس کے ذہن میں گزشتہ شام گوپال کی وہ باتیں گونجنے لگیں، جو اس نے اسے بطور خاص بلوا کر تنہائی میں کہی تھیں۔

''مایا تم پہ بہت بھروسہ کرتی ہے روپ وتی! تمہیں اب اس کو اپنا ہم خیال بنانا ہے۔''

روپ وتی نے ایک چور نگاہ اس پہ ڈالی۔ وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کتاب پہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

''کچھ کہنا چاہتی ہو روپا؟'' وہ کتاب سے نظر ہٹائے بغیر پوچھنے لگی تو روپ وتی کو لگا، اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

''کیا یہ ممکن نہیں ہے دیوی جی کہ آپ ہندوستان سے نہ جائیں اور ہمیشہ کے لیے ادھر رہ جائیں؟''

''جانے بھی دو روپا! شیکھر کے بعد کون ہے اب میرا؟''

''میں ہوں دیوی جی اور آپ کی ساری زمین، جائیداد......''

مایا استہزائیہ ہنس دی۔ ''کیا کمبینیشن ہے، روپ وتی اور زمین، جائیداد۔''

''تو وہ بدر بابو بھی تو ہے نا۔''

''اس کا یہاں کیا ذکر؟'' اسے اچنبھا ہوا۔ دھوپ اب کرسیوں سے سمٹ کر دالان کی دیواروں تک رہ گئی تھی۔

''اس نے کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی، رئیسوں کی بیٹیاں اس پہ مرتی ہیں، مگر وہ بہت مغرور بندہ ہے، لیکن آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔''

''تو اس نیزہ باز سے عزت کروانے میں اِدھر رہ جاؤں؟'' نگاہیں پھر سے صفحے پہ جھک گئیں۔

''آپ چلی گئیں تو میں اداس ہو جاؤں گی۔''

''تمہیں نئی مہارانی جلد مل جائے گی روپا۔''

روپ وتی کو سرا مل گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔''تو آپ بن جائیں نا نئی مہارانی!''

مایا نے ایک دم کتاب بند کر دی۔ اس کے ذہن میں جیسے الارم سا بجا تھا۔

''میں کیسے بن سکتی ہوں تمہاری نئی مہارانی؟''

''چھوٹے ٹھاکر سے شادی کر کے۔ وہ آپ کو پسند کرتے ہیں، مجھے سب پتا ہے۔''

''مگر یہ بات تمہارے چھوٹے ٹھاکر نے خود تو مجھے نہیں کہی۔''

''آپ اشارہ دے دیں، وہ کہہ ڈالیں گے۔'' روپا کا جوش دیدنی تھا۔

''میں کیوں اشارہ دوں؟ کہنا ہے تو خود کہیں۔'' اس نے ہاتھ سے بال سنوارے۔''جاؤ میرے شوفر سے کہو گاڑی تیار کرے، مجھے کہیں جانا ہے۔''

''میں بس ہنڈیا دیکھ لوں، پھر......'' روپا اٹھنے لگی۔

''تم نہیں روپا! میں اکیلی جاؤں گی۔'' ایک جتاتی نگاہ اس پہ ڈال کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''اکیلی......؟'' روپ وتی حیران سی کھڑی ہوئی۔

''ہاں، اکیلی اور میں بات دہرانے کی عادی نہیں ہوں۔''

وہ حویلی کے اندر چلی آئی اور روپا وہیں فق چہرہ لیے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔

''تو اب ٹھاکر خادماؤں کو پیادے کے طور پر استعمال کریں گے۔'' سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی آئینے میں اپنا عکس دیکھتے وہ بڑبڑائی۔''نہیں ٹھاکر گوپال راج! اتنی آسانی سے مایا

فرینڈس کو کوئی نگل نہیں سکتا۔'' وہ خاموشی سے کھڑی کچھ سوچتی رہی۔

دفعتاً اس کے عکس کے پیچھے روپا کا چہرہ نمودار ہوا۔

''شوفر تیار ہے مہارانی جی!'' روپ وتی نے سر جھکا دیا، اس کی آواز بہت پست تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس نے مایا کا اعتماد کھو دیا ہے۔

وہ کچھ کہے بغیر باہر آ گئی۔ اس کی مورس اور شوفر تیار تھے۔ وہ اسی گاڑی میں دہلی سے یہاں تک آئی تھی اور اپنے استعمال کے لیے یہی گاڑی استعمال کرتی تھی۔

پھر تمام راستہ گاڑی میں بیٹھی کھڑکی سے باہر گاؤں کے کچے راستوں کو دیکھتی وہ کچھ سوچتی آئی تھی۔ اس کی سوچیں اس کے چہرے سے پڑھنا بہت مشکل تھا۔ شوفر نے مورس امرود کے باغات کے سامنے روک دی۔ وہ ایک دفعہ پہلے شیکھر کے ہمراہ ادھر آئی تھی۔ شیکھر نے اسے بتایا تھا کہ کچی سڑک کے اس طرف والے باغ راجپوتوں، جبکہ دوسری جانب والے ملکوں کے ہیں۔

بہت روز بعد آج اسے تنہائی ملی تھی۔ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے خاموشی سے گھنے درختوں کے درمیان چلتی گئی جیسے کوئی صحرا میں بھٹکتا مسافر بغیر کسی منزل کے تعین کے یونہی ایک سمت میں بڑھتا چلا جائے۔

''مایا دیوی!'' کوئی اس کے پیچھے آ کر بولا۔

وہ بہت آرام سے پلٹی۔

سامنے بدر کھڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش اور وجیہہ۔

''راجپوتوں کے باغ میں ایک ملک کا کیا کام؟''

''نہیں ہے، تبھی تو ملک صرف اپنے اس باغ میں آیا ہے، جہاں اسے بیلی راجپوتاں کی مہارانی کی آمد کی خبر ملی تھی۔''

''اچھا؟ یہ تمہارا باغ ہے؟'' مایا نے لاپروائی سے شانے جھٹکے۔ ''میں غلطی سے شاید اس سمت آ گئی۔ شیکھر کا باغ شاید سڑک کے اس طرف ہے۔''

''اسے شیکھر کا باغ کیوں کہتی ہیں؟ وہ تو اب آپ کی ملکیت ہے۔'' وہ دونوں درختوں کے درمیان کھڑے تھے۔ دھوپ درختوں کے بیچ سے چھن چھن کر ان تک آ رہی تھی۔ دور چڑیاں بول رہی تھیں۔

"مجھے ان زمینوں، جائیدادوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"شیکھر کی جائیداد اچھی خاصی قیمتی ہے مایا دیوی!"
"میری رشتے کی دادی برطانیہ کی ملکی ہے اور تمہارا ہند عظیم اک برطانوی نوآبادی، شیکھر کیا بدر غازان کی زمینیں بھی کوئین مدر کے راج میں آتی ہیں۔تم ایک نوآبادی کے گاؤں کے ایک باغ کی قیمت ایک شہزادی کو گنوار ہے ہو؟" وہ ہلکا سا مسکرائی۔
"یہ غلطی پھر نہیں دہراؤں گا۔" وہ بھی جواباً مسکرادیا۔
"تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔" وہ درخت کی شاخ ہاتھ سے ہٹاتی آگے گزر گئی۔
"انہیں پہچانتی ہیں؟" شاخ ہاتھ میں پکڑے پکڑے مایا پلٹی۔ وہ درخت کے اس پار کھڑا تھا۔ان دونوں کے درمیان گھنی شاخیں حائل تھیں۔
"کیا......؟"
بدر نے اپنی ہتھیلی سامنے کی۔
سیاہ مٹی کے درمیان چند موتی جگمگا رہے تھے۔
مایا نے شاخ چھوڑ دی۔ وہ ہوا میں غوطہ کھا کر جھولنے لگی، پھر آہستہ آہستہ ساکن ہوگئی۔
"یاد نہیں......" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"جانتا تھا آپ کو یاد نہیں ہوگا۔"
"کس نے دیئے تھے یہ موتی تمہیں؟" وہ انگلی پہ موتیوں کی لڑی مروڑ رہی تھی۔
"میں نے ایک مہارانی کو روکنا چاہا تھا، میرے ہاتھ میں اس کے بالوں میں جڑے چند موتی آئے تھے، اس نے کہا تھا، یہ شاہی خاندان کا دستور ہے کہ جس نے جس پہ ہاتھ رکھا، وہ اس کو دے دیا گیا، سو وہ موتی اس نے مجھے دے دیئے۔" اس نے مٹھی بند کر کے ہاتھ گرا دیا۔
"تم نے صرف اس کے موتی کیوں چھوئے؟ تم کچھ بہتر بھی اپنے نام کروا سکتے تھے۔"
"اگر آپ میری جگہ ہوتیں اور کوئی ملکہ آپ کو چھونے پہ عطا کر دینے کا اختیار دے دیتی تو آپ کیا کرتیں؟'
"اگر کوئین مدر مجھے یہ اختیار دے تو میں اس کا تاج لوں گی۔ مگر تم میری بات نہیں سمجھو گے۔"

''میری بات آپ بھی نہیں سمجھیں۔'' وہ ڈلہوزی کی مٹی میں لتھڑے موتی واپس جیب میں ڈال کر ہاتھوں سے شاخیں ہٹاتے ہوئے اس تک آیا۔

''آپ کی موتیوں کی یہ لڑی بہت خوب صورت ہے۔ میں نے کبھی آپ کو اس کے بغیر نہیں دیکھا۔''

''تم مجھے اس کے بغیر دیکھو گے بھی نہیں۔''

''کیا کوئی خاص وجہ ہے؟''

''بہت خاص۔''

''کس نے دی تھی یہ آپ کو؟''

''میری تیرہویں سالگرہ پہ کوئین مدر نے دی تھی۔ جانتے ہو بدر! میں اسے کیوں پہنتی ہوں۔'' وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے سینے پہ ہاتھ باندھے پوچھ رہی تھی۔

''میں اسے اچھے شگون کے لیے پہنتی ہوں۔ جب تک یہ پاس ہے، خوش بختی کا ہما میرے سر پہ سایہ کیے رکھتا ہے۔ اگر کبھی تم ان موتیوں کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھو تو جان لینا کہ یا تو مایا نے دل ہار دیا...... یا......''

''یا......؟'' وہ منتظر تھا۔

''یا مایا نے جان ہار دی۔''

بدر نے ہاتھ بڑھا کر لڑی میں لگی بدصورت گرہ کو تھاما، اس کی انگلیاں مایا کے ملائم بالوں سے مس ہوئی تھیں۔

''ادھر کیا ہارا تھا؟'' وہ گرہ تھام کر پوچھ رہا تھا۔

''اور اگر مجھے کبھی اس سے بہتر کچھ ایسا مل گیا جو خوش بختی کے ہما کو ہمیشہ میرے سر پہ رکھے تو میں خود اسے توڑ دوں گی۔''

بدر نے گرہ چھوڑ دی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ نظر انداز کر گئی ہے تو پھر نہیں بتائے گی۔

''آپ ہمیشہ سفید رنگ کیوں پہنتی ہیں؟''

وہ اب ساتھ ساتھ چلتے باغ کے باہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

''کیا یہ ہندوستان کی بیواؤں کا دستور نہیں ہے؟''

"مگر آپ تو......"

"تمہارا پیارا گھوڑا کیسا ہے؟"

وہ مایا کی مورس تک پہنچ گئے تھے۔ شوفر نے اسے دیکھتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

"بہت بہتر، آپ پھر حویلی نہیں آئیں۔"

"مجھے آنا تھا کیا......؟"

"ایک دعوت آپ پہ ادھار تھی۔"

"مگر میں نے کہا تھا، نہ وعدہ کروں گی، نہ کوشش تو پھر ادھار کیسا؟" وہ بیٹھ گئی تو شوفر نے دروازہ بند کر دیا۔

بدر نے بند کھڑکی کے اس پار بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا، وہ اب سامنے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔

شوفر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ وہیں کھڑا دھول اڑاتی گاڑی کو دور جاتے دیکھتا رہا۔

* * *

چاچی سب کے دھلے ہوئے کپڑے ڈھیر سے علیحدہ کر رہی تھی۔ پاس ہی زہرہ دوسری چارپائی پہ بیٹھی تھی۔

بدر کی قمیص کی تہہ لگاتے چاچی نے لمحے بھر کو زہرہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بڑی ہوئی تھی، اس کے ایک ایک رنگ کو چاچی پہچانتی تھی۔ پچھلے چند روز سے وہ اسے بہت چپ چپ اور اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھی۔

"زہرہ......اے زہرہ۔"

تہہ کیے کپڑوں کا ڈھیر لگاتے چاچی نے اسے پکارا۔ وہ بے دلی سے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"جا شاباش یہ اس طرف والے کپڑے بدر کے کمرے میں رکھ آ......"

"جنتے کو کہہ دو چاچی۔" وہ بے زار سی بیٹھی رہی۔

"نہ بدر کا کام جنتے کو کیوں کہوں؟ تیرے ہوتے ہوئے کوئی اور کیوں کام کرے اس کا؟"

"مجھے نہیں پتا، بس مجھے بدر کا کوئی کام نہ کہا کرو۔" غصے سے بولتے بولتے اس کی آواز بھر

آئی۔ چاچی نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

''زہرہ، ادھر میرے پاس آ۔'' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''زہرہ ادھر آ، مجھ سے کیا خفگی۔''

وہ سر جھکائے چاچی ے پاس آ بیٹھی۔

''بدر سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''میرا کیوں ہوگا اب اس سے جھگڑا؟''

''اب......؟'' چاچی ''اب'' کے لفظ پہ چونک اٹھی۔

''اب کیا ہوا؟ بدر تو ویسا ہی ہے۔''

زہرہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ ویسا نہیں رہا چاچی!''

''مگر کیا ہو گیا ایسا؟'' چاچی پریشان ہو گئی۔

''اب وہ انگریز میم جو آ گئی ہے گاؤں میں۔ اب بدر کو زہرہ کدھر......'' آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

''تو شیکھر کی بیوی کی وجہ سے پریشان ہے؟''

''تو نہ ہوں؟''

''ارے او پگلی۔'' چاچی ہنس دی۔ ''وہ تو انگریز ہے، اس کا ہم سے کیا جوڑ۔''

''جوڑ تو اس کا ٹھاکر شیکھر سے بھی نہیں تھا، شادی تو پھر بھی اس نے کر لی تھی نا اس سے۔'' زہرہ بہت دکھی تھی۔

''مگر تجھے اس سے کیا ڈر ہے؟ وہ تو واپس انگلستان چلی جائے گی۔''

''اور اگر وہ بدر کو ساتھ لے گئی تو؟''

''بدر کوئی بچہ ہے؟ جو اسے ساتھ لے جائے، جھلی نہ ہو تو۔'' چاچی ہنستے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگی۔

''تجھے نہیں پتا چاچی! تو نے ابھی اس کو دیکھا نہیں ہے۔'' زہرہ کی آنکھوں کے سامنے منڈیر پہ بیٹھی سنہری بالوں والی لڑکی آ گئی۔

''کیا میری زہرہ سے زیادہ حسین ہے؟''

''نہیں چاچی، بہت حسین نہیں ہے، مگر وہ ساحرہ ہے اور تیری زہرہ کو سحر نہیں آتا۔'' اس نے شکستگی سے سر جھکا دیا۔ آنسو اس کی ہتھیلی پہ گر رہے تھے۔

''تو غم نہ کر زہرہ! جب اتنے برس ولایت پڑھنے کے باوجود کوئی میم بدر کو نہیں ہتھیا سکی تو چند دنوں میں یہ ٹھاکرانی کیا کر لے گی۔؟ اگر بدر کو میموں کے چکر میں پڑنا ہوتا تو وہ بھی شیکھر کی طرح ایک میم اٹھا لاتا۔''

''پر اب تو بدر پڑ رہا ہے نا میم کے چکر میں۔ اس روز وہ حویلی آ گئی، کل شرفو بتا رہا تھا، وہ ہمارے باغ میں آ گئی اور بدر اسے لے کر گھومتا رہا۔ کبھی مجھے تو باغ کی سیر نہیں کرائی۔ سارا غصہ اور رعب میرے لیے ہے۔ اس سے تو ہنس کر بات کرتا ہے۔''

''غصہ اپنوں پہ ہی کیا جاتا ہے، انسان حق اپنوں پہ ہی جتاتا ہے۔ پرائی لڑکی کو وہ کیا کہہ سکتا ہے۔ تو غم نہ کر، یہ گوری میمیں زیادہ دیر ٹکنے والی نہیں ہوتیں۔ دیکھتی نہیں ہے کیسے ابھی شیکھر مرا اور ابھی وہ اونے پونے زمین بیچ کر واپس جا رہی ہے؟ جب اتنی بڑی جائیداد اس کا راستہ نہیں روک سکی تو ایک بدر کے لیے وہ کیسے رک جائے گی؟ ان انگریزوں کو محبت، رشتوں کا کیا پتا بھلا؟ شیکھر کی بات اور تھی، وہ شہر میں رہتا تھا۔ اگر یہ لڑکی گاؤں میں رہنے والی ہوتی تو شیکھر اس کے لیے الگ سے شہر میں کوٹھیاں کیوں بناتا؟ پہلے دن ہی گاؤں میں نہ لے آتا؟ تو بھی کس کا غم کر رہی ہے زہرہ! جانے دے اس کو، نظر انداز کر۔ اس نے چند دن میں چلے جانا ہے اور بدر کہاں ماں کی بات ٹالتا ہے۔ اس گھر کی بہو صرف تو بنے گی، یہ تو بچپن سے طے ہے۔ اب جا، یہ کپڑے جا کر بدر کے کمرے میں رکھ آ۔''

بات زہرہ کے دل کو لگی تھی، وہ اک دم ہلکی پھلکی ہو کر اٹھی اور آنسو صاف کرتی کپڑے اٹھا کر اندر چلی گئی۔

چاچی باقی ڈھیر کو دوسری چارپائی پہ رکھنے لگی۔

* * *

وہ پلنگ پہ آڑی ترچھی لیٹی تھی۔ سپید بازو سے آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ شب خوابی کا گلابی رنگ کا لباس اس کے ٹخنوں سے کچھ اوپر تک آتا تھا اور دودھیا بے داغ پاؤں بستر سے نیچے لٹک رہے تھے۔

وہ سونہیں رہی تھی، یونہی لیٹی کچھ سوچے جا رہی تھی۔

ایک دم اسے لگا کسی نے ہولے سے ٹخنے سے کچھ اوپر اس کی پنڈلی پہ ہاتھ رکھا ہے۔ ایک جھٹکے سے مایا اٹھ بیٹھی۔

گوپال پلنگ کی پائنتی کے قریب کھڑا تھا۔

''آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟'' وہ ناگواری سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی اور وال کلاک کو دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

''بوریت محسوس ہو رہی تھی، سوچا آپ سے گپ شپ لگا لی جائے۔'' اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ تھیں، شاید وہ نشے میں تھا۔

''رات کے ایک بجے آپ کو گپ شپ لگانے کا خیال کیوں آیا؟'' اس کے اندر غصے کی لہر اٹھی تھی۔

''کیا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟'' وہ دو قدم آگے بڑھا۔

مایا پیچھے ہٹی۔

''آپ ابھی اور اسی وقت یہاں سے تشریف لے جائیں۔'' غصے سے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

''مایا ڈیوی! ہم مل بیٹھ کر......'' وہ چند قدم مزید اس کے قریب آیا۔

''مل بیٹھ کر کیا؟'' مایا نے ایک دم اسے کہنی سے پکڑا اور دھکیلتی ہوئی دروازے تک لائی اور پیشتر اس سے کہ وہ سنبھل پاتا، اس نے اسے باہر دھکا دے دیا۔ ''آئندہ ایسی ہمت بھی کی تو دیکھنا، مایا فرنینڈس کو تم ابھی جانتے نہیں ہو۔''

اور پھر تیزی سے دروازہ بند کر کے اس نے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''کب آیا یہ میرے کمرے میں؟ مجھے پتا کیوں نہ چلا۔ آج جو کچھ ہو جاتا تو......'' وہ بڑبڑائی تھی، آہستہ آہستہ اس کی بڑبڑاہٹ دھیمی پڑتی گئی۔

اس نے سر گھٹنوں پہ رکھ دیا۔

''شیکھر! تم کیوں مر گئے؟ تم کیوں مجھے اکیلا کر گئے؟''

* * *

اور اس شام بہت اچانک سے وہ بدر کو پھر نظر آ گئی۔ وہ کسی کام سے اپنی زمینوں کی طرف جا رہا تھا، جب کنویں کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک لڑکی کی پشت پہ جھولتی سنہری چوٹی دکھائی دی۔

اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

وہ کنویں کی منڈیر پہ بیٹھی تھی، اس کی بدر کی جانب کمر تھی۔ بالکل گم صم سی بیٹھی، سر اٹھائے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ گھوڑے سے اتر آیا۔

''کیا ٹھاکروں نے اب مہارانیوں سے پانی بھرنے کا کام لینا شروع کر دیا ہے؟'' بہت آہستہ سے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

مایا چونک کر کھڑی ہوئی۔ پہلی دفعہ تھا، جب بدر نے اسے یوں چونکتے دیکھا تھا، ورنہ وہ ہمیشہ بہت پرسکون رہا کرتی تھی۔

''مہارانیاں اپنی مرضی سے گھوم پھر تو سکتی ہیں۔'' وہ سنبھل کر مسکرا دی، مگر بدر کو اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی لگی۔

اس نے بغور مایا کو دیکھا۔

اس نے آج پھر سفید کرتا، پاجاما اور بڑا سا سفید دوپٹہ لے رکھا تھا۔ چہرے پہ سنہری لٹیں گر رہی تھیں اور وہ بار بار انگلیوں سے انہیں کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ بدر کو وہ کچھ پریشان سی لگی۔

''طبیعت ناساز ہے مہارانی جی؟''

''ہوں۔'' وہ جیسے پھر چونکی اور نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں تو ہرگز نہیں۔'' اس کی ازلی برجستگی آج مفقود تھی۔

پھر وہ واپس منڈیر پہ بیٹھ گئی، بدر بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں کی پشت پہ گہرا کنواں تھا اور کنویں کے اس طرف اس کا سفید گھوڑا گردن جھکائے جھاڑیوں میں منہ مار رہا تھا۔

پھر کتنے ہی پل یونہی خاموشی سے سرکتے رہے۔ نیلی راجپوتاں کی ٹھنڈی میٹھی شام ڈوب

رہی تھی۔ کنویں کے ساتھ بڑا سا بیری کا درخت تھا، جس کے کچے بیر ان کے قدموں میں بکھرے پڑے تھے۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر ڈوبتی شام کی دم توڑتی دھڑکنوں کی آواز سنتے رہے، پھر بدر نے خاموشی توڑی۔

"کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔"

"نہیں تو۔" مایا نے سر جھکا دیا۔ وہ جوتے سے زمین پہ گرے بیر اِدھر اُدھر کر رہی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"اونہوں۔" وہ اسی طرح اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"ایک بات کہوں مایا دیوی؟"

وہ پھر سے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "کہو۔"

"اس گاؤں میں بہت سے لوگوں سے آپ کے اچھے تعلقات ہوں گے، مگر ایک بات یاد رکھیے گا، یہاں آپ کے خیر خواہ بہت کم ہوں گے۔"

مایا نے سر شکستگی سے جھکا دیا۔ آج وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

"اور اس طرح تنہا اِدھر نہ گھوما کریں۔ کسی کو ساتھ لایا کریں۔"

"مجھے ٹھاکروں کی خادماؤں پہ بھروسا نہیں ہے۔"

"اور مجھے گاؤں کی فضا پہ بھروسہ نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں ایک سو کالڈ بھوت یہاں پھر رہا ہے۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ جتنا میں اسے جانتا ہوں، وہ آپ کی جان کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں، یہاں آپ کے خیر خواہ بہت کم ہیں۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

اس کی سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ "کیا واقعی شیکھر کے بعد یہاں میرا کوئی خیر خواہ بچا ہے؟"

"شیکھر سے شادی کیوں کی تھی آپ نے؟ آپ کا اور اس کا جوڑ نہیں تھا۔" مایا نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

دور افق پہ بادل بکھرے تھے۔ ان کے کنارے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے سرخ پڑ رہے تھے۔

"محبت یہ سب نہیں دیکھتی بدر!"

''مگر کم از کم اس کو تو دیکھتی ہے، جس سے محبت کی جا رہی ہو۔''

مایا نے اداس مسکراہٹ سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رقابت کا جذبہ کہیں نہ کہیں اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔

''ہاں، اسی کو تو دیکھا تھا۔'' وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی۔ نارنجی بادلوں کے سامنے سے پرندوں کا ایک غول اڑ رہا تھا۔

''مگر کیا دیکھا تھا؟ آپ برطانیہ کی شہزادی اور شیکھر ہندوستان کا ایک ایسا رئیس زادہ، اس جیسے ہزاروں رئیس زادے یہاں بکھرے پڑے ہیں۔''

وہ سامنے پرندوں کے غول کو دیکھتی زخم خوردہ سی مسکرادی۔

''تم کیا جانو تیز باز لڑکے! میں نے اس میں کیا دیکھا تھا، وہ جو ہندوستان کے کسی رئیس کے پاس نہیں تھا۔ تم جان گئے تو شاید صدیوں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکو گے۔''

''اور کیا تھا وہ......؟''

مایا منڈیر سے اٹھی اور جھک کر بیر چننے لگی۔ پانچ موٹے موٹے بیر چن کر وہ سیدھی ہوئی۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے پانچ بیر ہتھیلی پہ رکھے اور ہتھیلی بدر کے سامنے کی۔

''اگر میں ان بیروں کو باری باری چاروں اطراف میں پھینکوں، ایسے......'' اس نے ایک ایک کر کے چاروں بیر پوری قوت سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف اچھالے، چاروں بیر کمپاس کی سوئیوں کی طرح دور جا گرے۔

اس نے آخری بیر اوپر آسمان کی جانب اچھالا۔ بیر تیزی سے ہوا میں اوپر اٹھتا گیا۔ مایا اور بدر گردن اوپر اٹھائے اسے دیکھتے رہے۔ وہ کافی اوپر جا کر ایک ثانیے کو ہوا میں ٹھہرا اور پھر نیچے آن گرا۔

''دیکھا تھا اس بلند ترین پوائنٹ کو، جہاں وہ بیر جا کر ٹھہرا تھا؟'' بدر نے کسی معمول کی طرح سر ہلا دیا۔

''اور وہ چاروں بیر دیکھے تھے، جو دور دور جا گرے، جیسے کسی چوکور کے چار کونے ہوں۔ اب تم ریاضی کی کسی تصویر کی طرح ان چاروں بیروں کو لکیروں سے جوڑ دو اور سمجھو کہ ان لکیروں کی جگہ بلند دیواریں ہیں جو اوپر اس پوائنٹ تک جاتی ہیں، جہاں تک آخری وہ بیر گیا تھا، پھر تم اس چوکور کو

اوپر سے نیچے تک سونے، چاندی اور جواہرات سے بھر دو، تب بھی، یہ تمام قیمتی جواہرات مل کر بھی اس کو برابر نہیں کر سکتے، جو میں نے شیکھر میں دیکھا تھا۔" وہ واپس منڈیر پہ بیٹھ گئی۔

"اور آپ کو لگتا ہے کہ شیکھر کو بھی آپ سے اتنی ہی محبت تھی، جس کے آگے دنیا کی تمام دولت کا ڈھیر ہیچ ہے؟"

"ہاں، بالکل!" وہ فخر سے مسکرائی۔ اسی پل ایک تتلی اس کے چہرے کے سامنے سے گزری۔ مایا چونکی، پھر ہاتھ بڑھا کر تتلی کو تھامنا چاہا، مگر وہ اڑ گئی۔ وہ ایک دم اس کے پیچھے دوڑتی گئی۔ تتلی بیری کے درخت کے پیچھے چھپنے لگی مگر مایا نے کسی معصوم شرارتی بچے کی طرح ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا، پھر بند مٹھی لے کر بدر کی طرف آئی۔

"مجھے تتلیاں اچھی لگتی ہیں۔" وہ جھینپ کر بتا رہی تھی۔

"اب آپ بہتر لگ رہی ہیں مہارانی جی! ورنہ اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ آپ پریشان ہیں۔"

مایا کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔ اس نے مٹھی سختی سے بھینچ لی، شاید اسے بھول گیا تھا کہ اندر تتلی بھی ہے۔

"آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔"

وہ شکست خوردہ سی واپس بیٹھ گئی۔

"آپ کی آنکھیں سرخ ہیں، جیسے آپ رات بھر سوئی نہیں ہیں۔" مایا نے سر جھکا دیا، اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگی ہوں۔"

"ٹھاکروں کی حویلی بہت محفوظ ہے۔ وہ چغہ پوش ادھر نہیں پہنچ سکتا۔"

مایا نے سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"میں ٹھاکروں کی حویلی میں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہوں، مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔"

بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟" پھر جیسے اسے خیال آیا۔ "کیا گوپال نے کچھ کہا ہے؟" اس کے ماتھے پہ شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"وہ دو روز پہلے رات کو میرے کمرے میں آ گیا۔ بہت مشکل سے میں نے اسے باہر

نکالا۔''

''اور کل رات پھر وہ آیا تھا؟''

''کل رات؟'' مایا نے سوچتے ہوئے سر اٹھایا۔

''کل رات ایک عجیب سی بات ہوئی۔ میں کمرہ بند کر کے، بتیاں گل کر کے بالکونی میں بیٹھی تھی کہ......'' وہ کنفیوزڈ سی چپ ہوگئی۔

''بتایئے مایا دیوی!''

''بالکونی سے حویلی کا پچھلا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کچھ گودام اور جانوروں کے باڑے بنے ہیں۔ کل پورے چاند کی رات تھی، مجھے چاندنی میں بس اتنا نظر آیا کہ کوئی لمبا سا شخص جسم کے گرد سیاہ چادر یا کوئی بڑا سا کپڑا لپیٹے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا اندر داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اتنی رات کو چوروں کی طرح کیوں کوئی داخل ہوگا حویلی میں، میں یہ سمجھ نہیں سکی۔''

''مگر میں سمجھ گیا ہوں۔ وہ وہی بھوت تھا اور یقیناً اس وقت پرانے قبرستان سے واپس آ رہا تھا۔''

''مگر وہ حویلی میں کیوں آیا؟''

''اس لیے کہ اس کا تعلق آپ کی حویلی سے ہے۔''

مایا سن ہو کر رہ گئی۔ ''کون......؟ گوپال؟''

بدر خاموشی سے اسے دیکھتا۔

''تمہیں...... تمہیں منگل سنگھ نے اس، بھوت کا نام بتایا تھا، کیا اس نے گوپال کا نام لیا تھا۔ کیا وہ گوپال ہے؟''

بدر نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر......؟ پھر کون ہے وہ؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

''آپ یقین نہیں کریں گی۔''

''تم بتاؤ تو سہی، میں اس تجسس سے بے زار ہو چکی ہوں۔''

''تو پھر سنئے، وہ بھوت دراصل ٹھاکر شیکھر راج ہے۔''

مایا کی مٹھی کھل گئی۔ مری ہوئی تتلی نیچے آن گری۔ وہ ساکت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''شیکھر زندہ ہے۔''

وقت رُک گیا، لمحے ساکن ہو گئے، فضا تھم گئی۔ وہ اسی طرح گم صم اسے دیکھے گئی۔

''ہاں، جہاں تک میرا قیاس ہے، وہ زندہ ہے۔'' وہ سامنے آسمان پہ اترتے بادل دیکھ رہا تھا۔

مایا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ سب کچھ جیسے گڈمڈ ہو رہا تھا۔

منگل سنگھ کے الفاظ...... شیکھر کا زندہ ہونا ...... بیلی راجپوتاں کا بھوت...... کیا سچ تھا، یا جھوٹ؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس سے صورت حال کیا سمجھے......

کتنے پل سرک گئے تو اس نے سر اٹھایا۔

دور نیلے افق پر سرخ بادل بکھرے تھے۔ بدر ابھی تک ان کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے پہلی دفعہ مایا کی اڑی اڑی رنگت دیکھی تھی۔ وہ اسے اتنی پریشان اور بے یقین پہلے کبھی نہیں لگی تھی، جتنی ڈوبتی شام کے اس سمے لگ رہی تھی۔

''مایا......!'' اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ ہلایا۔ اس کی جلد بہت ملائم تھی، جیسے موم کی بنی ہو۔

وہ اسی طرح بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مایا......!'' بدر نے پھر اسے پکارا۔

بیری کے درخت سے کوئی پرندہ زور سے اڑا، شاخیں زور سے جھنجھنا کر رہ گئیں۔ چند بیر ٹپ ٹپ ان کے قدموں میں آن گرے۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ زندہ ہے؟'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ بدر کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پہ تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ وہ مر چکا ہے؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے۔'' وہ دبی دبی سے چلائی۔

''منگل سنگھ نے مرنے سے پہلے شیکھر کا نام لیا تھا۔'' بدر نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ''میں قبرستان کے قریب سے گھوڑے پہ گزر رہا تھا۔ مجھے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں گھوڑے سے اتر کر اندر آیا تو خون کا دریا تھا اور منگل سنگھ تڑپ رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ اس کا چہرہ

تھپتھپایا، مگر اس کی آخری سانسیں تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''چوہدری تجھے کس نے مارا ہے؟ تو ادھر کیوں آیا تھا؟''

وہ ہاتھ اٹھا کر بمشکل بولا۔ ''وہ بھوت.......''

''تجھے بھوت نے مارا ہے؟ کون تھا وہ؟''

منگل سنگھ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''وہ بھوت نہیں......وہ، شیکھر......'' بس یہی الفاظ میں سمجھ سکا، اس نے مرنے سے پہلے شیکھر کا نام لیا تھا۔

''کیا پتہ منگل سنگھ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔'' وہ یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''مرتا آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''مگر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ شیکھر زندہ ہے؟''

''اور تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ شیکھر مر چکا ہے۔'' وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

''بدر!'' وہ صدمے سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا؟''

''میں امرتسر میں تھی اور جب تک میں وہاں پہنچی اس کی چتا جل چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا بدر! وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔''

وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی خالی تھی، مگر تتلی کے رنگ اس میں رہ گئے تھے۔

''میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، مگر ایک گواہی دل دیتا ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے میری مٹھی میں بند تتلی جانے کب مر گئی۔ میں نے وہ مری ہوئی تتلی نہیں دیکھی، مگر مجھے اس کے یہ بکھرے رنگ بتاتے ہیں کہ وہ مر گئی ہے۔''

مایا نے ادھر اُدھر زمین کو دیکھا، مردہ تتلی وہاں نہیں تھی۔ ہوا کا کوئی جھونکا اسے اڑا کر دور لے گیا تھا۔

''مایا! شیکھر کا مردہ چہرہ تم نے تو کیا گاؤں میں کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کو اس کی گھڑی سے پہچانا گیا۔ کیا تمہیں یہ سب بہت زیادہ سادہ لگتا ہے؟ وہ ادھر اس کی موت ہوئی اور ادھر اس کی چتا جلا دی گئی۔''

''ٹھاکر رگھوناتھ کہہ رہے تھے کہ لاش کی حالت بہت خراب تھی، سو اسی لئے ایسا کرنا پڑا۔''

بدر نے استہزائیہ سر جھٹکا اور منڈیر پر دونوں ہاتھ رکھے سر جھکا کر کنویں میں جھانکا۔

''یہ سب اتنا سادہ اور قدرتی نہیں ہے، جتنا بتایا گیا ہے۔ ٹھاکروں نے پولیس کو تفتیش نہیں کرنے دی۔ آخر کیوں؟''

''مجھے کیا پتا کیوں؟'' وہ کوفت سے کھڑی ہوگئی۔ ''مگر مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ زندہ ہو سکتا ہے۔''

بدر اب تک منڈیر پر جھکا کنویں میں دیکھ رہا تھا۔ مایا نے بھی اس کی طرح ہاتھ رکھ کر کنویں میں جھانکا۔

سیاہ پانی میں سفید آسمان اور دو سائے نظر آ رہے تھے، ایک مرد کا اور ایک عورت کا، عورت کے سایہ میں اس کے کندھے پہ پڑی چوٹی اور شانوں پر پھیلا دوپٹہ واضح تھا۔

''تم تو کہتی تھی کہ تم میری بات پر یقین کر لوگی۔''

''میں اب بھی یہی کہتی ہوں۔''

''پھر میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہیں؟''

''کیونکہ یہ تمہاری نہیں، منگل سنگھ کی ہے۔''

''مرتا آدمی جھوٹ نہیں بولتا لیڈی شیکھر!'' وہ سیدھا ہو کر تلخی سے بولا۔ مایا پانی کو دیکھ رہی تھی، وہاں صرف ایک سایہ تھا، جھکی ہوئی عورت اور اس کی کندھے پر پڑی چوٹی۔

''اور میں مرنے والے آدمی کے سچ پر تب تک اعتبار نہیں کروں گی، جب تک میں شیکھر کو نہیں دیکھ لیتی۔ ورنہ میرے لیے وہ مر چکا ہے۔''

عورت کے سایہ کے اوپر سے پرندوں کے غول کا سایا اڑ رہا تھا۔ مایا نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہاں کوے ایک غول میں شمال کی جانب اڑتے جا رہے تھے۔

''جس دن شیکھر کی موت واقع ہوئی تھی، اس دن وہ کہاں تھا؟''

''میں اس روز امرتسر میں تھی مجھے نہیں معلوم۔'' یک دم ہی وہ تیزی سے بولی، لہجہ تلخ ہو گیا۔

بدر اسی طرح سامنے سرخ کناروں والے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔

''سب کیا بتاتے ہیں؟ وہ آخری بار کدھر گیا تھا۔''

''مجھے معلوم نہیں ہے۔'' وہ سینے پہ ہاتھ باندھے کنویں سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
''کسی ملازم نے کچھ تو بتایا ہوگا۔''
''معلوم نہیں۔'' وہ بھی اب سرخ بادلوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ ''ہاں روپا نے آخری دفعہ اسے کچے راستے پہ دیکھا تھا، کھوجی نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ مہمان خانے میں جانے سے قبل پرانے قبرستان کی طرف۔'' ایک دم وہ رک گئی اور بدر کو دیکھا، وہ بھی جیسے چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر مایا نے سر جھکا دیا۔ شاید اس نے ہار مان لی تھی۔
''شیکھر مرنے سے پہلے پرانے قبرستان گیا تھا؟'' بدر نے دہرایا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح سر جھکائے قدموں میں بکھرے کچے بیر دیکھتی رہی۔
''کیا تمہیں اب میری بات کا یقین ہے؟''
مایا نے تھکے تھکے انداز میں سر اٹھایا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی۔
''واقعی بدر؟ کیا وہ زندہ ہو سکتا ہے؟''
''اگر وہ ہوا تو ہمیں خوشی ہوگی۔''
اس کے گم صم سے چہرے پر مغموم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ غور سے اس کے چہرے پہ اترتی خوشی کی رمق کو جانچ رہا تھا۔
''بہت محبت تھی تمہیں اس سے؟''
''ہے، ابھی تک اتنی ہی ہے، اگر وہ زندہ ہے تو کیا تم میرا شوہر ڈھونڈنے میں میری مدد کرو گے۔''
''ہاں، کیوں نہیں ضرور۔'' وہ پھیکا سا مسکرایا۔
''مگر یاد رکھنا منگل سنگھ کے قاتل کے ساتھ نہ میری ہمدردی ہوگی اور نہ تمہاری ہونی چاہئے۔''
اس کے سخت لہجے پہ مایا نے ٹھٹک کر بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا، بہت تفاخر سے مسکرائی۔
''تم جلتے ہو شیکھر سے؟'' اٹھی ہوئی گردن، جتاتا ہوا مغرورانہ انداز، وہ بھی ایک ادا لیے

ہوئے، وہ اتنا مسحور تھا کہ تردید بھی نہ کر سکا۔
وہ اسے ٹھیک کہتا تھا، وہ واقعی ملکہ تھی، بیلی راجپوتاں کی ملکہ۔
''تمہیں شیکھر سے کوئی رقابت نہیں ہونی چاہئے۔'' اس نے چوٹی کندھے سے کمر پر پھینک دی۔
''لیکن اگر اس نے کچھ غلط کیا ہے تو اس کی سزا اسے ملے گی۔ لیکن اگر وہ بھوت شیکھر ہے تو مجھے یقین ہے وہ کچھ غلط نہیں کر سکتا۔''
''اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔''
مایا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سرخ بادل بکھرتے جا رہے تھے۔
''شام ڈوبنے کو ہے، میں چلتی ہوں۔'' پھر جاتے جاتے مڑی۔ ''سنو مجھے حویلی تک چھوڑ آ ؤ گے؟ مجھے تمہارے بیلی راجپوتاں کے رستے نہیں آتے۔''
وہ مسکرا کر اس کے ساتھ چل دیا۔
''راستے نہیں آتے تو یہاں تک کیسے پہنچی تھیں؟''
وہ جھینپ کر ہنس دی۔ ''میں تو راستہ بھٹک کر اِدھر مدد کی تلاش میں بیٹھی تھی، ورنہ تمہیں لگتا ہے راجپوت اپنی بہو بیٹی سے پانی بھروائیں گے؟''
وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے، یہاں تک کہ کھیت سامنے آ گئے۔
وہ وہیں رک گیا۔
''لیجئے لیڈی شیکھر، آپ کی حویلی سامنے ہے۔''
''اندر تک نہیں آ ؤ گے؟''
وہ کھیتوں کے ساتھ کھڑے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے اور یہ منظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے ٹھاکر گوپال راج نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ جگہ وہاں سے اتنی دور نہ تھی۔
''اندر آنے کا فائدہ۔''
''راجپوتوں کی مہمان نوازی کا لطف نہیں لو گے؟''
وہ تلخی سے مسکرا دیا۔ کچھ بولا نہیں۔ مایا نے اس کے پیچھے کھیتوں کے اس پار کچے راستے کو دیکھا، جو دور تک جاتا تھا۔ وہاں سے پرانا قبرستان نظر نہیں آتا تھا مگر قبرستان کی عجیب خوفناک اور

پُراسرار فضا پورے کچے راستے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی، جیسے دھول مٹی کی اس پگڈنڈی پہ اَن دیکھی روحیں سفید لبادوں میں اڑتی پھر رہی ہوں۔

مایا نے ایک جھرجھری لی اور واپس تیزی سے حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔ بڑے گیٹ کے سامنے حویلی کی واحد موٹر کھڑی تھی۔ اس نے رُک کر معنی خیز مسکراہٹ سے جیپ کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

وہ جو کچھ ٹھاکر گوپال راج کو دکھانا چاہتی تھی، دکھا چکی تھی۔

***

گوپال سے اس کا سامنا کھانے کی میز پہ ہوا۔ حویلی میں پہلے جانے کھانے کا کیا طریقہ کار تھا مگر جب سے مایا آئی تھی، اس نے کھانا ہمیشہ ڈائننگ ہال میں لکڑی کی قیمتی ڈائننگ ٹیبل پہ لگتے دیکھا تھا۔ شاید وہ ڈائننگ ہال محض انگریز و شہری مہمانوں کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔

وہ خاموشی سے رکابی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ٹھاکر رگھوناتھ اور گوپال آگے پیچھے داخل ہوئے۔

''نمسکار دیوی!'' ٹھاکر رگھوناتھ نے کرسی کھینچتے ہوئے سادہ انداز میں کہا۔ مایا نے سر اٹھایا۔

''گڈ ایوننگ۔'' اور سر جھکا کر پھر سے کھانے لگی۔ حویلی میں کوئی کسی کا کھانے پہ انتظار نہیں کرتا تھا۔ ٹھاکر رگھوناتھ نے اسے کہہ رکھا تھا کہ وہ انتظار کیا بھی نہ کرے۔ وہ نہ بھی کہتے تو بھی وہ راجپوتوں کا انتظار کرنے والی عورت نہیں تھی۔ وہ اپنے سب کام وقت پر کرتی تھی، بنا کسی کی مداخلت یا انتظار کے۔

گوپال خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

مایا آرام سے پلیٹ میں موجود چاول ختم کرتی رہی۔

''کل پٹواری آئے گا، نہر والی زمین کا سودا ہو گیا ہے، مناسب دام مل رہے ہیں۔ اس سے زیادہ آپ سے اس علاقے میں کوئی زمین نہیں خریدے گا۔'' وہ مصروف سے انداز میں بتا رہے تھے۔

''بہت بہتر۔'' وہ رکابی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور نزاکت سے چہرے پر آئے بال

ہٹائے۔ ''کون خرید رہا ہے وہ زمین؟''

''میں!'' گوپال نے سر اٹھا کر فاتحانہ نگاہ سے اسے دیکھا۔ ٹھاکر رگھوناتھ مصروف سے انداز میں کھانا کھا رہے تھے۔

وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

''آپ؟ مگر کیوں؟'' اس کے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

''آپ کو وہ زمین تو بیچنی ہے نا؟''

''مگر وہ آپ کو نہیں بیچنی۔''

''کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کو بیچنی ہے۔ دام تو آپ کو ایک ہی ملیں گے۔'' وہ لاپروائی سے کہا رہا تھا۔

''اور مجھے یہ کون بتائے گا کہ بہترین دام کون سے ہیں؟'' وہ سخت نگاہوں سے یک ٹک گوپال کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو پتا جی پہ اعتبار ہونا چاہیے۔''

مایا نے ٹھاکر کو دیکھا، وہ ابھی تک انہاک سے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ مضطرب سی ہو کر کھڑی ہوئی۔

''مگر میں وہ زمین آپ کو نہیں بیچنا چاہتی چھوٹے ٹھاکر صاحب!'' اس کی آواز میں غصہ اتر رہا تھا۔

گوپال نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، مگر ٹھاکر رگھوناتھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

''آرام سے مایا بٹیا!'' ان کے لہجے کی شفقت میں مصنوعی پن تھا۔ ''اگر آپ نہیں بیچنا چاہتیں تو ٹھیک ہے، ہم کسی اور پارٹی سے بات کر لیں گے۔ آپ اپنی ڈیمانڈ بتا دیں۔''

''میں مشورے کے بعد بتاؤں گی۔''

''ہاں آپ پٹواری سے مشورہ......''

''میں اپنے شوہر سے مشورے کے بعد بتاؤں گی۔''

ٹھاکر رگھوناتھ کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔

پورے ڈائننگ ہال میں سناٹا چھا گیا۔

وہ تیز تیز چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔

''آپ شادی کر رہی ہیں۔'' دونوں باپ بیٹا ہکا بکا اسے دیکھ رہے تھے، بمشکل ٹھاکر رگھوناتھ کے منہ سے نکلا۔

* * *

زہرہ تھال میں چاول لیے مگن سی گنگناتی ہوئی، بالائی منزل کے بڑے سے برآمدے سے گزر رہی تھی، ایک دم ٹھٹک گئی۔

نیچے بڑے سے دالان کے کونے میں پیپل کے گھنے درخت کے ساتھ جھولا بندھا تھا اور بدر اس جھولے کے ساتھ کھڑا تھا۔

اسے لگا جھولے پہ کوئی بیٹھا ہے۔ وہ چند قدم آگے آئی اور ریلنگ سے نیچے جھانکا۔ نیچے کا منظر دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

وہ مایا تھی میم صاحب۔

تھال پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بہت شاہانہ، مطمئن سے انداز میں جھولے پہ بیٹھی تھی۔ جھولا ہولے ہولے جھول رہا تھا۔

اس نے سفید اسکرٹ، سفید بلاؤز جس کی آستین کلائی تک آتی تھی، پہن رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریز شرفاء کی عورتوں میں خود کو مکمل طور پر ڈھانپنے کو شرافت اور خاندانی پن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ابھی دوسری جنگ عظیم نہیں ہوئی تھی اور جلد ظاہر کرنے کا رواج نہیں پڑا تھا۔

اس کی گود میں سفید رنگ کا ہیٹ پڑا تھا، وہ ہیٹ گود میں رکھے ہولے ہولے جھولے لے رہی تھی۔ سنہری بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ موتیوں کی لڑی سامنے کو تھی اور وہ خود گردن اٹھائے مقابل کھڑے بدر سے ہنستے ہوئے کوئی بات کر رہی تھی۔

بدر کی زہرہ کی جانب پشت تھی، وہ بھی گرد و پیش سے بے خبر اس کی جانب متوجہ تھا۔

وہ ست قدموں سے چلتی ہوئی برآمدے تک آئی، جہاں چاچی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''بڑی دیر کر دی زہرہ!''

اس نے بنا جواب دیے تھال چاچی کو تھما دیا اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر جھولے کا منظر

دیکھنے لگی۔ برآمدے کے کونے پہ نیچے لگے پیڑ کا سرا پہنچ رہا تھا اور سایہ تھا، پتوں سے لدی شاخیں برآمدے میں جھک کر آ رہی تھیں۔ وہاں سے مایا، بدر اور پیپل کے درخت کے ساتھ بندھا جھولا شاخوں کے بیچ جھروکوں سے نظر آ رہا تھا۔ زہرہ اسی طرح بدر کو دیکھے گئی۔ اس نے درمیان سے پتے نہیں ہٹائے، درمیان میں بہت کچھ آ گیا تھا، وہ کیا کیا ہٹاتی؟

''ادھر کیا دیکھ رہی ہے زہرہ؟'' چاچی چاول صاف کرتی سر جھکائے بولی تو اس نے گردن پھیر کر چاچی کو دیکھا، پھر کچھ بتانے کے لیے لب کھولے، مگر رُک گئی۔ چچی سر جھکائے بیٹھی تھیں اور دالان کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ یہ منظر پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔

''کب آئی یہ......؟''

''ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔'' چاچی عام سے لہجے میں کہہ کر چاول سے کنکر چنتی رہیں۔

''اور کیوں آئی ہے یہ ادھر؟''

وہ ریلنگ کی جانب سے رخ موڑ کر چاچی کی طرف چہرہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ چاچی نے سر جھکایا۔ اب زہرہ کی پشت پہ چاچی کو صرف جھکی شاخیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مایا، بدر اور جھولا چھپ گئے تھے۔

''کوئی کام ہوگا اسے بدر سے۔'' بہت دیر بعد چاچی بولیں۔

''بدر کب سے راجپوتوں کے کام کرنے لگ گیا؟'' وہ چمک کر بولی۔

''وہ راجپوت نہیں ہے میری دھی! وہ فرنگی ہے۔''

''بدر کو تو فرنگی کبھی اچھے نہیں لگے۔ خود تو کہتا تھا، یہ فرنگی ہم پہ غاصب ہیں اور ہم ان کے غلام۔''

''اس میں میم صاحب کا کیا قصور؟''

''قصور ہے۔'' غصے سے بولتے بولتے زہرہ کا گلا رندھ گیا۔ ''وہ بدر کو اپنی طرف مائل کر رہی ہے۔''

''وہ بچہ ہے جو مائل ہو جائے گا؟''

''بچے مائل نہیں ہوتے چاچی! جوان مرد ہو جاتے ہیں۔''

''نی جھلی! تو اس کو نظر انداز کر، وہ کون سا ہمیشہ کے لیے یہاں آئی ہے۔'' چاچی پُرسکون سی

کنکر چن کر ایک طرف کر رہی تھی۔

''وہ جلد ہی انگلستان واپس چلی جائے گی۔''

''نہیں چاچی! وہ بدر کو لے کر ہی انگلستان جائے گی۔''

''کیا انگلستان میں مرد ختم ہو گئے ہیں جو وہ ہندوستانی ساتھ لے جائے گی۔''

''شیکھر بھی تو ہندوستانی مرد تھا۔'' زہرہ کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

''شیکھر کی اور بات تھی دھی، وہ ہندو تھا اور بدر مسلمان ہے۔ یہ لڑکی ہندو ہے۔''

''نہیں یہ عیسائی ہے، مجھے بدر نے خود بتایا تھا۔''

''جانے دے زہرہ تو بھی کس کا غم کرتی ہے۔ یہ گھر بسانے والی عورت نہیں ہے۔ یہ اور طرح کی عورت ہے۔ تیری چاچی نے بھی دنیا دیکھ رکھی ہے۔ اس کے ناز و انداز غور سے دیکھ، محبت وحبت کے چکر میں پڑنے والی نہیں۔''

زہرہ نے پلٹ کر نیچے دالان کو دیکھا۔

پیپل کے ساتھ بندھا، ہولے ہولے ہلتا جھولا خالی پڑا تھا۔ بدر اکیلا اس کے ساتھ کھڑا، جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔

''وہ چلی گئی چاچی!'' زہرہ نے اطمینان سے گہری سانس خارج کی، دل کو جیسے ڈھیروں سکون ملا تھا اور پھر اس سکون کے ساتھ وہ واپس چاچی کی طرف مڑی اور تب اس نے دیکھا مایا سامنے چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

زہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کیا اور کتنا سن چکی تھی۔ اس نے شرمندہ سی نظر مایا پر ڈالی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ سا مسکراتا تھا، زہرہ کچھ اندازہ نہ کر پائی۔

چاچی بھی اسی قدر شرمندگی سے مایا کو دیکھ رہی تھی۔ چاولوں کا تھال اس نے کب کا نیچے رکھ دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی زہرہ کے قریب آئی اور اس کے بالکل مقابل رک گئی۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

نیچے جھولے کے ساتھ کھڑے بدر نے اوپر گردن اٹھا کر دیکھا۔ پیپل کے پیڑ کی اوپری شاخوں کے پار اسے ریلنگ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں برآمدے میں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک

سیاہ شلوار قمیص اور رنگ دار پراندے والی زہرہ بتول اور اس کے سامنے سفید سکرٹ بلاؤز اور سنہری بالوں والی مایا فرینڈس۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے ان دونوں کے چہروں کا موازنہ کیا۔ تیل لگے بالوں کا پراندہ بنائے، چہرے پہ چند جھولتی لٹوں والا گندمی چہرہ اور...... دوسرا، سنہری آنکھوں والا چہرہ، جس پہ ہیٹ کے چھجے سے جالی دار نقاب گر رہا تھا۔

یہ سامنے کی بات تھی کہ زہرہ زیادہ خوب صورت تھی اور یہ بھی سامنے کی بات تھی کہ اس فرنگی لڑکی میں کوئی ایسا طلسم ضرور تھا، جس کے سامنے بیلی راجپوتاں کی سب سے سندر لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جب وہ کسی جگہ ہوتی تو بس وہی وہاں ہوتی تھی، باقی ہر فرد، ہر ذی نفس پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ وہ راج کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی، اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا۔

بدر کو مایا کے ہلتے ہوئے لب دکھائی دیئے، مگر اتنی دور سے وہ الفاظ نہیں سن سکتا تھا۔ سن بھی لیتا تو سمجھ نہ پاتا۔ انہیں سمجھنے کے لیے ابھی اسے بہت وقت اور تجربہ درکار تھا۔

"تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ! تمہاری چاچی ٹھیک کہتی ہے۔" وہ سنہری آنکھوں سے زہرہ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ لبوں پہ وہی معصوم، خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ "مایا گھر بسانے والی عورت نہیں ہے۔ مایا تو بہت مختلف عورت ہے، اس کی دنیا بہت الگ ہے، تم سب سے بہت الگ۔"

زہرہ پلک جھپکے بغیر اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھے گئی۔

"مایا کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کرتی، متوجہ نہیں کرتی، کھینچتی نہیں ہے، لوگ خود ہی کھینچے چلے آتے ہیں۔ وہ مایا کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں، مایا کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔ مایا انہیں اپنے ساتھ چلنے دیتی ہے، مگر ان کا ہاتھ کبھی نہیں تھامتی۔ ہاتھ تھامے گی تو جب بچھڑیں گے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور مایا دل توڑنے ہندوستان نہیں آئی۔ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے راستے پہ چلنے دیتی ہے۔ تم برا مت مانو، آخر کتنی دیر وہ اس انجان راستے پر چلتے رہیں گے؟ کب تک اس کے قدم سے قدم ملاتے رہیں گے؟ مایا کا راستہ تو بہت الگ، بہت جدا ہے، بہت جدا ہے۔ وہ کتنی ہی دور اس کے ساتھ کیوں نہ چل لیں، کیا فرق پڑ جائے گا؟ مایا تو ایک دن اس راستے پہ چلتے چلتے اڑنے لگے گی، تب وہ کیا کریں گے؟ اڑنے کے لیے پر کہاں سے لائیں گے؟ مایا نے جب ہاتھ نہیں تھاما تو پر کیسے دے گی؟"

زہرہ چپ چاپ اسے سنے گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ وہ کسی کو مائل نہیں کرتی۔ لوگ خود ہی کچی ڈوری سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

آج بہت دنوں بعد زہرہ کو مایا بری نہیں لگی تھی۔ اس کو اس سے نفرت، رقابت اور حسد محسوس نہیں ہوا تھا۔ آج پہلی دفعہ اسے وہ بے ضرر لگی تھی۔ وہ اسی طرح گم صم سی سفید جالی کے پیچھے موجود مومی چہرے کو دیکھے گئی۔ پر کیا فرق پڑتا تھا، اگر وہ زہرہ سے زیادہ حسین نہیں تھی تو؟ وہ تو ساحرہ تھی اور زہرہ کو سحر کرنا کہاں آتا تھا؟

''تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ!'' وہ مسکرائی اور پھر پلٹ کر واپس سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کی لمبی سکرٹ زینوں پہ اس کے پیچھے پھسلتی گئی۔ زہرہ پتھر کا بت بنی گم صم سی سیڑھیوں کے کنارے پہ پڑے پردے کو ہلتا دیکھتی رہی۔

وہ نیچے آئی تو بدر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

وہ بے نیاز سے انداز میں جھولے پہ بیٹھ گئی۔ جھولا آگے پیچھے ہولے ہولے جھولنے لگا۔

''مایا......'' بدر نے اسے پکارا۔ وہ مڑے بنا بے نیازی سے کیاریوں کو دیکھتی رہی۔

''مل لی زہرہ سے؟''

اس نے جواب نہیں دیا، بس یونہی پھولوں کو دیکھے گئی۔ وہ اسی طرح منتظر سا جھولے کی رسی تھامے کھڑا رہا۔

پیپل کی اوپری شاخوں کے اس پار کھڑی زہرہ اسی طرح کھوئی کھوئی سی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''بہار آ گئی ہے، پھول بہت خوشنما لگتے ہیں تمہارے بیلی راجپوتاں میں۔'' پھر اس نے چہرہ موڑا۔

''تمہاری کزن......''

''زہرہ؟'' بدر نے سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھا۔

''شی از ان لوو دھ یو، ہوں؟'' وہ مسکراتی نگاہ کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

''معلوم نہیں۔'' وہ شانے اچکاتا، انجان بن گیا۔ مایا ہنس پڑی۔

''اداکاری مت کرو۔''

''کیا.....؟'' اس نے پھر بے خبری دکھائی۔

وہ جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چہرہ اس کے بالکل سامنے لے آئی۔

''کم از کم میرے سامنے اداکاری نہ کرو۔ میں تو لندن.....'' ایک دم بولتے ہوئے وہ خاموش ہوگئی۔ بدر نے ادھورے فقرے پہ دھیان نہیں دیا۔

''صحیح!'' وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''خیر، میں کچھ کہہ رہا تھا۔''

''کب؟''

''اب تم انجان بن رہی ہو۔''

''تم بہت کچھ کہتے ہو، میں کس کس کا حساب رکھوں؟''

بدر نے کچھ کہنا چاہا، پھر جیسے ارادہ بدل کر بولا۔ ''ابھی زہرہ کو دیکھ کر ملنے چلے جانے سے پہلے، میں تم سے پوچھ رہا تھا، تم اس روز رات کو شیکھر میرا مطلب ہے.....'' سنبھل کر وہ وضاحت کرنے لگا تھا، مگر وہ برا مان گئی تھی۔

''تم کیوں سمجھتے ہو شیکھر ایسا کر سکتا ہے؟ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جب تک میں اس چغہ پوش کو اپنے سامنے نہیں دیکھ لیتی، مجھے یقین نہیں آئے گا کہ وہ شیکھر ہی ہے۔''

''تم نے اس روز اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔''

''میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ چغہ پوش ہی تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ملازم وغیرہ ہو، جو رات کو کسی کام سے گودام کی طرف جا رہا ہو۔''

''آدھی رات میں ملازم کا گودام میں کیا کام؟ شام کے بعد نوکر وغیرہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، اتنی رات گئے کوئی حویلی کا فرد ہی.....''

''بہرحال جب تک ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ کون ہے، تب تک تم اسے شیکھر نہیں کہو گے۔'' مایا کا لہجہ ٹھوس اور حتمی تھا۔ بدر بے ساختہ زخمی سا مسکرا دیا۔

''اتنی محبت ہے تمہیں اس سے؟''

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''تم کیوں جلتے ہو؟''

''میں کیوں جلوں گا؟'' وہ پھر سے انجان بن گیا۔

''جیسے میں نہیں جانتی۔''

''کیا......؟'' وہ چونکا۔

''بھرم رہنے دو، اسے مت توڑنا'' وہ مبہم سا مسکرائی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔'' وہ اس رات گودام گیا تھا، آؤ چل کر گودام دیکھ آتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

''میرے ساتھ حویلی چلو، دیکھتے ہیں کہ گودام میں کیا ہے۔ جگہ دیکھ کر ہی علم ہو جائے گا کہ آج کل وہ کس طرح استعمال ہو رہا ہے۔''

''مگر میں راجپوتوں کی حویلی نہیں جاتا۔''

''آج تم جاؤ گے۔'' وہ جواب سنے بغیر حکم صادر کر چکی تھی اور پھر بدر کو اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

پیپل کی جھکی شاخوں کے اس پار سے زہرہ نے دیکھا، وہ دونوں ہنستے، مسکراتے، باتیں کرتے، مطمئن سے ساتھ ساتھ روش پہ چلتے ہوئے دور جاتے جا رہے تھے۔

اور پھر زہرہ چونکی۔ مایا نے بدر کا ہاتھ نہیں تھام رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے مایا کی باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

دروازے تک پہنچ کر بدر نے معذرت کر لی۔

''ابھی میرے لیے راجپوتوں کی حویلی جانا ممکن نہیں، لیکن میں آپ کی اس چہرہ پوش کو ڈھونڈنے میں مدد ضرور کروں گا۔''

''اپنی کزن کا خیال رکھنا۔'' جاتے سمے کہے گئے اس کے الفاظ پہ وہ بعد میں کافی دیر غور کرتا رہا تھا۔

* * *

وہ اپنے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پہ بندھے تھے۔ بال چوٹی میں مقید تھے اور چہرے پہ سوچوں کا جال بچھا تھا۔ وہ کافی دیر سے اسی طرح ٹہلتے ہوئے کچھ سوچے جا رہی تھی، پھر تھک کر پلنگ پہ بیٹھ گئی۔

مہاراجہ پلنگ بھاری آبنوسی لکڑی کا بنا تھا، بڑے بڑے موٹے پائے شیشم کے بنے تھے۔

چاروں کونوں پہ لگے آبنوسی ڈنڈوں پہ پیتل کا کام نقش تھا اور ڈنڈوں سے جڑی پٹیوں پہ گلابی یوت کے پردے گر رہے تھے۔

"روپا!" کچھ سوچ کر اس نے آواز دی، جانتی تھی کہ روپا آس پاس ہی ہوگی اور بوتل کے جن کی طرح وہ واقعی اگلے ہی لمحے دروازے پہ تھی۔

"جی میم صاحب!"

"مجھے قلم دوات، بلکہ صرف کاغذ لا دو اور ایک خط کا لفافہ بھی۔" کہہ کر وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل تک آئی اور دراز کھول کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

جب تک اس نے قلم ڈھونڈا، روپا کاغذ اور لفافہ لے کر حاضر ہو چکی تھی۔

"ایک رقعہ لکھ رہی ہوں، احتیاط سے بدر غازان تک پہنچانا ہے۔" وہ کاغذ میز پہ رکھے تیزی سے انگریزی میں کچھ لکھ رہی تھی۔

"مگر دھیان رہے، کوئی پڑھے نا، احتیاط سے چھپا کے لے کر جانا۔"

رقعہ لکھ کر اس نے کاغذ کی دو تہیں لگائیں، اسے لفافے میں ڈالا اور لاکھ سے سربمہر کر دیا۔

روپا لفافہ لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سوچتی نگاہوں سے قلم کو تکتی رہی، پھر گہری سانس لے کر سر میز پہ رکھ دیا۔

روپا ساڑھی سنبھالتی، لفافہ ہاتھ میں دابے، زینہ اتر کر آئی تو دیوان خانے میں پہلا سامنا گوپال سے ہوا۔

"کدھر جا رہی ہو؟" ابھی اس کی نگاہوں میں لفافہ نہیں آیا تھا، مگر روپا نے خود سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"میم صاحب نے یہ بدر غازان کے لیے دیا ہے۔" گوپال کے لب بھنچ گئے۔ اس نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ "اور اندر آؤ" کہتا تیز تیز ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نہایت بے رحمی سے لفافہ چاک کیا، اندر صاف کاغذ پہ لکھا چھوٹا سا پیغام تھا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔ اس بدھ وار گوپال شکار پہ چند روز کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میں پرانے قبرستان میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اس بھوت کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے اگر شب

باشی ادھر کرنی پڑی تو کوئی مضائقہ نہیں، تم تیار رہنا۔

فقط مایافرینڈس

گوپال کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے نہایت نفاست سے لفافے کو دوبارہ سربمہر کیااور روپا کے ہاتھ میں تھمادیااور ساتھ پانچ روپے بھی۔

روپا خاموشی سے دونوں اشیاء سنبھالے باہر نکل گئی۔

''یہ راستے میں کسی نے پڑھا تو نہیں؟'' بدر نے رقعہ پڑھ کر قدرے فکرمندی سے پہلی بات یہی پوچھی تھی۔

''ایسی جرات ہے کسی کی مہاراج! کہ وہ آپ کا رقعہ پڑھے؟''

وہ مطمئن ہو گیااور جواب میں مثبت اشارہ اور انعام دے کر اسے رخصت کر دیا۔

روپا نے جب واپس حویلی میں قدم رکھے تو گوپال اس کا منتظر تھا۔

''کیا کہا اس نے؟'' لہجہ نفرت و چبھن سے بھرپور تھا۔

''یہی کہ جواب مثبت ہے۔''

''بہت خوب، اب جا کر میم صاحب سے بولو کہ ڈی سی بہادر ان سے ملنے آئے ہیں۔ وہ نیچے ڈرائینگ روم میں آجائیں۔''

وہ کہہ کر خود بھی اس طرف چلا گیا۔

روپا اس تک آئی تو وہ ابھی تک منتظر سی ٹہل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر چہرے پہ خوشی کی رمق آئی۔

''بہت دیر کر دی روپا دیوی! کیا کہا اس نے؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا جواب مثبت ہے۔ مجھے دس روپے بھی بطور انعام دیے ہیں اور ہاں، ٹھاکر گوپال نے کہلا بھیجا ہے کہ ڈی سی صاحب آپ سے ملنے کے واسطے آئے ہیں، نیچے آجائیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔''

''گوپال حویلی میں ہے؟'' مایا کے چہرے پہ تفکر ابھرا۔

''اس نے رقعے کی بابت کوئی سوال تو نہیں کیا؟''

''ہرگز نہیں، انہیں تو علم بھی نہیں۔''

''بہت بہتر، تم جاؤ، میں ذرا ٹھہر کر آتی ہوں۔''

وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھا کرنے لگی، پھر آنکھوں میں کاجل گہرا کیا اور ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر چلی آئی۔

زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو گوپال اور جان کارلس اس کے منتظر تھے۔

''شام بخیر لیڈی فرینڈس!'' جان کارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ دائیں ٹانگ بائیں پہ رکھ لی، آج پھر مقابل اس کی جوتی کی نوک پہ تھے۔

''فرمائیے ڈی سی بہادر کیوں زحمت کی؟'' اس کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔

''اس روز انسپکٹر شاہ نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ نے شیکھر راج کے قتل کے کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں اَپ ڈیٹڈ رہنے کی درخواست کی تھی، پولیس تحقیق کر رہی ہے کہ شیکھر کی کس کے ساتھ دشمنی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں چند تنازعات سامنے آئے ہیں۔ انسپکٹر شاہ نے تو ان کو شاید اتنی اہمیت نہیں دی، مگر ٹھاکر گوپال کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک تنازع آپ کی نظر میں ضرور آنا چاہیے۔

مایا نے ایک کٹیلی نگاہ گوپال پہ ڈالی۔ وہ زہر میں بجھی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں فتح کا رنگ غالب تھا۔ جانے ایسا کیا کہا تھا، وہ قدرے بے چین ہوئی۔

''کون سے تنازعات؟''

* * *

جان کارلس نے کوٹ کی شکن درست کی اور ایک فائل اس کے آگے کی۔

''یہ تفصیل ہے۔''

''آپ مجھے زبانی بتا دیجیے۔''

''بہت بہتر لیڈی فرینڈس!'' وہ فائل خود ہاتھ میں لیے، اس پہ نگاہ دوڑاتا کہنے لگا۔ ''یہ نہر کے پار والی زمین کا کیس ہے، شیکھر کا ایک مقامی زمیندار سے اس کی ملکیت کا مقدمہ آج کل عدالت میں ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟'' رک کر فائل سے نظر ہٹا کر کارلس نے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے بے چین و مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ ''کیسا مقدمہ ہے یہ؟''

''شیکھر کی لاکھوں کی ملکیت کی اراضی پہ ایک زمین دار نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس پہ ایک دفعہ خون خرابہ اور متعدد بار جھگڑا ہو چکا ہے۔ زمین شیکھر کی ہے، مگر زمین دار کا کہنا ہے کہ وہ زمین شیکھر سے خرید چکا ہے، شیکھر یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا اور پھر شیکھر مارا گیا۔''

''کون ہے وہ مقامی زمیندار؟''

جان کارلس نے فائل بند کر کے سامنے رکھی۔

''ملک بدر غازان۔''

ماما ایک دم کھڑی ہوگئی، گوپال کے لبوں پہ زہر آلود تبسم گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔

''معاف کیجئے گا۔'' وہ کہہ کر تیزی سے زینے چڑھتے اوپر چلی گئی۔

''کیا ہوا......؟'' جان کارلس حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ گوپال نے طنزیہ نگاہ اس پہ ڈالی۔

''صدمہ لگا ہے اور کچھ نہیں۔'' اور پھر فائل ہاتھ میں لیے صفحے پلٹنے لگا۔

* * *

اور وہ سارا دن اسی سوچ میں غلطاں رہی کہ آخر یہ تنازع پہلے کیوں اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ان چھ ماہ میں شیکھر نے کوئی ذکر کیا، نہ بدر نے۔ وہ شیکھر کا ذکر شروع شروع میں اچھے الفاظ میں کرتا تھا، بعد میں اس نے شیکھر کو چغہ پوش بنا ڈالا تو لہجہ تبدیل ہو گیا۔

''خون خرابہ......مقدمہ عدالت میں......''

جان کارلس کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ وہ پریشان سی کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

''یہ خبیث بڈھا کارلس بھی جانے کیوں......؟'' وہ زیر لب کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی، پھر تھک کر باہر چلی آئی۔

اس کو اس وقت کسی نہ کسی سے اس تنازع کی تفصیلات پوچھنی تھیں اور روپا سے بہتر اسے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

''رتن بوا!'' رسوئی کی چوکھٹ سے اس نے اندر جھانکا۔ ''روپ وتی کہاں ہے؟''

''وہ گھر گئی ہے ٹھاکرائن! اس کی بہن کا بچہ شدید بیمار ہے، اس کی ماں اسے بلانے آئی

تھی۔کوئی کام ہے تو مجھے کہیے۔'' وہ گیلے ہاتھ ساڑھی کے پلو سے پونچھتی فوراً حاضر ہوئی۔

''مجھے اس کے گھر چھوڑ آؤ۔''

''آ......اچھا......'' حکم قدرے حیران کن تھا،مگر رتن بوا کو اب ٹھاکرائن حیران نہیں کرتی تھی۔حویلی کے لوگ اب غالباً اس کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

''پالکی تیار ہے ٹھاکرائن! آپ تشریف لے آئیے۔'' چند ساعتیں گزری تھیں کہ اس نے وہیں چوکھٹ سے لگی منتظر مایا کو مطلع کیا۔

روپا کا گھر قریب ہی تھا،کچا سا،ایک کمرے کا مکان،سامنے بڑا سا صحن،ایک طرف رسوئی،اس میں مٹی کا چولہا۔

صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں،ایک پہ ایک بچہ لیٹا مسلسل رو رہا تھا،ساتھ اس کی ماں بیٹھی اسے چپ کرانے کی کوشش میں لگی تھی۔

دوسری چارپائی خالی تھی۔روپا رسوئی میں بیٹھی چولہے میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔مایا کو دیکھ کر حیران سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میم صاحب! آپ؟ زحمت کیوں کی؟ مجھے بلا بھیجا ہوتا۔'' وہ ہاتھ صاف کر کے اس تک آئی۔

''کچھ پوچھنا تھا،ذرا جلدی سے مجھے۔'' لہجے میں نخوت در آئی تھی،کچھ تکلف اور کر و فر سے وہ چارپائی پہ بیٹھی تھی۔

''حکم کریں میم صاحب!'' روپا بھی حیران سی اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔بچہ ابھی تک روئے جا رہا تھا۔

''بدر اور شیکھر کا آپس میں زمین کے معاملے پہ کوئی جھگڑا تھا؟'' روپا چند ساعتیں خاموش رہ کر بولی۔''ہاں جی،تھا تو سہی۔''

''کمال ہے،تم نے مجھے کبھی آگاہ نہیں کیا۔'' مایا کا موڈ بگڑا تھا۔''خیر معاملہ کیا تھا؟''

''چھوٹے ٹھاکر کی نہر والی زمین پہ ملک بدر غازان کا قبضہ ہے،اسے دعویٰ تھا کہ زمین ٹھاکر نے اس کے ہاتھ فروخت کر دی تھی،مگر ٹھاکر......''

بچہ اب گلا پھاڑ کر رونے لگا تھا۔

''ایک دفعہ زمین پہ جھگڑا ہو گیا تھا، ٹھاکر کے ایک بندے نے چھوٹے ملک کے ایک مزارعے کو برچھی ماردی تھی، وہ مر گیا تھا، چھوٹے ملک نے مقدمہ کر دیا، بعد میں صلح ہو گئی تھی۔''

بچہ اب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بلک رہا تھا۔

''صلح کب ہوئی؟''

''چار سال کی بات ہے۔''

بچہ اب اپنا سر ماں کے گھٹنے سے مارنے لگا تھا، ماں مسلسل اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''صلح کے بعد دوبارہ کوئی لڑائی جھگڑا......''

''چند ماہ قبل زبانی کلامی ایک جھگڑا......''

''یہ بچہ کیوں رو رہا ہے ردپا؟ اسے پہلے چپ کراؤ۔''

بے زاری ہو کر وہ کہنے لگی۔ بچے کا رونا اسے مسلسل تنگ کر رہا تھا، کوئی بات ٹھیک سے کر ہی نہیں پا رہی تھی۔

''بیمار ہے جی......'' ماں گھبرا کر اسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی، مگر وہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

''مگر اتنا کیوں رو رہا ہے؟'' مایا کو بچوں میں دلچسپی کہاں تھی، بس برائے نام پوچھ لیا۔

''اس پہ جادو ہو گیا ہے جی، میری ساس کی بہن نے ٹونا کر دیا ہے۔''

ردپا کی...... بات پہ وہ جیسے تھک کر بولی۔ ''اور یہ کس نے کہا ہے؟''

''شیکھر بابا نے خود کہا ہے جی۔''

مایا نے گردن اتنی تیزی سے اس کی جانب موڑی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔

''شیکھر نے ایسا کہا تھا؟ کب......؟''

''ہاں جی...... نہیں جی۔'' ردپا تصحیح کرنے لگی۔ ''آپ کے ٹھاکر شیکھر نہیں، یہ بابا شیکھر کی بات کر رہی ہے۔''

''بابا شیکھر کون؟'' وہ سانس روکے منتظر تھی۔

''بیلی میں ایک جوگی بابا رہتا ہے، عمل بھی کرتا ہے، توڑ بھی کرتا ہے۔ اس کا نام بھی شیکھر

ہے۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ ذہن میں جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔

"رتن بوا! پالکی تیار ہے؟ مجھے ملکوں کی حویلی جانا ہے، جلدی چلو۔"

روپا حیران، پریشان اسے روکتی رہ گئی، مگر وہ نہیں رکی۔ اسے بدر سے ملنا تھا، ابھی اور اسی وقت۔

پالکی کب روپا کے گھر سے چلی اور کب ملکوں کی حویلی کے سامنے رکی، اسے علم نہ تھا۔ وہ بس اپنے دل و دماغ میں ایک ہی فقرے کی تکرار سن رہی تھی۔

"منگل سنگھ نے مرنے سے پہلے شیکھر کا نام لیا تھا۔"

جب وہ پالکی سے اتری تو اس کی ہتھیلیاں بھنچی ہوئی تھیں اور چہرہ غصے کی تمازت سے دہک رہا تھا۔

اس نے بڑا دروازہ پار کیا، سامنے طویل روش تھی، اس کے اختتام پہ برآمدہ تھا، برآمدے کے سرے پہ اسے بدر کھڑا نظر آیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی قریباً دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

چھت کے برآمدے میں گملے کو پانی لگاتی زہرہ کے ہاتھ ایک لمحے کو پتھر ہو گئے تھے۔

"مایا!" ایک حیرت آمیز بڑبڑاہٹ برآمدے میں کھڑے بدر کے لبوں سے پھسلی تھی، وہ چند قدم آگے روش پہ آ گیا۔ اتنے میں وہ اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا، مایا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ مارا تھا۔

"کاش! میں اتنی عقل مند ہوتی کہ تمہارا اصل چہرہ اس روز پہچان لیتی، جب تم نے ڈھاٹے میں چہرہ چھپائے میرا راستہ روکا تھا۔ میں جانتی تھی کہ بیلی کے ڈاکو کون ہیں، مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی، میں نے یہ بھی نہیں جتایا کہ میں نے تمہاری جان بچائی تھی، مگر تم...... تم آستین میں چھپے وہ سانپ تھے، جو مجھے ڈستے رہے۔" غم و غصے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مایا...... کیا ہوا؟" وہ ششدر سا کھڑا تھا، اتنا ششدر کہ چہرے کو چھونے کو ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکا تھا۔

''مت نام لو میرا...... مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔'' وہ زور سے چلائی تھی۔ ''تم نے کیا سوچ کر شیکھر کا نام لیا، اسے بھوت کہا، اس پہ الزام لگایا، ہاں؟ کیوں نام لیا تم نے میرے پتی کا؟ کیا پورے گاؤں میں صرف ایک شیکھر تھا؟ کیا تم نہیں جانتے تھے، برسوں ادھر رہنے کے باوجود کہ ایک جوگی بھی اسی نام کا اس گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ پھر بھی تم نے میرے شیکھر پہ الزام لگایا۔

وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی اور وہ بت بنا خاموشی سے سنے جا رہا تھا۔

''آج کے بعد تم مجھے اپنی صورت بھی مت دکھانا، نہ میں کسی بدر کو جانتی ہوں، نہ میرا کسی بدر سے کوئی تعلق ہے۔'' وہ مڑ کر تیز تیز چلتی باہر نکل گئی اور وہ اسی طرح ساکت سا وہیں کھڑا رہا۔

زہرہ کے جلتے دل پہ ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ ایک خوب صورت مسکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔ بالآخر وہ بدر کو چھوڑ گئی تھی۔

پالکی میں بیٹھتے ہی ''تھانے چلو'' کے الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے اور جب پالکی نے اسے تھانے کے سامنے اتارا، تب بھی اس کا سندر چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

کھٹ کھٹ کرتی کسی کے روکنے پہ رکے بغیر وہ اندر آ گئی۔ انسپکٹر شاہ قلم سنبھالے ایک کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا، آہٹ پہ سر اٹھایا اور اسے دیکھ کر چونکا۔

''میم صاحب آپ؟'' وہ کاغذ قلم رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تشریف رکھئے، خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' وہ بیٹھی نہیں، اسی طرح کھڑی رہی۔

''کہئے، کیا ہوا ہے؟'' انسپکٹر بیٹھ گیا اور ایک نیا کاغذ نکال لیا۔

''ایف آئی آر کاٹو۔''

''کس کے خلاف؟''

''نیلی راجپوتاں کے بھوتوں کے خلاف۔'' وہ دانت پہ دانت جما کر بولی۔

''نیلی میں بھوت ہیں کیا؟''

''میں نے دیکھے ہیں۔''

''کب؟ کدھر؟'' انسپکٹر شاہ کا جرح کرتا، پے در پے سوال کرتا چیلنج کرتا انداز ایسا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والی تھی، یکلخت رک گئی۔

سوال کا جواب نہ پا کر انسپکٹر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، جو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔
یہ جرح کرتا انداز...... اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... مایا کو ایک دم کچھ یاد آیا۔
اندھیرا جنگل...... ساکن بگھی...... راہزن اور وہ آواز۔ ''اسے جانے دو نادر! یہ بیلی راجپوتاں کی ملکہ ہے۔''
اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس کی نگاہیں بے اختیار انسپکٹر کے نام کی تختی پہ جھک گئیں۔ ''انسپکٹر نادر شاہ۔''
پزل کے سارے ٹکڑے جڑنے لگے، تصویر سامنے آنے لگی۔
وہ گہری سانس لے کر میز پہ جھکی۔
''پرچہ کاٹو انسپکٹر نادر شاہ اور میرے نامزد مشتبہ افراد کی فہرست اس میں لکھو۔''
''لکھوائیے مادام!'' وہ قلم ہاتھ میں لیے منتظر تھا۔
''لکھو بیلی کے ان سب بھوتوں کا نام جو راتوں کو ڈھاٹے باندھ کے شرفاء کی عورتوں کو لوٹتے ہیں اور دن چڑھے معززین بن جاتے ہیں۔ اندھیرے میں قبرستان کو کھودتے ہیں اور دن میں خود واویلا کرتے ہیں، تم سب ایک ساتھ ملے ہوئے ہو اور سب نے مل کر شیکھر کو مارا ہے۔ لکھو، مجھے شک ہے ٹھاکر رگھوناتھ پہ......''
نادر شہ سر جھکائے تیزی سے لکھتا جا رہا تھا۔
''اور لکھو، ٹھاکر گوپال راج...... اور......''
''اور......؟'' مصروف سے منتظر انداز میں نادر شاہ نے استفسار کیا۔
''اور بدر غازان!''
نادر شاہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
''بدر غازان؟ آپ ہوش میں تو ہیں میم صاحب!''
''پہلے نہیں تھی، مگر اب آ گئی ہوں۔'' وہ اسی طرح میز پہ جھکی ہاتھ رکھے طنز سے بولی۔
''آپ ایک شریف آدمی کو مشتبہ نامزد کر رہی ہیں۔''
''آپ شریف کسے کہتے ہیں؟''
''آپ کسے کہتی ہیں؟''

''کم از کم اسے نہیں، جو تمہارا دوست ہے۔''

''دیکھیں میم صاحب!'' وہ ہاتھ اٹھا کر سختی سے بولا۔

''جب میں اس وردی میں ہوتا ہوں تو مجھے کوئی پروا نہیں ہوتی کہ میرے کسی سے کیسے ذاتی تعلقات ہیں، میں اصول پہ سمجھوتہ نہیں کرتا۔ صرف یہ پوچھا ہے کہ بغیر ثبوت کے کسی کو مشتبہ نامزد کرنے کی وجہ؟''

''تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شہنشاہ برطانیہ کے قانون میں مجھے کسی کو مشتبہ نامزد کرنے کے لئے ثبوت درکار نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' وہ قدرے سنبھلا۔ ''مگر اخلاقی طور پر آپ کو ثبوت کی ضرورت ہے۔''

''تو اب بیلی کے راہزن مجھے اخلاقیات پڑھائیں گے؟''

''آپ میری توہین کر رہی ہیں۔'' نادر کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''شکر کیجئے میں راہزنی کی اس واردات کا پرچہ نہیں کٹوا رہی، جو چند روز پہلے بیلی کے جنگل نے دیکھی تھی۔''

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''یہی تو بات ہے میم صاحب! میں نے سنا ہے اس واردات میں ڈاکوؤں نے بہت احسان کیا تھا آپ پر، آپ کو جانے دیا تھا، شاید ان کے سرغنہ نے ایسا کہا تھا اور بعد میں دیگر ڈاکوؤں نے اس سے، اس بات پہ ناراض ہو کر گروہ توڑ دیا کہ ان کے اصولوں کی کتاب میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اگر فرنگی کوئی محسن ہو تو اسے نہیں لوٹنا۔''

وہ چونکی، مگر ظاہر نہیں ہونے دیا، بہر حال معلومات اس کے لیے نئی تھیں۔

''دیگر ڈاکوؤں سے آپ کی مراد آپ خود ہیں؟''

''میں.....؟'' وہ جیسے جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

''آپ تو الزام در الزام لگائے جا رہی ہیں۔'' وہ شاید بہت اچھا اداکار تھا۔

''مجھے علم تھا، تم مکر جاؤ گے، مگر خیر پرچہ چاک کرو۔''

''بدر غازان کے خلاف؟'' اس نے قلم اٹھا لیا۔ ''بے شک، کاٹ لیتا ہوں، مگر آپ پھر سوچ لیں کہ آپ واقعی اس شخص کا نام لکھوانا چاہتی ہیں، جس کے بارے میں آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ میرا دوست ہے؟''

"میں تو ٹھاکروں کے نام بھی لکھوانا چاہتی ہوں، آپ نے ان پہ اعتراض کیوں نہیں کیا؟"

"اس لیے کہ ان کا اس معاملے سے تعلق ہے، شیکھران کا رشتہ دار تھا، وہ ایسا کر سکتے ہیں مگر بدر...... خیر میں پرچہ کاٹے دیتا ہوں، تا کہ آپ کو یہ خیال نہ رہے کہ بدر میرا دوست ہے۔" پھر مسکرا کر میز پہ قدرے آگے کو جھکا، مگر ایک بات یاد رکھیے گا میم صاحب! بیلی کے ایک شخص نے بھی آج تک مجھے یا بدر کو راہزنی کی کسی واردات میں نامزد نہیں کیا۔"

وہ سینے پہ بازو باندھے سیدھی کھڑی ہوگئی۔

"انسپکٹر صاحب! اس نے چہرے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے۔" میں نے راہزنی کی واردات میں بدر کا نام تو لیا ہی نہیں، صرف آپ کی بات کی تھی۔"

نادرشاہ گڑبڑایا، مگر جلد سنبھل گیا۔

"معذرت۔" پھر پرچہ کاٹ کر کاغذی کارروائی مکمل کی۔

"مجھے امید ہے آپ شیکھر کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ان تینوں افراد کو تھانے بلوا کر پوچھ گچھ کریں گے۔"

"آپ بے فکر رہیے، میرے ان تینوں افراد سے برابر کے تعلقات ہیں۔ نتائج آپ کی مرضی کے مطابق ہوں یا نہ ہوں، مگر تفتیش ضرور ہوگی۔" اس کے انداز میں ہلکا سا طنز تھا، وہ استہزائیہ سر جھٹک کر منہ میں انگریزی میں کچھ بدبداتی واپس مڑی ہی تھی، جب اس نے نادرشاہ کو کہتے سنا تھا۔

"بدر میرا دوست نہیں ہے۔" اور باہر نکلتے ہوئے مایا کو لگا تھا، وہ سچ کہہ رہا ہے۔ شاید راہزنی کی اس ادھوری واردات نے وہ دوستی ختم کر دی تھی۔

* * *

وہ صبح خزاں آلود سی پھوٹ رہی تھی۔

راجپوتوں کی حویلی کے پچھواڑے کماد کی اونچی فصل کے پار الگ سا املتاس کا ایک اونچا درخت کھڑا تھا، تنا عمر رسیدہ اور ٹہنے موٹے تھے۔ سائے تلے زمین صاف اور مٹی برابر تھی۔ شام ڈھلے وہاں گاؤں کے باسیوں کی بیٹھک لگا کرتی تھی۔ تب زمین پہ پانی کا چھڑکاؤ ہوتا، چارپائیاں بچھ جاتیں اور گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو میں حقوں کی گڑگڑاہٹ گونجا کرتی، مگر اس زردی

صبح املتاس کا درخت خالی خالی سا پڑا تھا۔ دور دور تک کوئی چلتا پھرتا دکھائی نہ دیتا تھا، پھر جانے کس سمت سے آ کر وہ ایک ٹہنے سے بدھی رسی کے جھولے پہ آہستہ سے بیٹھ گئی، درخت کو پتا ہی نہ چلا۔

اس نے سر رسی سے ٹکا دیا۔ ہوا سے جھولا آگے پیچھے دھیما دھیما سا جھولنے لگا۔ وہ کھیتوں سے اوپر فضا میں جانے کھوجتی نگاہوں سے کیا تلاش کر رہی تھی۔ چہرہ بے رونق، بال چوٹی میں مقید اور ہار سنگھار ناپید تھا۔ تنگ پاجامہ، کلائی تک پھنسی چوڑی اور آستینیں اور یہ بڑا سا دوپٹہ جو گردن سے لپٹا نیچے کچی مٹی کو چھو رہا تھا۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا، املتاس کا سرو قد درخت جیسے نیند سے جاگا، فضا میں بکھری اس کی خوشبو محسوس کی اور بہت سے پتے اس کے قدموں میں گرا ڈالے۔

اسی پل آہستہ سے کسی نے جھولے کی دونوں رسیاں اپنے ہاتھوں میں لی تھیں۔ ہولے ہولے حرکت کرتا جھولا ساکن ہوا تو وہ جو رسی سے سر ٹکائے سوچ میں گم تھی، چونک کر ''کون'' کہتے کہتے گردن موڑی تو باقی الفاظ لبوں پہ ہی دم توڑ گئے۔

وہ بالکل اس کے پیچھے کھڑا سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں ہوں، بدر۔''

''میں کسی بدر کو نہیں جانتی۔'' وہ ایک دم اٹھی اور آگے بڑھنے لگی۔

''میری بات تو سنو مایا!''

وہ جھٹکے سے پلٹی۔

''تمہیں لگتا ہے مجھے تمہاری بات سننی چاہیے؟''

''اگر ملزم سمجھتی ہو تو صفائی کا موقع تو دو۔''

''ملزم نہیں، مجرم ہو تم میرے۔ تم سب میرے مجرم ہو۔ تم، وہ تمہارا تھانے دار دوست۔'' غم و غصے کی شدت سے اس کی آواز پھٹنے لگی۔ ''اور یہ ٹھاکر...... تم سب نے مل کر میرے شوہر کا خون کیا ہے۔ مجھے تو اسی دن تمہاری اصلیت سمجھ جانی چاہیے تھی، جس دن تم نے جنگل میں میرا راستہ روکا تھا، بیلی کے وہ ڈاکو، جن کا ذکر یہاں کوئی نہیں کرتا، میں جانتی ہوں، وہ کون ہیں۔ وہ تم ہو۔ وہ تم ہی تھے، جو اس روز گھوڑے پہ بیٹھے تھے اور وہ میرے ساتھ پٹر پٹر بولنے والا نادر شاہ تھا، تم لوگوں نے پہلے میرا راستہ روک کر لوٹنے کی کوشش کی اور اب کیا کیا؟ میرے مرے ہوئے شوہر

پہ الزام لگا دیا۔ اس کہانی کا، جو تمہاری خود ساختہ ہے۔ جسے اپنی عیاری اور سفارتکاری سے تمہارے گروہ نے بیلی کے ہر شخص کے دل میں خوف کی طرح بٹھا دیا ہے۔''

وہ خاموشی سے لب بھینچے کھڑا تھا، رسّی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

''قبرستان کا بھوت، منگل سنگھ کا قاتل، جنگل کے ڈاکو، وہ سب تم لوگ ہو۔ تم لوگوں نے بھیس بدل بدل کر پورے گاؤں کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ جانتے ہو میں نے تمہارے اس دو غلے پن کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھائی؟ کیونکہ میں تمہاری راہزنیوں کو خود سے دلیلیں دے کر صحیح ثابت کرتی رہی کہ آخر فرنگی ناجائز غاصب ہیں۔ تو ان سے تمہارے بدلے کا یہی ایک راستہ ہے۔ مگر جانتے ہو مجھے غصہ کس بات کا ہے؟ تم نے مجھے اپنے اور شیکھر کے تنازع کا بتایا نہ ہی اس جوگی کا، جس کا نام شیکھر ہے۔ کیا گاؤں میں کوئی دوسرا شخص اس نام کا نہیں ہو سکتا تھا؟ تم نے میرے شوہر سے ہی کیوں دشمنی نکالی۔''

''میری شیکھر سے کوئی.....''

''مجھے صفائیاں مت دو، انہیں عدالت کے لیے سنبھال رکھو۔''

وہ زخمی سا مسکرایا۔ ''تمہاری عدالت کے لیے۔'' شاید وہ سمجھا نہیں تھا۔

''قانون کی عدالت کے لیے۔''

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ''کیا مطلب؟''

''مت کہنا کہ تمہارے تھانے دار دوست نے تمہیں ایف آئی آر کے متعلق نہیں بتایا۔''

''میں واقعی لاعلم ہوں۔'' اس کے چہرے پر برہمی آ گئی۔ پل بھر میں وہ ہندوستانی مرد بن گیا تھا، جھولے کی رسی کب کی اس نے چھوڑ دی تھی۔

''تو جا کر اس ڈکیت سے پوچھو، جو تھانے دار بادشاہ بن کر انگریز سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔''

وہ جو کچھ کہنے لگا تھا، بختی و ناگواری سے لب بھینچے تیزی سے واپس مڑ گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا، مگر وہ دیکھ چکی تھی کہ وہ تھانے جا رہا تھا۔

خالی جھولا ہولے ہولے ہلتا ٹھہرنے کو تھا، مایا نے دیکھا، جھولے کے پیچھے کچی زمین پہ بدر کے جوتوں کے نشان رہ گئے تھے، اتنے تازہ اور صاف نشان جیسے ہاتھ سے منقش کیے گئے

ہوں......

وہ جیسے خواب سے چونکی۔

ایک خیال سرعت سے اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ وہ ایک دم مڑی اور حویلی کی طرف بھاگی، لمبا دوپٹہ کاندھے سے لگا مٹی پہ جھاڑو دیتا گیا۔

"رام ناتھ!" کوچوان رام ناتھ حویلی کے دروازے پہ ہی اسے مل گیا۔ وہ بہلی، رتھ، بگھی اور انگریزی گھوڑا گاڑی، سب چلاتا تھا اور ہندوستانی ایسے شخص کو محض "بہل بان" کہہ دیا کرتے تھے، مگر وہ اسے کوچوان ہی کہتی تھی۔

"جی مالکن!" وہ ہاتھ باندھے کام چھوڑ کر حاضر ہوا۔

"تمہیں فضل الٰہی کے گھر کا پتہ ہے؟"

"کون جی......؟"

"وہ جو کھوجی ہے۔"

"پولیس کا کھوجی فضل الٰہی؟ ہاں جی، علم ہے۔"

"جاؤ، اسے بلا لاؤ، کہو میم صاحب نے بلا بھیجا ہے۔"

رام ناتھ الٹے قدموں مڑ گیا اور تھوڑی دیر بعد فضل الٰہی کے ساتھ اس کی واپسی ہوئی۔

"رام ناتھ! تم جاؤ، اب اپنا کام کرو اور آپ میرے ساتھ آئیے۔"

جب وہ کھوجی کے آگے چلتی املتاس کے اداس درخت کے پاس واپس آئی تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سنہری چمکیلی کرنیں اس کے چہرے سے لپٹنے لگی تھیں۔

جھولا ابھی تک ہوا سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے وہاں قدم رکھتے ہوئے رسی تھام لی۔ جھولا رک گیا۔

"آپ کو وہ کھرا یاد ہے، جو کچے راستے پہ تھا، اس شخص کا جو، آخری دفعہ شیکھر سے ملا تھا۔"

"یاد ہے۔"

"ٹھیک سے یاد ہے نا؟"

کھوجی فضل الٰہی دھیرے سے مسکرایا۔

"میم صاب! مجھے دس برس پرانے کھرے بھی یاد ہیں، آپ پوچھئے کیا پوچھنا ہے۔"

''اچھا یہ کھرا دیکھ کر بتایئے، کیا وہی کھرا ہے؟'' اس نے جھولے کے عقب میں ثبت کھروں کی جانب اشارہ کیا۔

کھوجی آگے بڑھا، پہلے جھکا، پھر پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھ کر غور سے مٹی کو دیکھنے لگا۔

''یہ کھرا؟''

''ہاں یہی۔'' وہ بے صبری سے بولی۔

چند لمحے بعد وہ ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا۔

''یہ وہ کھرا نہیں ہے۔''

''کیں؟'' وہ پریشان سی پیچھے ہٹی۔

''جی میم صاب! یہ وہ کھرا نہیں ہے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنکھیں تھک کر میچ کر کھولیں۔

''ہوسکتا ہے اس نے کوئی اور جوتی پہن رکھی ہو۔''

''نہیں میم صاب! مٹی جھوٹ نہیں بولتی، دھوکہ نہیں دیتی۔ یہ کھرا کسی لمبے قد کے مناسب بدن کے آدمی کا ہے، جس نے کسی چیز کو......'' کھوجی نے ادھر اُدھر دیکھا، پھر نگاہ جھولے پہ ٹھہر گئی۔ ''غالباً اس جھولے کی رسی کو تھام رکھا ہے۔ وہ دوسرا کھرا بہت مختلف ڈیل ڈول کے آدمی کا تھا۔''

''مختلف ڈیل ڈول؟'' وہ پژمردہ سا مسکرائی۔ زمین پہ چند لکیریں دیکھ کر آپ قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کا حساب کیسے کر لیتے ہیں؟''

''مٹی کی زبان پڑھنا کیا مشکل ہے میم صاب؟'' وہ بولا تو اس کے انداز میں بلا کی سادگی تھی۔

''مجھے جو چند ٹیڑھی میڑھی اشکال نظر آتی ہیں، آپ انہیں زبان کہہ کر، انہیں پڑھ اور سمجھ کر مطلب کیسے اخذ کر لیتے ہیں؟''

فضل الٰہی نے سادگی سے دریافت کیا، ٹھاکروں کے کتب خانے میں جو انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں رکھی ہیں، کیا وہ آپ سے پڑھی جاتی ہیں؟''

''ارے انگریزی پڑھنا کون سا مشکل ہے۔''

''جبکہ مجھے آپ کے انگریزی الفاظ ٹیڑھی میڑھی اشکال نظر آتے ہیں۔''

وہ بے ساختہ ہنس دی تو رسی ہاتھ سے پھسل گئی، جھولا ہوا میں جھول کر رہ گیا۔

''شکریہ۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لیے حویلی کی جانب بڑھ گئی۔ ''اگر وہ کچے راستے والا گھر کہیں آپ کو دکھائی دے تو......''

وہ دونوں چلتے چلتے دور ہوتے گئے، مایا کی آواز مدھم پڑتی گئی۔

املتاس کا اداس درخت اور جھولا پھر سے ویران ہو گئے۔

* * *

وہ برآمدے کی دوسری سیڑھی پہ بیٹھی تھی، پاؤں گھاس پہ اور کہنی گھٹنے پہ ٹکائے، ہتھیلی تھوڑی تلے رکھے، وہ سر جھکائے کتاب پڑھ رہی تھی، جب ٹھاکر رگھوناتھ اور گوپال آگے پیچھے گھاس قدموں تلے روندتے باغیچے میں داخل ہوئے اور اس کے قریب آن رکے۔

''مایادیوی!'' ٹھاکر رگھوناتھ نے اسے پکارا۔

اس نے ذرا سی نگاہ بلند کی۔ ان کے چہرے پہ ضبط اور دبا دبا غصہ تھا۔ صبح انہیں تھانے بلوایا گیا تھا، یقیناً وہیں سے آرہے تھے۔

''آپ نے ہمارے خلاف ایف آئی آر کٹوائی ہے؟''

''جی!'' اس کے اطمینان کا وہی عالم تھا۔

گوپال تلملا کر بولا۔ ''آپ کو لگتا ہے ہم شیکھر کا خون کر سکتے ہیں؟''

اس نے نگاہ کا رخ گوپال کی جانب موڑا اور اس پہ سر سے پاؤں تک ایک گہری نظر ڈالی۔

''کر سکتے ہیں۔''

''کیوں کریں گے ہم ایسا؟''

''شیکھر کی دولت کیلئے۔''

''مگر اس نے تو پائی پائی آپ کے نام کر دی تھی، ہمارے لیے ایک دمڑی، ایک چھدام بھی نہ چھوڑا۔''

''آپ جانتے تھے ٹھاکر صاحب! کہ اس کی موت کی صورت میں، میں واپس انگلستان چلی جاؤں گی اور سب کچھ آپ کی نگرانی یا ملکیت میں دے جاؤں گی، دونوں صورتوں میں آپ ہر چیز کے بلاشرکت غیرے مالک ہوں گے۔''

"مگر......"

"آپ کے اور شیکھر کے درمیان جائیداد کے تنازعے برسوں سے موجود تھے۔" وہ سنے یا رکے بغیر آرام سے کہے جا رہی تھی۔ "سو آپ نے اس کا ایک موثر حل یہ ڈھونڈا کہ شیکھر کو ہٹانے کے بعد مجھے بھی یہاں سے بےزار کر کے بھیج دیا جائے۔"

"مگر ہم نے تو آپ کو کبھی تنگ نہیں کیا۔"

"کیا، بالکل کیا، مجھے ہراساں کیا گیا۔" اس نے گوپال پہ ایک تیز نگاہ ڈالی۔ "مجھے نوکرانیوں کی زبانی جنوں بھوتوں کے جھوٹے سچے قصے سنائے گئے۔ یہاں تک کہ ٹھاکر گوپال نے ایک خادمہ کے ذریعے شادی کی پیشکش بھی کر ڈالی۔"

بڑے ٹھاکر نے ایک قہر آلود نظر گوپال پہ ڈالی، وہ نگاہیں چرا کر رہ گیا۔

"مایا دیوی! ہم نے تو آپ کی بہت مدد کی، آپ کی جائیداد بکوانے کا انتظام بھی کر لیا تھا۔"

"وہ بھی اپنے بیٹے کے ہاتھوں؟"

"آپ کو واقعی لگتا ہے ہم شیکھر کا خون کر سکتے ہیں؟"

"مجھے واقعی لگتا ہے۔" وہ پھر سے کتاب پڑھنے لگی۔

گوپال پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا۔ ٹھاکر رگھوناتھ بھی کچھ سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے چل دیئے۔

"میم صاحب!" اسی لمحے بکاول کسی وردی میں ملبوس تھانے کے اہلکار کو ساتھ لیے عجلت میں اس تک آیا۔

مایا نے کتاب بند کر کے گردن اٹھائی۔

"بولو۔"

"داروغہ صاحب نے بندہ بھیجا ہے، آپ کو تھانے بلاتے ہیں۔" سنہری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"میں تمہارے داروغہ کی ملازم نہیں ہوں، جو دوڑی چلی آؤں۔ اس سے بولو اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو حویلی آ جائے۔"

اہلکار قدرے تذبذب سے مڑنے لگا، مگر کسی خیال کے تحت اس نے روک دیا۔

''سنو، تھانے میں کسی اور کو بھی اس وقت بلا رکھا ہے انسپکٹر نے؟''

''ٹھاکروں کو بلایا تھا، ڈی سی صاحب بھی تھے، مگر اب وہ چلے گئے ہیں، صرف چھوٹا ملک بیٹھا ہے اِدھر۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم باہر انتظار کرو، میں آتی ہوں۔''

پھر بکاول کو مخاطب کیا۔ ''موٹر شہر سے آ گئی؟''

''نہیں میم صاب!''

''اچھا پھر رام ناتھ سے کہو بگھی تیار کرائے، میں آتی ہوں۔''

کتاب ہاتھ میں پکڑے، وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

تیاری کیا کرنی تھی، بس کرتا پاجامہ تبدیل کر کے سفید ساڑھی زیب تن کر لی، چوٹی کھول دی تو موتیوں سے بھری لڑی پیچھے بالوں میں لٹکنے لگی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا اور باہر نکل آئی۔

* * *

نادر شاہ اپنی کرسی پہ براجمان تھا، سامنے میز رکھی تھی اور میز کی دوسری طرف دو کرسیاں بچھی تھیں۔ بائیں کرسی پہ بدر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی، وہ ہاتھ اٹھا کر نادر شاہ سے کچھ کہہ رہا تھا، آہٹ پر خاموش ہوا، مگر گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔

نادر شاہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''آیئے میم صاب!''

وہ کرسی کھینچ کر بہت اعتماد سے اس کے بالکل برابر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھ گئی۔

''مجھے کیوں بلوایا آپ نے؟''

''یہ چاہتے تھے، جو بات ہو آپ کے سامنے ہو۔''

''بولئے۔'' وہ سامنے نادر شاہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''بدر کا کہنا ہے اس کا شنکر کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ اگر اس معاملے کو یہیں حل کرنا چاہیں، یا صلح کرنا چاہیں تو بسم اللہ۔'' کہہ کر وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ مایا کو محسوس ہوا، اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

''مگر مجھے صلح نہیں کرنی۔''

''مجھے بھی نہیں کرنی۔'' مایا کی بات پر وہ تیزی سے بولا۔ وہ دونوں سامنے نادر شاہ کو دیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کو بظاہر نظر انداز کر رہے تھے۔ ''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اگر بات مقدمے کی ہے تو ٹھیک ہے، آپ اپنا استغاثہ کریں میں اپنا دفاع کروں گا۔''

''شوق سے کیجئے۔'' وہ نادر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور میں عدالت میں ثابت کر دوں گا کہ میں بے قصور ہوں۔''

''ضرور کیجئے۔''

نادر شاہ ہولے سے طنزیہ مسکرایا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا بدر! اہل فرنگ کی دوستی خطرناک ہوتی ہے۔''

''بات مقدمے کی ہو رہی ہے نادر!'' بدر کو برا لگا تھا۔

''دیکھئے میم صاب!'' نادر کرسی پہ آگے ہوا، پچھلی بات نظر انداز کر دی۔ ''مجھے بھی علم ہے کہ شیکھر کی موت حادثاتی نہیں، آگ خود بخود نہیں لگا کرتی، مگر بطور ایک تھانے دار مجھے شک کی فہرست میں ہر ایک کو گھسیٹنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بھی، جس کو شیکھر کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہے۔''

''کس کو......؟'' وہ چونکی۔

''آپ کو ملی ہے۔ شیکھر کی ساری جائیداد آپ کو ملی ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ تو آپ کو ہے۔''

''مگر سامنے کی بات تھی کہ اس کے مرنے کے بعد میں نے واپس چلے جانا تھا اور میں کیا لندن میں اس جائیداد کی رجسٹریاں سنبھالتی پھرتی۔ جائیداد ہر صورت ٹھاکروں کے پاس رہنی تھی، سب سے زیادہ فائدہ تو انہیں ہوگا۔''

''یہ محض مفروضے اور ''بعد'' کی باتیں ہیں میم صاب! قانون اندھا ہوتا ہے، وہ صرف پہلا فائدہ دیکھتا ہے۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیکھر کو میں نے قتل کیا ہے۔'' وہ ذرا بھی نہ گھبرائی تھی۔

''نہیں، بلکہ آپ اس روز امرتسر میں تھیں، میرے پاس گواہیاں موجود ہیں۔ آپ کا

alibi بہت مضبوط ہے کہ آپ بیلی میں تھیں ہی نہیں۔"

"alibi تو میرے پاس بھی ہے۔" وہ تیزی سے بولا اور چہرہ مایا کی طرف موڑا۔ "میں بھی اس روز گاؤں سے باہر تھا۔"

"ہاں میں جانتی ہوں آپ کہاں تھے؟"

"آپ کیا سب جانتے ہیں کہ بیلی کے ڈاکو کون ہیں؟، لیڈی شیکھر! نادر کو بھلے نہ جانتے ہوں، مجھے سب جانتے ہیں۔"

نادر کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا۔ "میرا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" مگر بدر سنے بغیر ہی کہے جا رہا تھا، اس نے شاید نادر کا انداز محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

"مگر...... کسی نے آج تک میرے خلاف پرچہ نہیں کٹوایا۔ کیا کسی ایک شخص نے بھی بیلی میں آپ سے ذکر کیا کہ جنگل کے ڈاکوؤں کا سردار بدر غازان ہے؟ جانتی ہیں کیوں؟ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ انہیں میری صورت میں گاؤں کا ایک محافظ مل گیا ہے، انہیں معلوم ہے کہ جب تک بدر غازان بیلی میں ہے، ان کے کسی گودام میں نقب نہیں لگے گا۔"

مایا نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"آپ یہاں کے ڈاکوؤں کی نفسیات نہیں جانتیں۔ ہندوستان کے ڈاکو جو پولیس کے لیے دردِ سر ہوتے ہیں، ان کے سب سے بڑے محافظ خود ان کے اپنے گاؤں والے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس گاؤں میں نہ تو وہ ڈکیت خود واردات کرتا ہے اور اگر ڈکیت طاقتور ہو تو دور دور تک کسی ڈاکو کو ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس گاؤں کے قریب بھی پھٹک سکے۔ پولیس سے زیادہ تو ڈاکو حفاظت کرتے ہیں گاؤں کی۔ یہ ڈاکوؤں کا کلچر ہے اور مایا دیوی! آپ مانیں یا نہ مانیں، فرنگیوں سے ہم سب نفرت کرتے ہیں۔ وہ غاصب، چور اور جابر ہیں اور انہی فرنگیوں کے خلاف جب ہم بغاوت کرتے ہیں تو یقین مانیے کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے لب کاٹتی دو متضاد کیفیات کے درمیان گھری تھی۔ پھر چند ثانیے بعد بولی۔

"مگر تمہارے اور شیکھر کے درمیان کوئی تنازع تو بہرحال تھا۔"

"اگر آپ غصہ کرنے کے بجائے مجھ سے پوچھ لیتیں تو بہتر ہوتا۔" اس نے گہری سانس

لی۔" وہ زمین ٹھاکر رگھوناتھ نے ایک چوہدری کو بیچی اور اس نے مجھے، بعد میں شیکھر نے دعویٰ کیا کہ زمین اس کی ہے اور اس پہ میرا قبضہ ہے۔ ٹھاکروں نے اس چوہدری کو ساتھ ملا لیا اور مکر گئے کہ مجھے کسی نے زمین بیچی ہے۔ مقدمہ ابھی تک عدالت میں ہے، جس کا فیصلہ میرے حق میں جلد یا بدیر ہو ہی جائے گا، پھر شیکھر کو مارنے سے کیا ملتا مجھے؟ اصل فریق تو ٹھاکر ہیں۔"

اور وہ جیسے ہار گئی۔

"پھر کیا اسے ٹھاکروں نے مارا ہے؟"

"میری رائے مانگ رہی ہیں؟" بدر کا لہجہ متوازن تھا، پہلے کی طرح دوستانہ نہیں تھا، مگر ناراضی بھی مفقود تھی۔

"اگر مانگوں تو......؟"

"تو میں کہوں گا، نہیں...... ٹھاکر شیکھر کو قتل نہیں کر سکتے۔"

"مگر کیوں......؟" وہ حیران رہ گئی۔

"اس لیے نہیں کہ ٹھاکروں کے ہاتھ کچھ نہ آنا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ اتنے جی دار نہیں ہیں۔"

"لیکن شیکھر کہتا تھا۔" اسے یاد آیا کہ اگر ان باپ بیٹے کا بس چلے تو اسے قتل کر کے جائیداد ہتھیا لیں۔

"شیکھر کہتا تھا نا، سو غلط بھی کہہ سکتا ہے۔"

"وہ ان کو جانتا تھا تو کہتا تھا۔"

"وہ گاؤں میں رہتا تو کسی کو جانتا ہوتا۔ ٹھاکر گاؤں کے ساتھ جتنے برے ہوں، اس کے ساتھ اتنے برے نہیں تھے، جتنا اس کو اس کے منشی بھڑکاتے تھے۔"

"اچھا۔" مایا نے شانے اچکا دیے۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم ٹھاکروں کی حمایت کرو گے۔"

"میں صرف اپنی رائے دے رہا ہوں۔"

"آپ کیا کہتے ہیں داروغہ صاحب!؟" اس نے بہت دیر سے خاموش بیٹھے نادر کو مخاطب کیا۔

"میں ابھی تفتیش کر رہا ہوں، ٹھاکر بظاہر مجھے بے قصور لگتے ہیں، مگر انہیں یکسر نظر انداز بھی

نہیں کیا جا سکتا۔"

"اور یہ قبرستان کے بھوت کا کیا قصہ ہے؟"

"میم صاحب میرا خیال ہے ادھر کوئی نہیں ہے۔ یہ گاؤں والوں کا من گھڑت قصہ ہے۔ بہر حال میں ان تینوں سے مزید تفتیش کروں گا اور اگر یہ مجھے بے قصور لگے تو انہیں کیس سے خارج کر دوں گا، اگر یہ ملزم نکلے تو انہیں سزا ملے گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ بدر کو کیس سے خارج کرنے کا کہنا چاہتی تھی، مگر انا آڑے آ گئی تو فیصلہ نادر شاہ پہ چھوڑ کر باہر چلی آئی۔ اسے معلوم تھا، یہ تینوں نام وہ جلد ہی خارج کر دے گا۔

"بڑی زیادتی کی آپ نے لیڈی شیکھر!" وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔

"مایا!" اس نے رُک کر تصحیح کی اور پھر چل پڑی۔ وہ جو چند قدم عقب میں تھا، مسکرا کر رہ گیا۔

چلتے چلتے ٹھہر گئی اور خفگی سے گردن موڑی۔

"مسکرائے کیوں؟"

"حالانکہ میں آپ کے مڑنے سے قبل ہی اپنی مسکراہٹ چھپا چکا تھا، آپ کو کیسے علم ہوا؟"

"مجھے سب علم ہوتا ہے، جانے تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

وہ پھر سے مسکرا دیا۔

"مسکرائے کیوں؟"

"اب یا پہلے؟"

"میں تمہارے ساتھ کسوٹی کھیل رہی ہوں؟" وہ زچ ہوئی۔

بدر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ سفید ساڑھی میں سیدھے سنہری بال لیے وہ خفا خفا سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی وجہ سے آج میرے اتنے اچھے دوست کو مجھ پہ طنز کرنے کا موقع ملا۔"

"نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "وہ تمہارا دوست نہیں ہے۔"

"ارے نہیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "نادر میرا بہت اچھا دوست ہے۔" وہ کچھ کہنے لگی، پھر ٹھہر گئی، اسے لگا وہ اسے جتنا خبردار کرے، وہ یقین نہیں کرے گا۔

''شاید۔'' اس نے شانے اچکائے اور سفید ساڑھی کا پلو درست کیا۔ بدر کی نگاہ اس کے سراپے پہ پھسلتی چلی گئی۔

''اتنے سفید رنگ پہنتی ہو تم، بالکل کوئی......'' وہ لمحے بھر کو ٹھہرا۔

''کہہ دو بدروح لگتی ہوں۔''

''پری لگتی ہو۔''

مایا نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ شاید پہچان گئی تھی، مگر اس کا اعتراف خلاف انا نہ ہوتا تو وہ کر ہی ڈالتی۔

''صحیح کہہ رہا ہوں، زہرہ کہتی ہے ٹھاکروں کی یہ مہارانی تو ساحرہ ہے، میں سوچ رہا تھا، وہ ٹھیک کہتی ہے۔'' وہ چند قدم اس کے قریب آیا۔

''کیسی ہے زہرہ؟''

''خوب صورت ہے۔''

''میں نے حال پوچھا ہے۔''

''وہ بھی بہت اچھا ہے۔''

''منگیتر ہے تمہاری تو شادی کب کرو گے اس سے؟''

''آپ نے اس روز کہا تھا کہ قبرستان میں رات ٹھہر کر اس بھوت کی گھات لگاتے ہیں۔'' اس نے بات بدل دی۔

''معلوم نہیں کوئی بھوت ہے بھی یا نہیں، میں تو یہاں کے لوگوں کی نوٹنکیوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ چلتی ہوں۔''

وہ اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

'زہرہ ٹھیک کہتی ہے۔' اس نے سوچا تھا۔

* * *

''تھانے دار نے تذکرہ کیا تھا کہ آپ نے میرا اور پتا جی کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا ہے۔'' کھانے کی میز پہ گوپال نے کرسی کھینچتے ہوئے قدرے مصالحتی انداز میں بات شروع کی۔

کھانے کا کمرہ بے تحاشا انگریزی فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ فرنگی ایسے ہی گھروں کو بے جا چیزوں سے بھرنے کے لیے بدنام تھے۔ چیزیں اچھی خریدتے، مگر سجانے کا ذوق ناپید تھا اور شیکھر ان ہندوستانیوں میں سے تھا، جو اہل فرنگ کی نقالی میں پیش پیش رہتے تھے۔

''بدر غازان کا بھی واپس لے لیا ہے۔''

گوپال رکابی اپنے سامنے رکھتے رکھتے چونکا۔ ''اس کا نام بھی تھا؟''

''ہاں!'' وہ سر جھکائے کھاتی رہی۔

''تو واپس کیوں لیا؟''

''مجھے لگا وہ بے قصور ہے۔''

''اور ہمارا نام؟''

''بدر کو لگا، آپ بھی بے قصور ہیں۔'' گوپال کو جھٹکے پہ جھٹکے مل رہے تھے۔

''بدر...... بدر کو لگا۔''

وہ رومال سے ہاتھ صاف کر کے، کرسی دھکیل کر اٹھی۔

''جی بدر کے کہنے پہ میں نے نام تو واپس لے لیا، مگر شک بہرحال مجھے ابھی تک آپ پر ہے۔''

گوپال جز بز ہوتا سالن ڈالنے لگا۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔ ابھی سیڑھیوں پہ چڑھی ہی تھی کہ روپ وتی نے روک لیا۔

''میم صاب! یہ چھوٹے ملک نے بھیجا ہے۔'' دبی آواز میں کہتے چاندی کی طشتری سامنے کی جس پہ سرخ مخمل کا ٹکڑا بچھا تھا۔ اس پہ ایک بند رقعہ رکھا تھا۔

وہ پہلی سیڑھی پہ کھڑی تھی، قد دراز تھا ہی، اوپر کھڑے ہونے کے باعث مزید اونچی اور نیچے طشتری تھامے کھڑی روپا، بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

مایا نے رقعہ اٹھا کر کھولا۔

''اگر میرے سارے قصور معاف کر دیے تو کل صبح میں کنویں کے کنارے تم سے بات کرنے کا منتظر رہوں گا... بدر۔''

اس نے رقعہ مٹھی میں دبا لیا۔

''اس کا ایلچی باہر کھڑا ہے؟''

''جی میم صاب!''

''اسے کہو اپنے مالک سے کہہ دے پیغام وصول کر لیا ہے اور سنو! یہ چھوٹا ٹھاکر شکار پہ کب جا رہا ہے؟''

''غالباً اسی بدھ وار کو؟''

''یعنی دو دن بعد۔'' وہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ سفید ساڑھی کا پلو اس کے پیچھے پیچھے زینوں سے لپٹتا اوپر جا رہا تھا۔

اور جب وہ دروازے کے پیچھے گم ہو گئی تو روپ وتی باہر جانے کے بجائے، آہستہ سے کھانے والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

* * *

صبح ابھی نیلی ہی تھی جب وہ کنویں پہ آ گئی۔ وہاں آج بھی کچی زمین پہ بیر بکھرے تھے۔

بیری کے درخت کے ساتھ بندھا سفید گھوڑا سر جھکائے گرے پتوں میں منہ مار رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو دیکھا تو فوراً نگاہ اِدھر اُدھر گھومی اور پھر وہ اسے نظر آ ہی گیا۔

کنویں کی جگت پہ بیٹھا، سر جھکائے جوتے سے پتے کو مسلتا۔

وہ دبے قدموں، ایک دم سے اس کے سامنے آ گئی۔

وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''مایا!''

وہ جس سفید ساڑھی میں ماتم کناں بیوہ کی توقع کر رہا تھا، وہ تو آج نرالی چھب میں تھی۔

گہرا سرخ کرتا پاجامہ، کہنی تک آتی آستینیں اور ان کے آگے کلائیوں تک سرخ چوڑیوں سے بھرے ملائم دودھیا بازو، آنکھوں میں گہرا کاجل اور کھلے چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے بالوں میں ایک طرف لٹکتی موتیوں بھری لٹ۔ وہ اکثر بال کھولتی تھی، ہندوستان میں کھلے بالوں والی عورتوں کو بے حیا اور آوارہ تصور کیا جاتا تھا۔

بلی میں کوئی شریف عورت بال نہیں کھولتی تھی مگر یہ وہ واحد لڑکی تھی جو کھلے بالوں میں بدر کو اور بھی زیادہ حسین لگتی تھی۔

''جب تم نے کہا میں رنگ نہیں پہنتی تو میں نے سوچا، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں زندگی سے رنگوں کو نکال کر خود پر ظلم کر رہی تھی۔ میں کون سا ہندوستانی ہوں، مجھے لگا اگر رنگ پہننے لگوں تو یہاں کوئی خاص اعتراض نہیں کرے گا۔''

''نہیں کرے گا۔'' بے اختیار لبوں سے پھسلا، وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے سحر انگیز سراپے سے بے نیاز کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور کلائی میں پڑی چوڑیاں اِدھر اُدھر سیدھی کرنے لگی، پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم نے مجھے اس لیے بلایا ہے کہ یوں دربان کی طرح سامنے کھڑے رہو؟''

''ارے نہیں۔'' وہ آہستہ سے ساتھ بیٹھ گیا۔

''پھر کس لیے بلایا تھا؟'' اس نے ہاتھ سے سارے بال سمیٹ کر دائیں کندھے پہ ڈالے، سرخ چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

''معلوم نہیں۔'' وہ سامنے دیکھنے لگا، ''بس اس روز تمہارے اچانک غصے پہ ابھی تک حیران ہوں۔''

''بدر! تمہیں میرے ساتھ صاف صاف بات کرنی چاہیے تھی۔ تمہیں اپنے اور شیکھر کے معاملے کے بارے میں مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا، پھر یہ سوچے بغیر کہ کوئی اور بھی شیکھر نام کا ہوسکتا ہے، تم نے سارا الزام شیکھر کے سر ڈال دیا۔ وہ میرا شوہر تھا بدر! مجھے دکھ ہوا ہے۔''

''میرا تنازع ٹھاکروں کے ساتھ تھا اور میں معافی چاہتا ہوں کہ نادانستگی میں، میں نے تمہیں دکھ دیا۔ مجھے واقعی شیکھر پہ شک نہیں کرنا چاہیے تھا، مگر اس کا نام پُریقین ہو کر میں نے تب ہی لیا تھا، جب تم نے کسی کالی چادر والے کو گودام میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے لگا یہ سب شاید شیکھر کر رہا ہے۔''

''ہوں۔'' اس نے لب سکیڑے، سارا جھگڑا جیسے ختم ہو گیا تھا۔ ''کون ہوسکتا ہے وہ شخص؟''

''اگر وہ ٹھاکر شیکھر نہیں ہے تو......''

''بدر!'' اس نے صدمے سے اسے دیکھا۔

''تمہیں اب بھی شک ہے کہ وہ شیکھر ہوسکتا ہے؟''

''میں معافی چاہتا ہوں، گوپال شکار پہ کب جا رہا ہے؟'' بات پلٹ دی۔

''بدھ کو۔'' وہ سامنے دیکھنے لگی۔'' میں اس رات بھوت کی گھات لگانے قبرستان جانا چاہی ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''اچھا یہ شیکھر...... میرا مطلب ہے یہ جوگی کیسا آدمی ہے؟''

''جادوٹونے کرتا ہے، دوا وغیرہ بھی دیتا ہے۔''

''کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتے ہو؟ ہم کم از کم اسے چیک تو کر سکتے ہیں، یا اس کا کھرا...... اوہ بدر تم نے کبھی اس بھوت کا کھرا پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کی تھی، جب منگل سنگھ قتل ہوا تھا، مگر تماشائیوں نے کھرے تباہ کر ڈالے تھے۔ ویسے تو ڈرتے ہیں، مگر لاش کا سن کر تجسس میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔''

''کبھی اس بھوت کا کھرا نہیں پکڑا گیا؟''

''میں چند ایک بار کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں، مگر وہ شخص اپنے کھرے مٹا کر جاتا ہے، خاصا شاطر انسان لگتا ہے وہ مجھے لیڈی شیکھر!''

''لیڈی فرینڈس!'' غیر ارادتاً تصحیح کی تو وہ بولتے بولتے ٹھہر سا گیا۔

''تم شیکھر کا نام اپنے ساتھ نہیں لگانا چاہتیں؟''

''میں تو اب سفید رنگ بھی نہیں پہننا چاہتی، تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہر وہ چیز جس سے تم خوش ہو۔ ایک بات پوچھوں؟''

ڈلہوزی کی وہ ڈھلتی شام ان کے آس پاس منڈلانے لگی۔ پل بھر کو وقت ٹھہر سا گیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جانے کیا کہنا چاہتا تھا اور پھر کچھ اور کہنے کی خواہش لیے وہ بس اتنا پوچھ سکا۔

''راجپوت میری اور تمہاری شناسائی پہ اعتراض تو نہیں کرتے؟''

''کرتے ہیں۔''

''اور تم کیا کرتی ہو؟''

''میں؟ میں ہمیشہ تمہارے بلانے پہ آ جاتی ہوں۔''

وہ اس لمحے اتنی سادہ لگی تھی کہ وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ نہ روک سکا۔

وہ کھڑی ہوگئی۔

''کدھر؟''

''چلو چل کر اس جوگی کو دیکھتے ہیں۔''

''اتنی صبح؟''

''کیا وہ دیر تک سوتا ہے؟''

''ارے نہیں۔'' بدر ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا۔ ''اس کے پاس تو صبح تڑکے سے ہی لوگوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔''

''بے چارے کچے عقائد کے پسماندہ لوگ......'' وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''اس کا ڈیرہ یہاں سے کتنا دور ہوگا؟''

''زیادہ نہیں، یہ گاؤں بہت بڑا نہیں ہے۔''

کنواں پیچھے رہ گیا تھا، وہ دونوں آگے پیچھے کھیتوں کے بیچ پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے اس کی سرخ چوڑیاں کھنک اٹھتی تھیں۔

''تمہیں جان کارلس کیسا آدمی لگتا ہے بدر؟''

''ڈی سی بہادر؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''متعصب، ہندوستانیوں کو نیچ سمجھنے والا، سخت گیر، مگر ایماندار، فرض شناس۔''

''تمہیں نہیں لگتا، وہ شیکھر کے قتل کے کیس میں اچانک سے دلچسپی لینے لگا ہے؟''

''تم چاہتی ہو وہ نہ لے؟''

''لے ضرور لے، مگر لے ہی کیوں؟''

''تمہیں کیسے لگا کہ وہ اس کیس میں دلچسپی لے رہا ہے؟''

''اس نے مجھے بلا کر یہ بتایا تھا کہ تمہارا اور شیکھر کا کیا تنازع تھا۔'' بدر چلتے چلتے ٹھٹک کر پلٹا۔ ''اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''شاید گوپال نے اسے کہا ہو۔ اس نے بتایا تو یہی تھا۔''

''تم قبرستان میں جانے کے لیے گوپال کے شکار پہ جانے کا انتظار کیوں کر رہی ہو؟''

''میں نہیں چاہتی کہ اسے پتہ چلے، وہ عموماً میری تاک میں رہتا ہے۔''

''تمہیں اس سے اتنا فرق کیوں پڑتا ہے؟''

''وہ باپ بیٹا مجھے گاؤں سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی۔ میں شیکھر کے قاتلوں کو انجام تک پہنچائے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔''

''کیا تم صرف اسی لیے ادھر ہو؟'' بدر کو جیسے دکھ ہوا تھا۔

''یہ صرف ایک وجہ ہے۔'' وہ مبہم سا مسکرائی۔

''اور دوسری وجہ کیا...... یہ رہا اس جوگی کا ٹھکانہ۔'' ادھوری بات اس کے لبوں پہ دم توڑ گئی کہ جھگیاں آ گئی تھیں۔

وہ جوگی کے ایک چیلے کی جانب بڑھا۔

''بابا سے ملنا ہے۔''

چیلے نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی۔

''بابا ابھی مصروف ہے، عمل کا وقت ہے، منگل کو آنا۔''

''منگل تو آج ہے۔''

''اگلی منگل کو آنا۔'' وہ جھنجلایا تھا۔

''مگر مہاراج! ہمیں بہت ضروری کام ہے۔''

''کہا نا، ابھی عمل کا...'' دفعتاً چیلے کی نگاہ دور سے آتی مایا پہ پڑی، سرخ کھلتے گلاب جیسا لباس، اس میں سے جھلکتی گوری جلد۔

''کیا ہوا؟ ہم اندر جا سکتے ہیں؟'' وہ بیک وقت دونوں سے مخاطب ہوئی۔

''یہ تمہارے ساتھ ہے؟'' آن کی آن میں چیلے کے تاثرات تبدیل ہوئے۔ بدر کا مثبت جواب پا کر وہ ''اچھا ذرا دیر کو ٹھہرو۔'' کہہ کر فوراً اندر لپکا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''مجھے دیکھ کر کہا کہ جوگی مصروف ہے، مگر تمہیں دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس کا استاد اسے کچا چبا جاتا، اگر اسے علم ہوتا کہ اس نے ایک خوبصورت لڑکی کو اندر کا راستہ نہیں دکھایا۔''

چیلا اسی پل باہر آیا۔

''مہاراج نے اپنے عمل میں قدرے توقف کیا ہے، آپ اندر جا سکتی ہیں۔''

''ہم ساتھ ہیں۔'' بدر کٹیلے لہجے میں کہہ کر مایا کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

خیمہ خاصا بڑا تھا۔ دیواروں پہ عجیب وغریب سے حروف تہجی میں مختلف الفاظ لکھ رکھے تھے، ایک کونے میں ہنڈیا رکھی تھی، جس کے نیچے مدھم آگ جل رہی تھی۔ ہنڈیا کے ڈھکن کی درزوں سے نکلتے دھوئیں سے پورے خیمے میں عجیب تعفن زدہ بو پھیلی تھی۔

سامنے چوکڑی مارے چھوٹی چھوٹی داڑھی والا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ رکھے تھے اور آنکھیں موندے، زیرلب کچھ بدبدا رہا تھا۔ مایا اور بدر اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔

''بدر!'' اس نے بغور جوگی کو دیکھتے ہوئے انگریزی میں سرگوشی کی۔ ''اس نے چغہ پہن رکھا ہے۔''

بدر نے دیکھا، شیکھر بابا نے واقعی گہرے سبز رنگ کا میلا کچیلا سا جھولا سا پہن رکھا تھا، اس کی گردن میں عجیب وغریب پتھروں کا ہار تھا۔

''بولو، کیا مسئلہ ہے؟'' جوگی نے آنکھیں کھولیں، ایک گہری نگاہ مایا پہ ڈالی۔

''ہمارے ہاں اولاد نہیں ہے۔'' بغیر تمہید کے وہ اتنی سادگی سے بولی کہ بدر حیران سا رہ گیا۔

''کوئی عمل بتا دیجئے مہاراج! میری ساس مولوی سے تعویذ لے کر کرتی ہے۔ وہ اس کی دوسری شادی کروا دے گی۔''

''ہوں، لمبا عمل ہے، مگر چھوکری کو کرنا ہوگا۔''

''کیا کرنا ہوگا مہاراج؟'' وہ ادب سے استفسار کر رہی تھی۔

''چھوکری کو ہر تیسرے روز ہمارے پاس لانا ہوگا۔ ساتھ میں عمل کی دوسری اشیاء بھی تمہیں خود لانی ہوں گی۔''

''کیسی چیزیں.....؟''

جوگی کی نگاہیں اس کے تیکھے وجود کے گرد طواف کر رہی تھیں۔ مایا سوال در سوال کر رہی تھی اور وہ تو پہلے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلا تھا، خاموش سا بیٹھا تھا۔

''ہوں۔'' جوگی نے ہنکارا بھرا۔ یہ یقین تھا کہ اس نے مایا کو نہیں پہچانا تھا۔ وہ اپنی کٹیا میں مہاراجہ بن کر رہنے والا تھا، غالباً باہر زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ ''کسی کنواری عورت کی ہڈی لانی ہوگی،

جسے مرے ہوئے بس سات روز ہوئے ہوں، مگر آٹھواں روز نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ایسی ہڈی پہ ہونے والے عمل سے تمہارے گھر ہونے والا بچہ بڑا ہو کر تم دونوں میں سے کسی ایک کا خون کر دے گا۔"

"کیا......؟" وہ بے اختیار چلائی۔ پھر کھانسنے لگی۔ آنچل قدرے ڈھلکا تو جوگی کی آنکھیں مزید کھل گئیں۔

ناگواری کی ایک لہر بدر کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی، اس نے ایک دم مایا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

"رُکو تو......" وہ جھگیاں دور چھوڑ آئے تو اس نے قدرے خفگی سے ہاتھ چھڑایا۔ "مجھے بات تو کرنے دیتے، ایسی بھی کیا جلدی تھی؟"

"اہل فرنگ کے ہاں اخلاقیات اور عزت کے جو اصول ہوں، مگر میں ایک ہندوستانی مرد ہوں اور کسی ہندوستانی مرد کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی عورت کو......"

وہ جو برہمی سے کہتا چلا جا رہا تھا، ایک دم رُک گیا۔ "کس کی عورت؟" مایا کا لہجہ ایک دم بے تاثر ہو گیا تھا۔

"عورت ہندوستانی مرد کی عزت ہوتی ہے اور بیلی کی ہر عورت میری عزت ہے۔" وہ بات بدل گیا۔

"مگر میں بیلی کی عورت نہیں ہوں۔" اس نے حویلی کی طرف جانے والے رستے پہ قدم بڑھاتے ہوئے بال سمیٹے تو سرخ چوڑیاں زور سے کھنکیں، پھر خاموشی چھا گئی، وہ اسے دور ہوتے دیکھتا رہا، پھر سر جھکا کر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

ڈلہوزی کی ڈھلتی شام کا سرا اس کے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا۔

* * *

نہ کوئی وقت طے پایا تھا اور نہ ہی جگہ، مگر اس رات وہ جیسے ہی کچے راستے پہ آئی، جانے کس طرف سے نکل کر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹی، لبوں سے چیخ نکلی ہی تھی کہ اس نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''بدر ہوں۔'' چاندنی میں نہایا، اسکا چہرہ دیکھا تو وہ جو گھبرا کر ہاتھ ہٹانے لگی تھی، ڈھیلی پڑ گئی۔ بدر نے آہستگی سے ہاتھ ہٹا دیا، اسے اپنے ہاتھ سے اس کی مہک آنے لگی تھی۔

''تم میرا انتظار کر رہے تھے؟'' مایا کا لہجہ مشکوک پا کر وہ ہنس دیا۔

''ہاں۔''

''مگر تمہیں کیسے پتہ تھا میں آؤں گی؟''

''مت شک کرو، میں نہیں ہوں وہ بھوت۔ آج چونکہ بدھ کی رات ہے تو میرا اندازہ تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔''

''اور مجھے بھی علم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا غضب ڈھاتا سراپا نمایاں تھا۔ وہ اسے گلابی شب خوابی کے ریشمی لباس میں کسی گلاب کی طرح دہکتی لگی تھی۔ سنگھار سے بے نیاز چہرہ اور سمیٹ کر دائیں کندھے پہ ڈالے بال، جن میں پروئے موتی چاندنی میں کبھی کبھی چمک اٹھتے تھے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کچے راستے پہ چلنے لگے۔

''کیا تم نے کسی بھوت کو قبرستان جاتے دیکھا؟''

''ابھی تو رات ہوئی ہے دیوی جی! ابھی غالباً ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ آسانی سے نکل آئیں حویلی سے؟''

''بس گوپال کی غیر موجودگی کی تسلی کر کے نکلی ہوں، شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔''

بدر نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ کبھی کبھی وہ اسے کوئی معصوم سی چھوٹی سی بچی لگتی تھی۔ مگر وہ کیا تھی؟ وہ اب تک نہ سمجھ پایا تھا۔ بس ایک سحر سا تھا، ایک طلسم ہوشربا، جو اس کے وجود سے پھوٹتا بدر کو اپنے حصار میں مقید کیے ہوئے تھا۔ اسے لگتا تھا، وہ چاہے بھی تو صدیوں یہ ان دیکھی زنجیریں نہیں کھول سکے گا، وہ ہمیشہ اس سحر میں مقید رہے گا۔

دوسرے ہندوستانیوں کی طرح فرنگی عورتیں اسے بھی پھیکی، خشک، سرد مزاج اور سپاٹ لگتی تھیں۔ ان کی اکثریت بے حد گوری، مغرور اور فربہی مائل روکھی پھیکی سی ہوتی تھی اور بطور ہندوستانی مرد، اسے ایسی عورتیں ہرگز پسند نہ تھیں۔ اگر کوئی بھی ہندوستانی زہرہ اور مایا کا تقابل کرتا تو اسے زہرہ زیادہ حسین لگتی کہ اس کا حسن مشرقی تھا۔ وہ بال نہیں کھولتی تھی، سر کو آنچل سے ڈھکے

رکھتی تھی۔ وہ بلاشبہ بیلی کی سب سے حسین لڑکی تھی، لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا، جسے مایا جیسا کوئی لگتا ہی نہ تھا۔ مایا درحقیقت اتنی حسین نہ تھی، مگر اس نے اپنے وجود کو کچھ ایسے تراشا تھا کہ خود سے پھوٹتی مقناطیسی شعاعوں سے وہ کسی کو بھی بس نگاہوں سے مقید کر لیتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے...... جیسے بدر نے سوچا اور اس کے ذہن میں بس ایک ہی مثال آئی...... جیسے کوئی سنگ تراش کسی عام سے پتھر کو تراش کر "ماہ ملکہ" بنا ڈالے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ چونک کر حال میں واپس آیا، پھر سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ "سوچ رہا تھا تمہارے اوپر بیلی کا ایک Legend صادق اترتا ہے۔"

"کون سا لیجنڈ؟"

"پھر کبھی بتاؤں گا، ابھی یہ پھاٹک کھولو۔"

قبرستان آ گیا تھا، لکڑی کا پھاٹک بند پڑا تھا۔ بند کنڈے میں ٹوٹا ہوا تالہ جھول رہا تھا۔

"کیسا بھوت ہے، جسے اندر جانے کے لیے تالہ توڑنے کی ضرورت ہے، یہ تالا اِدھر تھا ہی کیوں؟"

"شاید نمبردار نے لگوایا تھا، اب تو وہ نسل ہی ختم ہو گئی، جو اس قبرستان میں فاتحہ پڑھنے آتی تھی۔ یہ بہت قدیم قبرستان ہے مایا دیوی!"

قبرستان ویران پڑا تھا اور قبریں جانے کب سے کھنڈر بن چکی تھیں۔ چھوٹی سی کچی پکی چار دیواری کے ایک سرے سے لگا برگد کا بوڑھا درخت برسوں سے ویسے ہی جھکا کھڑا تھا۔

عجب ہو کا عالم تھا۔ سناٹا، تاریکی اور ہیبت بھرا احساس، جیسے اردگرد کوئی ہو...... کوئی ان دیکھی سفید لبادے میں لپٹی روح......

"آؤ اِدھر بیٹھتے ہیں۔" وہ دونوں برگد کے تنے تلے بیٹھ گئے، ایسے کہ پھاٹک سے داخل ہونے والے کسی بھی شخص پہ ان کی فوراً نظر پڑ جاتی، مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکے۔

لمحے خاموشی سے سرکتے رہے۔ آدھے چاند کے اوپر بادل تیر رہے تھے۔ کبھی وہ ان کے پیچھے چھپ جاتا، کبھی نکل آتا۔

"بیلی کا آسمان خوب صورت ہے۔ جانتے ہو بدر! ایسا آسمان میں نے کہیں نہیں دیکھا۔"

وہ تنے سے سر ٹکائے اوپر دیکھ رہی تھی۔ بدر خاموشی سے مسلسل پھاٹک پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔

''اور ایسا چاند بھی مجھے کہیں نہیں دیکھائی دیا، بدر!''

''تمہیں لگتا ہے ہم آج اسے دیکھ سکیں گے؟''

''چاند کو؟'' وہ بے خیالی میں گویا ہوئی۔

''نہیں مایا! بھوت کو۔''

''اوہ۔'' اس نے لب سکیڑے۔ ''سنا تو تھا کہ رات کو اِدھر آتا ہے، کیا معلوم آج بھی آ جائے۔''

''کیا معلوم نہ آئے؟''

''تم مایوس کیوں ہو رہے ہو؟''

''کیا تم نہیں ہوئیں؟''

''نہیں......'' اس نے دھیرے سے شانے اچکا دیے تو بدر نے غور سے اسے دیکھا۔

''تمہارا مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کم از کم مایوس نہیں ہوں۔''

''ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' پھر قدرے توقف کیا ''شادی کرو گی؟''

''شاید۔'' اس نے پھر سے شانے اچکا دیے، گردن ابھی تک اوپر اٹھی تھی۔

''یہاں میں کب تک رکو گی؟''

''شیکھر کے قاتلوں کی سزا تک۔''

''فرض کرو، تمہیں وہ نہ ملیں، تمہیں وہ بھوت بھی نہ ملے، تمہیں کچھ بھی نہ ملے، تب کیا کرو گی؟''

''تو زندگی پھر سے شروع کر دوں گی۔''

''یعنی شادی کر لو گی؟''

''شاید۔''

''مایا......'' وہ بھی اب تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ ''تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

بغیر تمہید کے اس نے اتنے اچانک سے کہہ ڈالا تھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا تھا۔

''مگر تم تو منسوب ہو زہرہ کے ساتھ۔'' ناراضی، نہ ناگواری، بس آرام سے پوچھا تو وہ مزید حیران ہوا۔

''میں...... میں اس کی شادی کسی اچھے خاندان میں کروا دوں گا۔ اسے مجھ سے بہتر کوئی بھی مل جائے گا۔''

''تمہیں بھی مجھ سے بہتر کوئی بھی مل جائے گی۔''

''مجھے بہتر کی تمنا کہاں ہے مایا؟'' وہ جیسے تھک کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، مگر...... مگر تم نہیں سمجھو گی۔ یہ محبت ہے ہی ایسی چیز، بہت حقیقی، مگر حقیقت سے دور لے جانے والی......''

''تم ابھی خود پر یقین نہیں ہو کہ تمہارے محسوسات کی حقیقت کیا ہے، تمہیں صرف یہ لگتا ہے کہ تمہیں مجھ......''

الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے، پھاٹک کے اس پار اسے ایک ہیولہ سا نظر آیا تھا۔

''ادھر کوئی ہے؟'' وہ پھرتی سے نیچے ہو گئی۔

''کون ہے یہ؟'' وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''بدر! کیا ہم قبرستان کے بھوت کا اصل چہرہ دیکھنے والے ہیں؟''

کوئی تھا جو قبرستان کی چھوٹی سی چار دیواری کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، جیسے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دور سے چہرہ واضح نہ تھا، مگر سفید کرتا صاف نظر آ رہا تھا۔

مایا نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور پھر ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''گوپال۔'' وہ گوپال ہی تھا۔ چار دیواری سے جھانکنے کی کوشش میں دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

مایا نے اِدھر اُدھر مٹی پہ ہاتھ مارا، ایک پتھر اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے کھینچ کر وہ پتھر گوپال کو دے مارا۔

پتھر اس کے کندھے سے ٹکرایا اور دوسرے ہی پل گوپال ''بھوت، بھوت'' چلاتا بھاگ اٹھا۔

وہ دونوں ابھی تک بے یقینی سے گوپال کو بھاگتے تاریکی میں گم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ کچے

راستے پہ غبار کے بادل ہلکے سے اٹھے تھے۔

''تو یہ نوٹنکی بھوت گوپال تھا۔'' وہ تحیر زدہ سی تھی۔

''نہیں۔'' بدر سوچتی نگاہوں سے زمین پہ واپس بیٹھتے گرد کو دیکھ رہا تھا۔ ''وہ گوپال نہیں ہو سکتا۔ اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور بھوت کو جتنے بھی لوگوں نے دیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سیاہ لبادے میں ہوتا ہے۔ دوسری بات، جب تم نے گوپال کو بھگانے کے لیے پتھر مارا تو وہ بھوت بھوت چلاتا بھاگا، یعنی وہ سمجھا کہ اسے پتھر بھوت نے مارا ہے، اس کا مطلب ہے، وہ خود بھوت نہیں ہے۔''

''پھر وہ قبرستان کیوں آیا؟''

''ہم کیوں آئے ہیں؟''

''بھوت کو رنگے ہاتھوں پکڑنے۔''

''اور وہ ہمیں پکڑنے۔''

اسے جیسے جھٹکا لگا۔ ''مگر اسے کیسے پتہ چلا؟ وہ تو آج شکار پہ جا رہا تھا۔''

''اس نے یقیناً وہ رقعہ پڑھا ہوگا اور چھپ کر تمہارا پیچھا کیا ہوگا، تمہیں واقعی راجپوتوں کی ملازموں پہ بھروسہ ہے؟''

''اوہ خدایا! مایا پریشان سی بولی۔ ''اگر وہ گاؤں میں ہے تو مجھے واپس جانا چاہیے۔ پھر کسی رات دوبارہ سے گھات لگائیں گے، ابھی تو مجھے خود خاصا خوف آ رہا ہے۔''

اس نے ٹوٹی پھوٹی قبروں کو دیکھ کر جھرجھری لی اور پھاٹک کی جانب بڑھ گئی۔

وہ چہرے پہ ڈھیروں تکان لیے اسے دور ہوتے دیکھتا رہا، اصل بات تو مایا کے لبوں پہ ادھوری دم توڑ کر کچے راستے کی دھول میں گم ہو گئی تھی۔

* * *

''گاؤں میں عجیب سی باتیں پھیل رہی ہیں۔'' صبح ناشتے کی میز پہ یہ پہلی غیر رسمی بات تھی، جو ٹھاکر رگھوناتھ نے اس سے کہی تھی۔ گوپال آج ناشتے پہ نہیں تھا، ٹھاکر رگھوناتھ نے اسے بتایا کہ وہ پچھلی شام سے شکار پہ گیا ہوا ہے اور اس نے فوراً یقین کر لیا تھا۔

''کیسی باتیں؟'' وہ آرام سے چھوٹے لقمے لیتی رہی۔

"جانے کس مردود نے پھیلائی ہیں؟ میں تو سوچ سوچ کر ڈر رہا ہوں کہ اگر یہ باتیں پھیلتی رہیں تو بھگوان جانے کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"ارے کیا بات ہوگئی ٹھاکر صاحب؟ کیوں پریشان ہیں؟" ہمدردی سے کہتے مایا نے ہاتھ روک لیا۔

"ایک تو ایف آئی آر والی بات، بھلے ہم شریکوں کو وضاحت دیتے پھریں کہ ہماری بٹیا کو غلط فہمی ہوگئی تھی، مگر کیا کہیے ان لوگوں کی، وہ کہتے ہیں کہ......" ہچکچا کر انہوں نے ان الفاظ کا چناؤ کیا، جو مایا کو گراں نہ گزریں...... کہ میم صاحب کو ٹھاکر قید کرنا چاہتے ہیں، اس کی جائیداد ہتھیانا چاہتے ہیں۔"

چنگیر پکڑے اندر داخل ہوتی روپا بے اختیار سینے پہ ہاتھ رکھتی خوف زدہ سی پیچھے ہوئی۔

"چچ چچ چچ......" مایا نے رومال سے ہاتھ صاف کر کے بہت افسوس سے انہیں دیکھا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ ایسی بات کس نے پھیلائی ہوگی؟"

پردے کی اوٹ میں کھڑی روپ وتی سر سے پیر تک لرز گئی۔

"معلوم نہیں، آپ کو ہے کچھ اندازہ؟"

"میرے لیے تو یہ ایک خبر ہے ٹھاکر صاحب! اندازہ کاہے کو ہوگا۔"

"خیر، اگر کوئی آپ سے اس سے متعلق استفسار کرے تو اسے واضح ضرور کر دیجیے گا کہ یہ محض بے بنیاد باتیں ہیں۔ ہماری ساکھ کو تباہ کرنے کی کوشش ہے۔" وہ چہرے پہ پریشانی و تفکر کی گہری لکیریں لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی روپ وتی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

"میم صاب! مجھے بچالو، میرے منہ سے غلطی سے نکل گیا تھا، رتن بوا یا زہرہ بی بی نے آگے کہہ دیا ہوگا، مگر بھگوان کے لیے میم صاب بڑے ٹھاکر کو نہ بتائیے گا کہ یہ بات مجھ سے آگے ہوئی ہے۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"بھئی مان گئے تمہارے ہندوستان کو۔" وہ رومال رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی، پاؤں آہستہ سے پیچھے کر لیے۔

"جہاں پرچہ ہوگا، نہ ہی ریڈیو، وہاں بھی شام ہونے سے پہلے ہر بات پھیل چکی ہوتی

ہے۔ جو سنا تھا، آج دیکھ بھی لیا۔''

اور روپا ششدر سی اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔ وہ جو سمجھی تھی کہ اس نے میم صاحب کو استعمال کر کے چھوٹے ٹھاکر سے ڈھیروں روپے بٹورے ہیں، آج اس پہ یہ انکشاف ہوا تھا کہ استعمال تو وہ خود ہوئی تھی۔

* * *

لکڑی کی میز پہ چاچی کپڑا بچھا کر اس کا کھانا رکھنے لگی۔ وہ آستینیں کہنیوں تک موڑتے ہوئے چارپائی پہ آ بیٹھا۔

راہداری سے آتی زہرہ ستون کے قریب ٹھٹک کر رکی۔

وہ صبح کا نکلا اب واپس حویلی آیا تھا۔ زہرہ نے اسے دو روز بعد دیکھا تھا۔ وہ فجر کے ساتھ ہی چلا جاتا تھا، پھر جانے رات کو کس وقت آتا، اسے تو پتہ ہی نہ چلتا...... اور اب کتنی اچانک سے وہ اسے دوپہر میں گھر میں دیکھ رہی تھی۔

وہ جھٹ ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ ہاتھ بے اختیار شانے پہ ڈھلکے آنچل کی جانب بڑھا اور سر ڈھانپ لیا۔ اسے لگا ایک دم سے ہی آنگن میں کہکشاں کے سارے ستارے اتر آئے ہوں۔

''یہ ڈاک آئی تھی شہر سے، فاضل دے کر گیا ہے۔'' چاچی نے پیلا لفافہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے مثالچی کا نام لیا۔

''اچھا۔'' وہ کھانے سے ہاتھ روک کر لفافہ الٹ پلٹ کرنے لگا۔

''پہلے روٹی تو کھا لے پتر!'' چاچی ساتھ ہی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

''کھاتا ہوں۔'' وہ مصروف سا لفافہ چاک کر کے اندر سے عدالتی کاغذ نکالنے لگا۔

''کیا لکھا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں، سوموار کو پیشی ہے، شہر جانا ہوگا۔'' وہ روٹی توڑنے لگا۔

''کدھر مصروف رہتا ہے آج کل، ماں کے لیے گھڑی دو گھڑی بھی نہیں ہے۔''

''بس کچھ کام تھے، خیر گھر میں سب ٹھیک ہے۔''

''کرم ہے مولا کا۔''

''بلقیس کی بیٹی کی شادی ہو گئی؟'' اس نے اپنی دائی کھلائی کا نام لیا تو چاچی نے اثبات میں

سر ہلا دیا۔

''ہاں، کل ہی رخصت ہوئی ہے۔''

''پیسے دے دیئے تھے؟''

''ہاں۔''

''اور زہرہ ٹھیک ہے؟ نظر نہیں آ رہی؟''

اور ستون کی اوٹ میں چھپی زہرہ کو لگا، اس کی ساری دعائیں مقبول ہو چکی ہوں۔ من زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ فکر بھری بے فکری اور اپنائیت بھری لاتعلقی...... یہی سب تو اسے بدر میں اچھا لگتا تھا اپنے لیے یا پھر اس کی آنکھیں اسے وہی دکھاتی تھیں جو دل و دماغ دیکھنا چاہتے تھے۔

''اچھی ہے۔''

اور وہ جو اندر آنے لگی تھی، بدر کی اگلی بات پہ رُک گئی۔

''زہرہ کا کیا سوچا ہے؟''

''سوچنا کیا ہے، سارا زیور کپڑا تیار ہے، اس جاڑے شادی کر دوں گی۔''

بدر کا منہ کو جاتا نوالہ لیے ہاتھ رک گیا۔ ''کس کے ساتھ؟''

''بدر!'' چاچی کو دھکا لگا تھا۔ ''تیری اور زہرہ کی بات بچپن سے طے ہے۔''

''اور جیسے بچپن گزر گیا، ویسے ہی وہ بات بھی گزر گئی اماں!''

''خبردار جو تُو نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ وہ جان دیتی ہے تجھ پر، اس کا ذہن تیرے حوالے سے بن چکا ہے۔''

''تو میں نے نہیں بنایا ذہن، تُو نے اور ابا نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کیا تھا، میں نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی، پھر میرا کیا قصور؟''

''تجھے وہ کسی قصور کی سزا لگتی ہے؟''

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔''

''تو کیا کہنا چاہ رہا ہے؟''

''اماں! اسے مجھ سے بہتر بر مل جائے گا۔''

''مگر، وہ تیرے نام سے منسوب ہے تو کیوں اس سے ناخوش ہے؟ ہے کوئی پورے گاؤں

میں اس سی سگھڑ، سلیقہ منداور حسین لڑکی؟''

''پھر میں خوش نہیں رہوں گا، اگر تُو یہ چاہتی ہے تو کر دے میری اس سے شادی۔'' وہ تیزی سے اٹھااور باہر نکل گیا۔

چاچی سینے پہ ہاتھ رکھے پریشان سی اسے جاتے دیکھتی رہی اور وہ جو ستون کی آڑ میں کھڑی تھی، نڈھال سی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

''تو پھر میں خوش نہیں رہوں گا۔''

''تو پھر میں خوش نہیں......''

''میں خوش نہیں......''

اس فقرے کی تکرار اس کے کانوں پہ ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ بہت سی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔ بچپن کی، لڑکپن کی، شعور کی، چوکھٹ کی، حسین یادوں کی، آوازیں اور پھر آوازوں کے اس ہجوم میں ایک مدھم مغرور سی آواز ابھری۔

''تمہاری چاچی ٹھیک کہتی ہے زہرہ! تم بھی کس کا غم کرتی ہو۔''

اور وہ چونک سی گئی۔

''میم صاب!'' نفرت، رقابت اور حسد کی ایک بھرپور لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی حویلی کے پچھواڑے کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔

* * *

بڑے ٹھاکر کو ہرگز علم نہ تھا کہ آج جب قسمت کی وہ دیوی ان کے در پہ دستک دے گی تو دروازہ وہ خود کھولیں گے۔

انہوں نے اتفاق سے اسی وقت پھاٹک کھولا ہی تھا کہ دستک دینے کو اٹھا زہرہ کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

''کون......؟'' وہ حیران ہوئے۔

سر کو سیاہ آنچل سے ڈھکے، سنہری دمکتی رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پیشانی پہ پڑے بل اور انگارے پھوٹتی آنکھیں، یہ سندر سی مہیلا کون تھی بھلا۔ انہوں نے پہلے تو اسے گاؤں میں نہیں

دیکھا تھا۔

''میم صاب کہاں ہے؟'' وہ غرائی۔ شاید جنون اور دیوانگی میں اس کے ہوش وحواس کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

''میم صاب سے ملنا ہے؟ رتن بوا!'' وہ حیرت چھپائے شائستگی سے بوا کو آواز دینے لگا۔ ''ان کو میم صاب کے کمرے میں لے جائیو۔''

''میں اس ڈائن کا کمرہ خود ڈھونڈ سکتی ہوں۔'' وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگتی اندر بھاگتی چلی گئی۔

''یہ کون ہے؟''

رتن بوا آگے بڑھی۔ ''یہ ملکوں کی دھی ہے، ملک بدر غازان کی منگیتر ہے۔''

ٹھاکر رگھوناتھ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

بدر کی منگیتر اور ان کی حویلی میں میم صاحب کو ڈائن کہتی جارحانہ انداز میں داخل ہوئی ہے؟ کیا گتھی ہے بھئی؟ مگر جب ذہن کے پردوں پہ مایا اور بدر کی ملاقاتوں کے چرچے لہرائے تو بطور اس کی منگیتر، اس لڑکی کا فطری ردعمل جان کر، جیسے ساری کہانی ان کی سمجھ میں آنے لگی۔

ہندوستان کے ہر گاؤں کی طرح ان کے گاؤں میں بھی کسی کا پردہ نہیں رہتا تھا۔ کون کیا کرتا ہے؟ اس کا علم ہر کسی کو یا کسی نہ کسی کو تو ضرور ہوتا تھا۔

وہ تیزی سے اندر لپکے۔

سیڑھیوں کے اوپر مایا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ زہرہ کی غصے میں بلند ہوتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو؟ تم بدر کو مجھ سے چھین لوگی؟''

ساری کڑیاں مل گئی تھیں۔ وہ فوراً باہر کو دوڑے، زندگی نے انہیں بدر غازان سے سارے بدلے چکانے کا ایک سنہری موقع دیا تھا، وہ اسے ضائع کیسے کر سکتے تھے؟

''رام ناتھ...... جسونت۔'' وہ نوکروں کو آوازیں دینے لگے۔ ایک انوکھا خیال ان کے ذہن میں بن رہا تھا۔ اگر سب چیزیں ویسی ہو جائیں، جیسے وہ سوچ رہے تھے تو......

''جی مہاراج!'' رام ناتھ دوڑتا ہوا آیا۔

''جا کر تھانے دار سے بولو، فوراً حویلی آئے، بڑے ٹھاکر نے بلوایا ہے، ان کی جان سے قیمتی اور اہم کام ہے۔ ان کو بول دیر نہیں کرنی اور تازہ دم گھوڑا لے جاؤ، جلدی۔''

ہدایات دے کر وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئے۔

* * *

''تم کیا سمجھتی ہو؟ تم بدر کو مجھ سے چھین لو گی؟'' زہرہ دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی اور وہ جو پلنگ پہ ٹیک لگائے بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھی، بے اختیار سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''تم خود کو سمجھتی کیا ہو، میم صاب؟ تمہیں لگتا ہے تم اسے مجھ سے چھین سکتی ہو؟'' آنچل سر سے ڈھلک کر شانوں پہ گر گیا تھا، مگر وہ عجب حالت جنوں میں بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ ''تم جانتی ہو، وہ میرے لئے کیا ہے؟ میں نے اس سے کتنا پیار کیا ہے؟ کیسے پاگلوں کی طرح بھاگی ہوں اس کے پیچھے اتنے برس؟ اور اتنے برس وہ صرف اور صرف میرا ہی تو تھا، اس پہ سارے حق میرے ہی تو تھے، مگر پھر......'' شدت جذبات سے اس کی آواز رُندھ گئی۔ ''پھر تم بیچ میں آگئیں۔'' آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

مایا اسی طرح پلنگ کی ٹیک سے کمر ٹکائے، گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم جانتی نہیں ہو، تم نے مجھ پہ کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تم نے اسے مجھ سے دور کر دیا ہے میم صاب! آج تمہاری وجہ سے اس نے مجھ سے شادی سے انکار کیا ہے۔''

وہ غصہ کہیں کھو گیا تھا، نہ نفرت تھی، نہ چیختی دھاڑتی آواز، بس وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''تم نے میرے سارے خواب توڑے ہیں، میرے حق پہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ تم ڈائن ہو میم صاب، مگر تمہیں کیا لگتا ہے، میں تمہیں اپنے ارمان، اپنے خواب لوٹنے دوں گی؟''

مایا اسی طرح گردن اٹھائے سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور......اور تمہیں لگتا ہے یہ لال چوڑیاں پہن کر تم پھر سے کنواری، اَن چھوئی بن گئی ہو؟ کیوں بھول گئیں کہ تم برتی ہوئی عورت ہو، ددھوا ہو تم، ٹھاکر شنکھر کو کھانے والی ودھوا۔ تم نے سمجھا تھا کہ یہ گاؤں کی جھلی لڑکی ہے، اسے تم ولایت سے آئی اپنی باتوں سے بہلا کر بدر پہ قبضہ کر لو گی؟'' طیش پھر سے اس کی آواز میں در آیا تھا۔ ''اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہیں بدر پہ قبضہ

کرنے دوں گی۔ جب تک میں زندہ ہوں، وہ شادی کرے گا تو صرف مجھ سے، ورنہ میں اسے بھی مار دوں گی اور خود کو بھی۔ وہ تمہیں بھی نہیں ملے گا میم صاب!''

وہ اب بھی کسی موی مجسمے کی مانند گردن اٹھائے اسے بے تاثر نگاہوں سے تک رہی تھی، زہرہ کو لگا اس کے پاس کہنے کو اب کچھ نہیں بچا، وہ پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

دروازے کی دھاڑ سے بند ہوتی آواز پہ مایا نے گود میں رکھی کتاب پھر سے کھول لی اور مگن سی پڑھنے لگی۔

* * *

سیڑھیاں اترتے زہرہ کی ذہنی حالت ابتر تھی۔ جنوں کے دشت میں کتنے برس اس نے ننگے پاؤں چلتے کاٹے تھے اور اب وہ کہتا تھا، اس نے تو کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی، کبھی اس کا ذہن اس حوالے سے نہیں بنایا تو پھر چاچی کیوں کہتی تھی کہ وہ اس کا پوچھتا تھا؟

شاید چاچی ٹھیک ہی کہتی تھی، وہ واقعی اس کا پوچھتا تھا، لیکن دائی کھلائی کی بیٹی کی شادی کا پوچھنے کے بعد، وہ تو اس کی ملازماؤں سے بھی ارزاں تھی۔

وہ آہستہ آہستہ زینے سے اتر رہی تھی۔ کالی چادر کا سرا جوتی کے نیچے آرہا تھا۔ ڈھیلی چوٹی سے چند ایک لٹیں چہرے پہ لٹک رہی تھیں، نگاہیں دور خلا میں جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔

''بٹیا رانی! آئیے نا۔'' سیڑھیوں کے دہانے پہ ٹھاکر رگھوناتھ کھڑے تھے، اسے زینے اترتے دیکھ کر نہایت شفقت سے ہاتھ کا اشارہ سامنے انگریزی طرز کے دیوان خانے کی طرف کیا، جہاں بڑے بڑے صوفے رکھے تھے۔

زہرہ نے آخری سیڑھی پہ قدم رکھتے سر اٹھا کر خالی خالی نگاہوں سے بڑے ٹھاکر کو دیکھا۔

''آیئے بٹیا رانی، ادھر بیٹھیے۔'' انہوں نے اس کا راستہ کچھ اس طرح سے روکا کہ جہاں اس کے بازو کا اشارہ تھا، زہرہ ادھر ہی مڑ گئی اور سیدھی چلتی صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''بھئی، آج تو آپ نے ہمارے غریب خانے کو رونق بخش دی ہے بٹیا۔ کہیے، کیا پئیں گی؟''

''ہاں......؟'' وہ ویران نگاہوں سے بڑے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔ اس کے حواس سن ہو چکے تھے۔ صحیح، غلط حتیٰ کہ شانے پہ ڈھلکے آنچل تک کا خیال نہ رہا تھا۔

''روپا دیوی۔'' بڑے ٹھاکر نے آواز دی تو روپا فوراً بغلی دروازے سے نکل کر حاضر ہوئی۔

''جی مہاراج!''

''ہماری بٹیا کے لئے شربت لے آیئے۔''

روپا نے ایک متاسف نگاہ زہرہ کے خود سے بے گانہ وجود پہ ڈالی۔ (کدھر پھنس گئی ہے؟ جی چاہتا ہے جھنجوڑ کر جگا دوں، مگر......) اور ہاتھ باندھے پلٹ گئی۔

''چھوٹے ملک کو علم ہے کہ آپ ادھر ہیں بٹیا؟'' اس نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلائی۔ بدر کی بے رخی اور خود پہ ڈھایا جانے والا یہ ظلم اسے جیسے بے خوف اور بے حس کر چکا تھا۔ سارے احساسات ہی مر گئے تھے۔

''بتایئے گا بھی نہیں اسے، وہ ہمیں پسند نہیں کرتا۔'' وہ قدرے راز داری سے گویا ہوئی۔ ''اور چنتا مت کیجئے گا، ہم بھی نہیں بتائیں گے۔''

اس نے بے توجہی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ تو شاید ٹھیک سے سن بھی نہیں رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ذہن میں وہی آواز گونج رہی تھی۔

''تو پھر میں خوش نہیں رہوں گا۔''

''بدر اچھا آدمی ہے۔ اس نے ہمیں بچا لیا، ورنہ میم صاحب نے تو ہم پہ کیس کر دیا تھا کہ ہم نے شیکھر کو مارا ہے۔ جی ہم کا ہے کو کریں گے ایسا شیطانی کام؟ مگر یہ تو بدر کا بڑا پن تھا کہ اس نے میم صاب پہ زور دے کر معاملہ سنبھال لیا۔ میم صاب بہت مانتی ہے بدر کی۔''

زہرہ نے اب کی بار سر بھی نہ ہلایا، وہ دیوار کو تکتے کہیں دور گم تھی۔

''تم بھی کس کا غم کرتی ہو زہرہ!'' مایا لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے تو دیتی ہے، مگر ان کا ہاتھ نہیں پکڑتی۔''

روپا نے چاندی کی تشتری اس کے سامنے کی جس میں شربت کیوڑہ سے بھرا جام تھا۔ زہرہ نے میکانکی انداز میں جام اٹھا لیا مگر منہ سے نہیں لگایا۔

''بدر بھی مایا دیوی کی بہت مانتا ہے، حالانکہ یہ حق تو آپ کا تھا بٹیا رانی! برا مت مانئے گا مگر بدر تو چلو مرد ہے، اس ڈائن کی باتوں میں آ گیا مگر آپ جیسی اچھی بٹی کا اس عورت سے دوستانہ؟''

''نہیں۔'' وہ بے اختیار بولی۔ ''دوست نہیں، ہرگز نہیں ہے۔'' اور سختی سے نفی میں سر کو جنبش

دی۔ تانبے کا منقش ٹھنڈا جام اسی طرح دونوں ہاتھوں میں جکڑا تھا۔ ''میں تو میم صاحب سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ وہ۔''

''کہنے......؟'' ٹھاکر رگھوناتھ نے حقے کی نے منہ سے نکالی اور حیرت سے اسے دیکھا۔

''جی وہ عورت تو کہنے سننے کی حد سے نکل چکی ہے۔ ہمارا تو جینا حرام کر رکھا ہے۔ حویلی پہ قبضہ، ملازموں پہ قبضہ، زمین، جائیداد کے معاملات؟ ہم سے بہتر انہیں کون سنبھال سکتا ہے؟ مگر نہیں جی، یہ عورت کہاں باز آنے والی ہے؟ مگر آپ کے ساتھ کیا کیا اس نے؟''

''بدر نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔'' بدر اور چاچی کے آپس کا راز کب اس مردہ سی ہوئی لڑکی کے لبوں سے پھسلا، اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ گوپال کا اس کے ساتھ رویہ، برسوں پرانی خاندانی دشمنی، اسے سب بھول گیا۔ شاید یہ بھی احساس نہ تھا کہ اس وقت وہ ٹھاکر رگھوناتھ کے سامنے بیٹھی ہے، بس یاد رہا تو صرف یہ کہ بدر نے اسے جس عورت کے لیے مسترد کیا ہے، اس کا یہ بھی دشمن ہے، سو اسے اس وقت ٹھاکر رگھوناتھ اپنے سب سے بڑے ہمدرد لگے تھے۔

''اور اس انکار کی وجہ یہ ہی عورت ہے؟'' ٹھاکر رگھوناتھ نے بے پناہ حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آپ جیسی سندرسی بٹیا کو وہ اس پھیکی گوری میم کے لئے چھوڑ سکتا ہے؟ ہائے بھگوان، یہ کیا ظلم کر دیا اس نے؟ کیا اسے نظر آنا بند ہو گیا ہے؟ کیا اس کی عقل ساتھ چھوڑ گئی ہے؟ ارے وہ آپ پہ یہ غضب کیسے ڈھا سکتا ہے؟''

زہرہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''وہ اس سے شادی کر لے گا۔''

''اور آپ کو لگتا ہے، ہم اپنی بیٹی کے ساتھ یہ ظلم ہونے دیں گے؟ ہمارے ہوتے ہوئے میم صاحب آپ کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے؟''

''آپ...... آپ اسے روک سکتے ہیں؟ آپ کچھ کر سکتے ہیں؟'' اس کی دیوانی محبت بلبلانے لگی۔

''کیوں نہیں؟ ہم اپنی بٹیا کے لیے سب کچھ کریں گے۔'' پھر حقہ گڑگڑایا اور کچھ سوچ کر بولے۔ ''بدر کو اس کے سحر سے نکالنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ میم صاحب واپس ولایت چلی جائے۔''

''کیسے......؟ کیسے جائے گی وہ؟''

''اس پہ کوئی زور دے، اسے کوئی زبردستی واپس بھیج دے، تب ہی وہ دفعان ہوگی۔ ورنہ تو کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''

''کون، کون زور دے سکتا ہے اس پہ؟'' وہ بے صبری سے بولی۔

''وہی جو بیلی کا بے تاج بادشاہ ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرائے۔ اسی رخ پہ حالات کو لے جانے کے لیے تو انہوں نے یہ بساط بچھائی تھی۔ ابھی چند روز قبل ہی تو گوپال نے انہیں بتایا تھا۔

''پتا جی! آج تو غضب ہی ہو گیا۔ بھگوان نے بچا لیا، ورنہ وہ ملک بدر کی منگیتر ایسی آفت شے ہے۔ میں چوہدری بوٹے کے کھیت سے گزر رہا تھا، ردی ساتھ تھا۔ (گوپال کا دوست) کہ تانگے پہ وہ اپنی خادمہ کے ساتھ جا رہی تھی، وہیں بیچ راہ کے تانگے کا پہیہ ٹوٹ یا۔ ہم مدد کے لیے گئے تو اس نے تو مانو جوتا اتار لیا۔ ایسی اتھری کڑی ہے، ردی اور میں جھٹ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ تو شکر کیجو کہ داروغہ اِدھر سے گزر رہے تھے۔ ہم نے انہیں آگے کر دیا، پھر وہی مدد کرتے رہے، مگر ایک بات ہے پتا جی! وہ لڑکی بہت سوہنی ہے، تب ہی تو، یہ پتھر سا نادر اسے دیکھ کر مبہوت سا کھڑا تھا، بعد میں پوچھا بھی کہ یہ تھی کون؟ میں نے تو کہہ دیا، میں کیا جانوں، مسلمانوں کی لڑکی لگتی ہے۔ وہ چپ ہی کر گیا، مگر مسرور بھی تھا، لیکن سارا سرور نکل جائے گا، جب علم ہوگا کہ وہ ملک بدر غازان کی منگیتر ہے۔ لکھ لیجو پتا جی! اس لڑکی کے لیے کوئی قتل کر بھی سکتا ہے اور ہو بھی سکتا ہے۔ یہ ملک بدر کو خون خرابے میں ضرور پھنسائے گی۔''

اور وہ بات ان کے دل کو ایسے لگی کہ وہ کوئی سبب بننے کی دعا کرتے رہے اور آج ان کی ساری دعائیں مقبول ہو چکی تھیں۔ بس اگر سب کچھ ویسا ہی ہو جائے، جیسے وہ سوچ رہے تھے تو۔

''کون ہے بیلی کا بے تاج بادشاہ؟''

''وہی بٹیا رانی جو ہمارے ہند کے ہر گاؤں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ تھانے دار بادشاہ۔'' اور اسی پل خادم نے اطلاع دی۔

''داروغہ جی تشریف لاتے ہیں مہاراج!''

''اندر لے آؤ۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

خادم کے پیچھے انسپکٹر نادر شاہ داخل ہوا۔ ہاتھ میں چھڑی تھی اور وردی میں ملبوس تھا۔

''آداب بڑے ٹھاکر!''

بڑے ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔''بیٹھیے مہاراج۔''

نادر شاہ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اردگرد جائزہ لیتی نگاہ دوڑائی اور ایک دم ٹھٹکا۔ سامنے صوفے پہ وہ گم صم سی لڑکی بیٹھی تھی، جس کی سیاہ چادر شانوں پہ ڈھلکی تھی اور ڈھیلی چوٹی میں سے بال نکل کر چہرے کے گرد بکھرے تھے۔ کچی عمر کی معصومیت چہرے پہ بکھری تھی۔ ماتم کناں سی سوگوار آنکھیں دیوار پہ مرکوز کیے وہ کہیں دور گم تھی۔

نادر شاہ کو بے اختیار وہ سہانی شام یاد آ گئی، جب اس نے یہ چہرہ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ایک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔

تانگے کے ایک طرف کھڑی جھنجلاتی لڑکی...... سیاہ چادر کے ہالے میں مقید سنہری دمکتا چہرہ اور چادر میں سے جھلکتے بڑے بڑے چاندی کے جھمکے۔ بار بار ماتھے پہ جھولتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستی...... مدد کے لیے شکرگزار ہوتی، عجلت میں تانگے پہ دوبارہ چڑھتی لڑکی، اسے ایک ایک پل یاد تھا۔ وہ اسے بھولا ہی کب تھا۔

بڑے ٹھاکر نے اس کا ٹھٹکنا اور مبہوت ہونا بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ زیرلب مسکرا دیے، تیر بالکل نشانے پہ لگا تھا۔

''مہاراج!'' ان کے پکارنے پہ وہ سنبھل گیا۔

''جی ٹھاکر صاحب! ان سے ملوانا تھا آپ نے؟''

نادر شاہ کا معاملہ بدر سے مختلف تھا۔ وہ بیلی کا تھانے دار بادشاہ تھا اور اس بادشاہت کو قائم و دائم رکھنے کیلئے جہاں اس کو سب پہ اپنا رعب و دبدبہ رکھنا ہوتا تھا۔ وہاں درپردہ دوستیاں اور تعلقات بھی قائم رکھنے ہوتے تھے۔ ٹھاکروں سے اس کی اتنی ہی اچھی دوستی تھی، جتنی بدر غازان سے تھی۔ اسے علم تھا کہ ٹھاکر اس کی ڈکیتی کی وارداتوں سے آگاہ تھے۔ سو وہ بھی ان کے کئی دھندوں سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ غیر قانونی شراب کے بنانے میں ٹھاکروں کا پورا خاندان لوث تھا، مگر کوئی انہیں گرفتار نہ کرتا تھا۔

نادر شاہ سے علاقے کے لوگوں کو شکایت ہرگز نہ تھی۔ وہ تفتیش اور سراغ رسانی کے امور کا ماہر

سمجھا جاتا تھا۔ نقب لگے راہزنی کی واردات ہو یا دن دہاڑے دہرے قتل کا واقعہ ہو۔ وہ پوری جانفشانی سے تفتیش کر کے مجرموں کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ ایک طرف اس نے لوگوں کو ان کے کام کر کے رام کر رکھا تھا تو دوسری طرف ٹھاکروں اور بدر غازان کو ان کی کمزوریاں ڈھونڈ کر۔

بدر غازان جیسا شخص اسے اپنی ڈکیتیوں کا پردہ رکھنے کے لئے چاہیے تھا۔ ایسا شخص جسے وہ ایک باغی ہیرو کے طور پہ پیش کر سکے، جو بس یہ جانتا ہو کہ یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے، جسے انگریزی سامراج سے بغاوت کا جھانسہ دے کر، اپنے تئیں رابن ہڈ بنا کر وہ ہتھیایا ہوا سارا مال خود ہضم کر لے، اتنی صفائی سے کہ کسی کو علم نہ ہو۔

گاؤں میں نادر شاہ اور بدر غازان بہت مضبوط حلیف تصور کیے جاتے تھے۔ اتنے بہترین دوست جن کے پکے اتحاد کے باعث ان کو ضرر پہنچانا مشکل تھا اور اس پکے اتحاد میں جب راہزنی کی ادھوری واردات کی دراڑ پڑی تو بڑے ٹھاکر کو یہ خبر سنتے ہی ایک امید سی بندھ چلی تھی کہ وہ کوئی پتا کھیل کر نادر شاہ کو بدر کی پشت پناہی سے ہٹا سکتے ہیں۔

''ہماری بٹیا رانی آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں، انہیں کچھ شکایتیں تھیں، بولو بٹیا!''

زہرہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔

سامنے صوفے پہ بیٹھا تھانے دار اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر ڈھلکا آنچل سر پہ درست کیا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ کہیں کچھ بہت غلط ہو گیا تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا، وہ غلط جگہ پہ غلط لوگوں کے بیچ بیٹھی ہے۔

''بتائیے بٹیا! داروغہ جی کسی کو بھی گھنٹے بھر میں دھکے دے کر گاؤں سے نکلوا سکتے ہیں۔'' اور اس نے یقین کر لیا۔

''داروغہ جی! آپ مایا میم صاحب کو یہاں سے نکلوا دیں۔''

نادر شاہ بری طرح سے چونکا۔ ''میم صاحب کو؟ مگر کیوں؟''

''وہ ڈائن میرے گھر میں فساد ڈال رہی ہے۔''

بڑے ٹھاکر اس اثنا میں اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے تاکہ دونوں کو بظاہر تنہائی دے کر وہ پردے کے پیچھے سے تمام گفتگو بھی بآسانی سن سکیں۔

''کس قسم کا فساد؟ بی بی کچھ وضاحت کریں۔'' (جانے یہ اتنی خوب صورت لڑکی کون تھی؟)

''وہ میرے منگیتر پہ ڈورے ڈال رہی ہے،وہ اسے مجھ سے الگ کر دے گی۔''

''منگیتر؟'' یہ لفظ نادر کو چابک کی طرح لگا تھا۔

''کون......کون ہے آپ کا منگیتر؟ ٹھاکروں کا کوئی لڑکا؟ آپ ٹھاکروں کی کیا لگتی ہیں؟''

''نہیں، نہیں ٹھاکر نہیں، میں تو مسلمان ہوں، زہرہ......زہرہ ہے میرا نام۔'' وہ بے ربط بول رہی تھی۔

''زہرہ!'' نادر نے زیر لب دہرایا۔ ''کون ہے آپ کا منگیتر؟''

''بدر جی، ملک بدر غازان۔ وہ میرے چاچے کا لڑکا ہے۔''

''کیا......؟'' نادر شاہ کو کرنٹ لگا تھا۔ تو یہ تھی بدر کی وہ منگیتر، جس کے حسن کے قصے اس نے سن رکھے تھے اور دل میں کئی بار دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوا تھا۔

''مگر تم ادھر ٹھاکروں کی حویلی میں، کیا یہ تمہیں زبردستی لائے ہیں؟''

''اجی ہم زبردستی لائے ہوتے تو آپ کو تو نہ بلاتے داروغہ جی!'' بڑے ٹھاکر اسی پل کمرے میں داخل ہوئے۔ زہرہ سے کچھ بعید نہ تھا، وہ کیا کہہ دے۔ ''اس میم صاحب کی وجہ سے اگر اس بچی کی منگنی بدر سے ٹوٹ گئی تو شریکوں میں کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ اسی لیے تو خود حویلی آئی تھی کہ مایا دیوی کو خبردار کر سکے، مگر وہ عورت تو۔ بھگوان کی سوگندھ کہنے سننے کی حد میں ہی نہیں ہے۔ یہ اس سے بات کر کے روتی ہوئی نیچے آئی تو ہمیں تو مانو بہت دکھ ہوا۔ سو فوراً آپ کو بلا بھیجا کہ اس معاملے کو حل کروائیں۔ بدر کو تو بلانے سے رہے جی! وہ تو ہماری شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔''

یہ وہ وقت تھا، جب گاؤں کے سارے مسئلے حل کروانے لوگ تھانے دار کے پاس شکایت لے کر جاتے تھے۔

نادر، زہرہ کی جانب متوجہ ہوا۔

''بدر کو علم ہے کہ تم اِدھر ہو؟''

''نہیں......'' وہ گھبرا اٹھی۔ ''خدارا آپ انہیں مت بتایئے گا۔''

''تمہیں اِدھر نہیں آنا چاہیے تھا، تمہارے اور ٹھاکروں کے خاندان کی عداوت بہت پرانی ہے۔''

''اور جب وہ خود میم صاحب کے ساتھ ہوتا ہے، تب وہ عداوت کہاں جاتی ہے؟'' اس کی

آنکھیں جھلملانے لگیں۔

''میم صاحب کی بات اور ہے، وہ راجپوت نہیں ہے۔ آج اِدھر ہے تو کل چلی جائے گی، پھر......''

''وہ واقعی چلی جائے گی؟'' اس نے بے صبری سے بات کاٹی۔ ''کیا آپ اسے یہاں سے بھیج سکتے ہیں؟''

''میں دیکھوں گا، کیا کسی اور کو علم ہے کہ تم اِدھر ہو؟''

''نہیں......'' وہ بے اختیار گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ شربت کا جام قالین پہ رکھ دیا۔ ''میں، میں چلتی ہوں۔'' کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی سمت بھاگتی چلی گئی۔

''میں ابھی آیا۔'' نادر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ برآمدے تک ہی پہنچی تھی، جب اس نے اسے روکا۔

''زہرہ......سنو۔''

''جی......؟'' وہ پلٹی۔ چادر کا گھونگھٹ ٹھوڑی سے ذرا اوپر اس نے انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔

''شام کو تھانے آ جانا، وہیں پوری بات کریں گے۔ فکر نہ کرو، میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔''

''آپ بدر کو مت بتایئے گا۔'' وہ قدرے خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

''میں اسے نہیں بتاؤں گا، مگر آئندہ ٹھاکروں کی حویلی مت آنا نادان لڑکی! ان کا لڑکا اچھے قماش کا نہیں ہے۔''

''میں تو بس میم صاب سے۔''

''ارے جہنم میں گئی میم صاب۔ اس الٹی کھوپڑی کی عورت سے سر نہ پھوڑو۔ جاؤ گھر اور بعد میں تھانے آ جانا۔''

وہ شرمندہ سی ہو گئی اور خائف بھی۔ ''مگر خدارا آپ بدر کو نہ بتایئے گا۔''

''نہیں بتاؤں گا۔'' اسے معلوم تھا، اب اسے بدر سے بہت کچھ چھپانا پڑے گا۔

وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی اور نادر شاہ اس کامنی سی لڑکی کو یک ٹک دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ وہ

پھاٹک پار کر گئی اور اسے لگا کہ پل بھر میں راجپوتوں کی اونچی حویلی ویران ہو گئی ہے، جیسے وہ سندر ناری سارے رنگ اپنی کالی چادر میں چھپا کر لے گئی ہو۔

جب وہ بڑے ٹھاکر سے رسمی باتیں کر کے رخصت ہوا تو اسی وقت گوپال اندر داخل ہوا۔

''پتا جی! بوا بتا رہی تھی کہ ملکوں کی دھی آئی تھی۔'' وہ حیران سا ان کی جانب آیا۔''اور داروغہ جی؟''

ٹھاکر رگھوناتھ کے چہرے پہ گہری ہوتی شاطر مسکراہٹ دیکھ کر اس نے فقرہ لبوں پہ روک دیا۔

''کیا چکر ہے پتا جی؟'' وہ متجسس سا ان کے قریب آ بیٹھا۔

''ہمارے پرکھے کہہ گئے ہیں پتر کہ انسان میں تین طرح کے جھگڑے ہوتے ہیں، زن، زر اور زمین کے۔ ہم نے سوچا، اگر بدر غازان اور نادر شاہ، زر اور زمین پہ نہیں جھگڑتے تو زن پہ ضرور جھگڑیں گے۔''

''معلوم نہیں پتا جی!'' وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔''وہ سالا کیوں جھگڑے گا اس عورت پہ؟ وہ تو میم صاب کے چکر میں ہے۔''

''بھاڑ میں جائے میم صاب۔'' وہ بدمزہ ہوئے۔

''سالی نے ہمیں کس گورکھ دھندے میں پھنسا دیا ہے۔ جانے کون مار گیا شیکھر کو اور اس عورت نے عذاب گلے ڈال دیا۔ نادر شاہ جتنا ہمارا دم بھرے، اگر اس کا اپنا مفاد ہو تو ہمیں دھرنے سے گریز نہیں کرے گا اور ابھی ہم مکمل طور پر اس کیس سے نہیں نکلے۔'' اور اوپر اپنے کمرے سے نکلتی مایا ٹھہر گئی۔

''تو کیا یہ دونوں شیکھر کے قتل میں واقعی ملوث نہیں؟'' وہ حیران سی سوچتی رہ گئی۔''پھر کون قتل کر سکتا ہے اسے؟''

پھر سر جھٹک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کی جوتوں کی ٹک ٹک پر ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے نیچے اترتے پا کر بالکل خاموش ہو گئے۔ وہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کیے باہر نکل آئی۔

ابھی روپا نے اسے بتایا تھا کہ کھوجی کرم الٰہی اس سے ملنے آیا ہے۔ کہتا ہے کوئی ضروری کام

ہے، وہ اسی لیے نیچے آئی تھی۔

''روپا!'' اس نے برآمدے کی سیڑھیاں اترتی روپا کو روکا۔ ''کھوجی کدھر ہے؟''

''وہ کھڑا ہے جی!'' اس نے پھاٹک کی جانب اشارہ کیا، جہاں کھوجی پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا تھا۔

''اچھا اور سنو، زہرہ چلی گئی۔''

''ہاں جی۔''

''اور کس کو بلوایا تھا کرنے؟ مجھے دیوان خانے سے بولنے کی آوازیں اوپر آ رہی تھیں۔'' انداز سرسری سا تھا۔

''داروغہ جی آئے تھے، معلوم نہیں خود آئے تھے کہ بلوایا گیا تھا۔''

''ہوں ...... ٹھیک ہے، جاؤ۔'' وہ اس کی بات پہ غور کرتی کھوجی کی طرف آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ بے چینی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

''سلام میم صاحب!''

''خیریت کرم الٰہی۔'' اس کی ساری حسیات جاگ اٹھیں۔

''جی میم صاب!'' اس کے انداز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ ''کچھ دکھانا تھا آپ کو۔''

''کیا......؟'' وہ چونکی۔ کیا وہ کھرے کا کوئی سراغ پا چکا تھا۔

کھوجی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ جگہ رازدارانہ گفتگو کے لیے نامناسب تھی، سو اشارہ کیا ادھر آیئے۔ وہ سمجھ کر اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔

چند کچی دھول اڑاتی پگڈنڈیوں پر اپنے عقب میں اسے چلاتا وہ اسے مرکزی تھانے سے قریب لے آیا۔

''یہ کھرا دیکھئے۔'' زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھ کر کھوجی نے کچی پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا۔ مایا نے قدرے جھک کر پلکیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ کسی جوتے کا صاف اور واضح نشان تھا، جو مٹی نے خود پہ ثبت کر لیا تھا۔

''یہ وہی کھرا ہے، جو اس روز ہم نے کچے راستے پہ تلاشا تھا۔''

''ہوں۔'' وہ سوچ میں گم کھرے کو دیکھتی رہی۔ ایک قطار میں تازہ کھرے بنے تھے، جو

تھانے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

"یہ کس کا کھرا ہو سکتا ہے؟"

"معلوم نہیں میم صاب! لیکن یہ بالکل تازہ کھرا ہے، ابھی ہوا نے اسے نہیں چھیڑا۔ معلوم پڑتا ہے کہ کوئی ادھر سے گزر کر ابھی تھانے گیا ہے، مگر واپسی کا کھرا نہیں ہے، یا تو وہ شخص کسی دوسرے راستے سے واپس گیا ہے، یا پھر ابھی وہ تھانے میں ہی ہے۔"

"تم نے نادر شاہ کو آگاہ کیا؟"

"نہیں، میں نے سوچا، پہلے آپ کو خبر کر دی جائے۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"بہت اچھا کیا، ابھی تھانے دار کو آگاہ بھی مت کرنا، مجھے خود اس کھرے کو ڈھونڈنے......"

"کوئی آ رہا ہے میم صاحب، اِدھر آ جائیے۔"

وہ دونوں بے اختیار درختوں کی باڑھ کے پیچھے ہو گئے تا کہ آنے والا ان کو نہ دیکھ سکے۔

"یہ تمہارا انعام۔" مایا نے اپنے بٹوے میں سے کچھ روپے نکال کر اسے دیئے۔

"نہیں میم صاحب! میں نے اس لیے تو نہیں بتایا تھا۔" مگر اس کا انکار رسمی تھا۔ اس نے روپے پکڑ ہی لیے اور جب وہ سر جھکائے بٹوہ بند کر رہی تھی، کھوجی لپک کر آگے گیا اور جانے والے کا کھرا پڑھنے لگا۔

"میم صاحب!" یک دم وہ آہستہ آواز میں جوش سے چیخا۔ "یہی ہے اسی کا کھرا ہے، یہ ہی وہ شخص ہے جو ٹھاکر شیکھر سے ملا تھا۔"

مایا درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے قریب آئی اور کھرے کے تعاقب میں تلاشنا چاہا۔

"کون......؟ کدھر؟" وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"وہ، اس طرف وہ جو اِدھر جا رہا ہے۔ یہی وہ شخص ہے۔" کھوجی نے انگلی سے اشارہ کیا۔ مایا نے اس کی انگلی کے تعاقب میں گردن قدرے اونچی کر کے دیکھنا چاہا اور اگلے ہی پل وہ ساکت رہ گئی۔

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ سخت استعجاب کے عالم میں کھوجی کی جانب مڑی۔ "یہ...... یہ شخص نہیں

ہوسکتا،تم سے غلطی ہوئی ہے۔''

''برسوں سے یہ کام کررہاہوں میم صاب!اب غلطی نہیں ہوتی۔''

کھوجی نے قدرے برامانا،مگر پھراس نے محسوس کیاوہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔وہ بے یقینی سے نفی میں سرہلاتی پگڈنڈی پہ دورہوتے فردکودیکھ رہی تھی۔اس کے چہرے پہ ایسی بے بسی تھی کہ جیب میں نوٹ اڑستے کرم الٰہی کولگا،وہ پل بھر میں کسی دوسری عورت سے متعارف ہوا تھا۔وہ تنتنے اوررعب داب والی میم صاب تو کچی مٹی پہ گم ہونے والے نشانوں کی طرح کہیں دھول میں کھوگئی تھی۔

* * *

''زہرہ کیسی ہے؟''

شام میں جب وہ حسبِ معمول کنویں کی منڈیر پہ بیٹھے تھے،اس کی کسی بات کے جواب میں مایانے اچانک پوچھا،ساتھ ہی بغوراسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے لاپروائی سے شانے اُچکائے۔

''نظرنہیں آئی کافی دنوں سے؟''وہ پلک جھپکائے بغیر بدرکاچہرہ پڑھ رہی تھی۔

''ہمارے خاندان کی عورتیں زیادہ باہرنہیں نکلتیں۔''

''مگر جب میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھاتووہ مجھے باہرہی ملی تھی۔''

''کسی کام سے نکلی ہوگی،قدرے لاپرواہےمگرشعور کے ساتھ ساتھ سمجھ داری آتی جارہی ہے۔''

''اچھا''وہ ہولے سے ہنسی۔''خیریت پوچھ لینااس کی میری طرف سے۔''

''پوچھ لوں گا۔''اوررات میں کھاناکھاتے ہوئے اسے یادآیاتوایک دم زہرہ کوپکاربیٹھا۔

''کمرے میں ہے،شایدحاجراں سےلڑائی ہوگئی ہے،جب سےاس کے گھرسے آئی ہے۔کمرہ بندکرکےبیٹھی ہے،ٹھہر،میں بھیجتی ہوں۔''چاچی کالہجہ خوشی سے کِھل اٹھا۔اسے لگاشایدبدرکو اپنی غلطی کااحساس ہوگیاہے۔

''اُٹھ زہرہ!بدربلارہاہے۔''چاچی نے اس کے کمرے کادروازہ کھولتے ہی خوشی خوشی بتایا۔

وہ جو آنکھوں پہ بازو رکھے سست سی پلنگ پہ لیٹی تھی، ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دماغ میں کہیں خطرے کی گھنٹی بجی۔ دوپہر کی نادانی ابھی بھولی کہاں تھی۔

''مم، مجھے کیوں بلا رہا ہے؟''

''کوئی بات کرنا چاہتا ہوگا۔'' اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر چاچی نے تسلی دی۔

''اسے بول دو میں سو رہی ہوں۔'' وہ گھبرا اٹھی تھی۔

''غلط ہے زہرہ! چل اٹھ، جلدی کر۔''

اور چار و ناچار اسے جانا ہی پڑا۔

''جی۔'' بمشکل ہی وہ اس کی چارپائی کے کنارے ٹک پائی، جیسے ابھی بھاگنے کو تیار ہو۔

''کوئی کام تھا؟''

''نہیں کام نہیں تھا، مایا......'' پھر رک کر جیسے تمہید باندھی۔ ''دراصل شام میں مایا میم صاب سے ملاقات ہوئی تھی، وہ تمہارا پوچھ رہی تھی۔''

زہرہ کا تو جیسے خون خشک ہوگیا۔ اسے یہ کیوں بھول گیا تھا کہ تھانے دار اور ٹھاکر جی کو جتنا منع کر لے، سب سے پہلے تو بدر کو میم صاب بتائے گی، خدایا وہ کہاں جائے؟

''کک......کیا پوچھ رہی تھیں؟''

''حال پوچھ رہی تھی، کہہ رہی تھی، عرصہ ہوا تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سو تمہاری فکر تھی۔'' وہ کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

زہرہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''بس یہی کہا انہوں نے؟''

''ہاں۔''

''اور کچھ نہیں کہا؟''

''اور کیا کہنا تھا؟'' وہ برتن پرے کھسکا تا اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''حویلی آنے کا نہیں بتایا؟'' بے اختیار لبوں سے پھسلا۔

''کیا......؟'' وہ سمجھا نہیں تھا۔

''میرا مطلب ہے، انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ہماری حویلی کب آئیں گی؟'' پورے دن

میں اس نے پہلی عقل کی بات کی تھی۔

''نہیں۔'' وہ بٹوہ جیب میں ڈالتا باہر چلا گیا، وہ اس کے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔

''میم صاحب نے بدر کو کیوں نہیں بتایا؟''

وہ برآمدے کی خاموش دیواروں سے پوچھ رہی تھی۔

* * *

وہ تھانے میں چوہدری دلاور کے ساتھ بیٹھا تھا، کسی جھگڑے کی صلح صفائی کروا رہا تھا، جب ایک سپاہی نے آکر اطلاع دی۔

''باہر کوئی عورت آئی ہے شاہ صاب! آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''کون ہے.....؟'' وہ جو دوسرے معاملے میں پوری طرح سے منہمک تھا، اُلجھ کر پوچھنے لگا۔

''نام نہیں بتاتی۔''

''[illegible] کو کہو سویرے آنا، میرے پاس ابھی وقت نہیں ہے۔ جی چوہدری صاب! گل یہ ہے کہ [illegible] وہ لوفت چھپاتا واپس ادھر متوجہ ہو گیا۔ سائلین صبح شام شکایات لے کر آتے رہتے تھے، کسی بڑی واردات یا قتل کا قصہ ہوتا تو وہ عورت یقیناً کسی اہلکار کو بتا دیتی۔ یقیناً کوئی ذاتی نوعیت کا کام ہوگا، سو اس نے اہمیت نہ دی۔

چوہدری دلاور کا معاملہ نپٹا کر وہ نقب زنی کی ایک جائے واردات پہ چلا گیا۔

سکھوں کے ایک سرکردہ خاندان کی حویلی میں نقب لگا کر رات کو چوری ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ قبل مرنے والا چوہدری منگل سنگھ اسی خاندان کا فرد تھا۔

اس نے کھرے اٹھوائے، تفصیل سے رپورٹ بنائی، گھر والوں کے بیانات لیے، نمبردار کو تھانے بلوا کر اس خاندان کے بارے میں چند معلومات لیں، غرض جب وہ اس کارروائی سے فارغ ہوا تو شام ڈھل گئی تھی۔

''وہ عورت چلی گئی تھی؟'' ابتدائی تفتیش کی رپورٹ رقم کرتے ایک دم یاد آنے پہ اس نے سپاہی کو بلا کر دریافت کیا۔

''ہاں جی، وہ کچھ کہے بنا ہی چلی گئی۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوا۔'' جانے کون تھی؟ کوئی نام پتا نہیں بتایا۔''
''نہیں جی۔''
''شکل، حلیہ کیسا تھا؟'' وہ اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ کون تھی۔
''چہرہ چھپا رکھا تھا، آواز سے تو کم عمر لگتی تھی، آنکھیں خوب صورت تھیں، کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔''

''کالی چادر۔'' وہ بے اختیار چونکا۔
اوہ خدایا، کیسے بھول گیا اسے کہ وہ تھانے آئے گی، شاید اسے اندر سے اُمید ہی نہ تھی کہ وہ واقعی آ جائے گی اور اب اگر آ ہی گئی تھی تو کیسی غلطی ہوگئی رہا۔
''یہ بات تم مجھے پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟ کل اگر وہ آئے تو مجھے فوراً اطلاع کرنا۔'' وہ خوامخواہ سپاہی پہ غصہ نکالنے لگا۔ پھر اس کے جانے کے بعد اُکتا کر فائلیں پرے کر دیں اور کرسی پہ دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔
ذہن کے پردوں پہ فلم کی طرح کل کے مناظر چلنے لگے۔ وہ گم صم سی گھبرا کر کھڑی ہونے والی لڑکی، کپکپاتی انگلیوں سے تھاما کالی چادر کا کونہ، بڑی بڑی سندر آنکھوں میں اتری وحشت۔
نادر شاہ نے اپنی زندگی میں ایسی لڑکی پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ پہلی دفعہ کسی نے اس کے دل پہ دستک دی تھی اور پہلی دفعہ اسے بدر سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔
شاید وہ لاشعوری طور پر اپنا اور بدر کا موازنہ کرنے لگا تھا۔

* * *

گھنیری رات پھر سے پرانے قبرستان پہ اتر آئی تھی۔
برگد کی چھایا تلے وہ دونوں پھر سے موجود تھے۔ گوپال اس رات جانے کہاں تھا؟ بدر نے پوچھنا ضروری نہ سمجھا تھا۔
''ایک سوال کروں مایا؟'' وہ قبرستان کے نادیدہ بھوت کی باتیں کرتے کرتے ایک دم سے گفتگو کو کسی اور موڑ پہ لے جانے لگا۔
''پوچھو۔'' وہ تنے سے سر ٹکائے اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی، جو کالے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ چاند اور تارے جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔

''تم نے کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں اس شام دلہوزی میں کیوں تھا؟''

''میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم اس صبح جنگل میں کیوں تھے؟''

بدر نے دیکھا، وہ موتیوں کی لڑی اسی طرح اس کے بالوں سے لٹک رہی تھی۔

''لڑی کتنی لمبی تھی نا۔'' بدر نے انگلی سے موتیوں کو چھوا۔ وہ بے حس و حرکت اوپر دیکھتی رہی۔ ''تم نے کیوں توڑا تھا اسے؟''

''پہلے بتایا تھا نا، یہ شاہی خاندان کا دستور ہوتا ہے۔''

اس نے لڑی چھوڑ دی، وہ ہولے سے مایا کے کندھے پہ آن گری۔

''تم اس شام دلہوزی میں کیوں تھے؟'' سیاہ بادل ہلکے ہلکے گرجنے لگے تھے۔

''دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح پہ گیا تھا۔ وہ آگے نکل گئے اور میں پیچھے رہ گیا، معلوم ہی نہ ہوا کہ کب سانپ نے کاٹا اور......''

''اور تمہارے دوست؟''

''بارش ہولے ہولے برسنے لگی۔ برگد کی بوڑھی شاخوں نے بوندوں کا راستہ روک لیا، مگر سامنے قبریں گیلی ہونے لگیں۔

''تم نے نیچے جا کر جن لوگوں کو بھیجا تھا، وہ مجھے ہسپتال لے گئے تھے، بعد میں میرے دوست بھی مجھے تلاش کرتے ادھر آ گئے تھے۔''

''تمہارے دوست کون؟ وہ نادر شاہ؟''

''ارے نہیں، وہ بس گاؤں کا یار ہے۔ ہم دونوں میں مماثلت یہ ہے کہ دونوں کو فرنگیوں سے نفرت ہے اور ان کا یہاں بالخصوص شکار کے لیے آنا سخت ناپسند ہے مگر جب ہم نے ماکھا کے ساتھ مل کر ان کو لوٹنا شروع کیا تو فرنگی بیلی آنے سے گھبرانے لگے، ماکھا یہاں کا ایک نامی گرامی ڈاکو ہے، اس روز بر چھیت وہی تھا۔''

''میں بھی تو فرنگی ہوں بدر۔''

ایک لمحے کو بجلی زور کو چمکی، پورا قبرستان روشن ہو گیا۔ گیلی قبروں پہ قطرے موسلا دھار برس رہے تھے۔ دوسرے ہی پل اندھیرا چھا گیا۔

''تمہاری بات اور ہے، کمپنی بہادر کے صاحب لوگ کاروبار کرنے ادھر آئے تھے، پھر

یہاں قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔"

"ہندوستان کے باقی لوگ بھی کمپنی بہادر سے نفرت کرتے ہیں؟"

"کرتے تو سب ہی ہیں، اظہار کوئی کوئی کرتا ہے۔"

"تو اس صورت حال کا کیا بنے گا؟"

"جب فرنگی یہاں سے جائیں گے تو مسلمان ادھر ہندوستان میں ایک الگ ریاست بنائیں گے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔

"تم کس دنیا میں رہتے ہو بدر؟ فرنگی یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے، وہ سو سال بعد بھی ادھر ہی ہوں گے۔"

"[illegible] تم ..... تم کب تک ہوگی ادھر؟" اس نے لاحاصل سیاسی بحث سے بچنے کے لئے بات [illegible] بارش مدھم ہوتے رک چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔

"[illegible] معلوم نہیں۔"

"[illegible] سے ایک سوال [illegible] جواب [illegible] رہے۔" وہ کچھ نہیں بولی تو وہ تھک کر خود ہی کہنے لگا۔

"جب میں [illegible] ٹھیکر کی ذہن [illegible] کے بارے میں سنا تو مجھے لگا کہ یہ بیلی کی وہی مہارانی ہے، جس نے میری جان بچائی تھی اور بگھی میں تمہارا چہرہ دیکھ کر مجھے یقین سا ہو چلا تو میں لاشعوری طور پہ تمہارا انتظار کرتا رہا۔ ہر جگہ، ہر وقت، میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیا ہے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے کبھی نہ جاؤ۔"

"اور زہرہ کہاں جائے گی؟"

"اسے کوئی بھی مجھ سے بہتر مل جائے گا۔ میں بس....." بات اس کے لبوں پہ ہی رہ گئی۔

قبرستان کے پھاٹک کے ساتھ ساتھ ایک ہیولہ سا گزر رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" مایا سرگوشی میں بڑبڑائی اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

"شاید وہی بھوت۔" بدر کے اندر جوش سا ابھر گیا۔

"یہ تو....." وہ جیسے پہچان گئی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا وہ تیر کی تیزی سے اٹھی اور لپک کر دوڑتی ہوئی اس تک جا پہنچی اور وہ جو اسے دیکھ کر الٹے قدموں واپس مڑنے کو تھا، اسے موقع ہی نہ مل سکا۔

مایا نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تم ادھر کیا کر رہے ہو؟" وہ انگریزی میں غرائی، مگر جواب دینے کے بجائے اس شخص نے اس کے ہاتھ جھٹک کر اپنا گریبان چھڑایا اور بھاگتا ہوا واپس ہو گیا۔

بدر دیکھ چکا تھا، وہ لمبی سبز برساتی پہنے شخص ڈپٹی کمشنر جان کارلس تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"معلوم نہیں۔" وہ اسی طرح غصے میں سرخ پڑتی، اس کو دور گم ہوتے دیکھتی رہی۔

"کیا یہی وہ بھوت تھا؟"

"معلوم نہیں۔" وہ مزید کچھ کہے بنا پھاٹک پار کر گئی۔

وہ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر آہستہ سے اس کے [illegible] دلیا۔

* * *

"تجھے زہرہ پہ کیا اعتراض ہے میرے پتر؟"

اس دوپہر والا منظر پھر سے سج گیا تھا۔ وہ اسی طرح برآمد[illegible] چارپائی پہ بیٹھا [illegible] کھانا کھا رہا تھا اور فکرمندی چاچی پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی اور وہ [illegible] کے اندر دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھی۔

"کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟"

"اسے مجھ سے بہتر......"

"بات بہتر کی نہیں ہے پتر! بات اعتراض کی ہے۔ تجھے اعتراض کیا ہے؟ وہ سوہنی نہیں ہے؟ سلیقہ شعار نہیں ہے؟"

"اس میں کوئی برائی نہیں ہے اماں!" اس نے تھک کر توڑا ہوا لقمہ واپس رکھ دیا تھا۔

"ناں برائی تو ہے نا اس میں۔ وہ ولیت سے نہیں آئی، پٹر پٹر انگریزی نہیں بولتی، میری دھی جتنی اچھی ہو جائے، وہ میم نہیں ہے تو تو کیوں کرے گا اس سے شادی؟"

"اماں! میں نے ایسا کب کہا ہے؟" وہ پریشان سا ہو گیا۔

"بس کر بدر!" چاچی برتن سمیٹنے لگی۔ "تو ماں کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے تو

میم صاب سے ملتا ہے۔کل نذیراں پانی بھرنے کنویں پہ گئی تو تجھے ادھر دیکھا، الٹے قدموں واپس آئی وہ۔تو بتا تو میم صاب سے بیاہ کرنا چاہتا ہے؟''

وہ خاموش رہا، جواب تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔

''تو جا کر پوچھ لے میم صاب سے، کرے گی وہ تجھ سے بیاہ؟''

اس نے سر اٹھایا۔''میں اس سے پوچھ چکا ہوں۔'' چاچی صدمے سے اسے دیکھتی رہ گئی اور اندر زہرہ کا دل ڈوبتا گیا۔

''تو نے کیا پوچھا اس سے؟''

''یہی کہ میں...... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔

''وہ مان گئی؟'' بہت دیر بعد چاچی بولی تو اس کی آواز میں ٹوٹتے مان کی کرچیاں تھیں۔

''نہیں......''

زہرہ نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اس نے انکار کر دیا؟'' چاچی حیرت زدہ رہ گئی، بھلے وہ نہ چاہتی ہو، مگر اسے امید نہیں تھی کہ کوئی عورت اس کے بانکے سجیلے پتر کو انکار کر سکتی ہے۔وہ بھی وہ گوری چمڑی والی پھیکی میم صاب! زہرہ کے آگے کہاں وہ شہزادی اسے حسین لگ سکتی تھی۔

''نہیں۔'' وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، کھانا کب کا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

''کیا مطلب پتر......؟''

''اس نے جواب ہی نہیں دیا اماں!'' وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔شب بے داری کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

چاچی کو ایک دم اس پر بے پناہ ترس آیا۔زہرہ کتنی لاڈلی سہی، وہ اس کا بیٹا تھا، اکلوتا بیٹا۔ پہلوٹھی کی اولاد باقی چار بچے تو پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ایک وہی تو تھا، جو اس کے پاس تھا۔

''میرا پتر!'' وہ برتن چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔''یہ فرنگی یہاں رہنے کے لیے نہیں ہیں۔ وہ اول تو تجھ سے شادی نہیں کرے گی، تیری ماں دنیا دیکھے ہوئے ہے پتر! وہ بھلا کیوں کسی ہندوستانی سے شادی کرے گی؟''

''شیکھر کیا تھا پھر؟''

''تو مجھے بتا شیکھر سے کیوں کی تھی اس نے شادی؟ زیادہ مال و دولت والا تھا کیا اس سے؟'' چاچی نے الٹا سوال کر دیا۔

''نہیں، وہ تو محبت کی......'' وہ رُک گیا چاچی اس سے یہی کہلوانا چاہتی تھی۔

''ہاں تو محبت تو اس نے شیکھر سے کی تھی، عورت زندگی میں بس ایک بار ہی محبت کرتی ہے بدر! وہ بھلے بعد میں کسی کو کتنا ہی چاہنے کا دعویٰ کرے، اس کے سارے جذبے استعمال شدہ اور پرانے ہوتے ہیں۔ وہ ساری عمر اس پہلے مرد کو دل سے نہیں نکال پاتی۔ تو دوسرا مرد بنے گا؟''

''اماں! اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہمارا مذہب۔''

''ماں کو مذہب نہ پڑھا۔'' سارا پیار اڑنچھو ہو گیا۔ وہ پھر ماں سے ملکانی بن گئی اور غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تیری ماں نے دنیا دیکھی ہے۔ وہ عورت شکل سے ہی لومڑی لگتی ہے مجھے۔ یہی ڈر تھا، وہ تجھے لے اڑے گی۔ جا کر لے اس سے بیاہ، مگر یاد رکھیو، وہ فرنگی ادھر رہنے کی نہیں ہے، وہ تجھے انگلستان لے جاوے گی، تب تجھے ماں یاد آوے گی۔''

''اماں!'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر اس نے انکار کر دیا تو میں اس سے دوسری دفعہ نہیں کہوں گا اور اس نے اقرار کر لیا، تب بھی تیری مرضی کے بغیر شادی نہیں کروں گا۔ تو فکر نہ کر اور اس کے بارے میں ایسے غلط اندازے نہ لگا۔ وہ دوسرے فرنگیوں سے بہت مختلف ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے چاچی کا مان رکھ لیا تھا، وہ قدرے پرسکون ہوئی، مگر لہجہ سخت ہی رکھا۔

''مگر یاد رکھیو، یہ سب فرنگی ایک ہی جیسے ہیں۔ چور، غاصب اور لٹیرے۔ تیری یہ میم صاب بھی اسی خصلت کی......''

''رہنے دو اماں!'' بے زار سا باہر نکل گیا۔ چاچی نے تھک کر گہرا سانس لیا۔ وہ پرسکون تھی، مگر زہرہ نہیں تھی۔

اسے لگ رہا تھا، بدر چاچی کو بھی منا لے گا اور مایا بھی مان جائے گی۔ ایسے میں وہ کیا کرے گی؟

''تھانے دار کے پاس جاؤں؟ مگر کل گئی تو ملا ہی نہیں تھا، لیکن کیا معلوم وہ کوئی راستہ نکال دے اور میم صاب یہاں سے دفع ہو جائے۔''

''یا خدا!'' اس نے تھک کر اوپر دیکھا۔

''ان فرنگیوں کو ہندوستان سے نکال باہر کر، اب یہ اور برداشت نہیں ہوتے۔'' اور کالی چادر اوڑھنے لگی۔

* * *

وہ صبح سے دیگر کام نبٹاتا، لاشعوری طور پر اس کی آمد کا منتظر تھا اور کام کہاں نبٹا پا رہا تھا۔ کبھی نقب کے کیس میں تاریخ کا اندراج غلط کر بیٹھتا، کبھی گھر والوں کو تفتیش کے لیے بلوا لیتا اور غائب دماغی سے سوال کر بیٹھتا، غرض سارے کام آج خراب ہو رہے تھے۔

نادر شاہ خاصے مضبوط اعصاب کا حامل تھا، لیکن اس دل کا کیا کرتا جو دوسرے انسانوں کی طرح اللہ نے اسے بھی دے رکھا تھا۔

سہ پہر میں جب وہ سکھوں کی حویلی سے واپس آیا تو اسے ایس آئی نے بتایا۔ "وہ کالی چادر والی عورت، جس کا آپ کہہ گئے تھے، اندر بیٹھی ......" اور وہ مکمل بات سنے بغیر تیزی سے اندر لپکا۔

وہ اس کی میز کے سامنے کرسی پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نادر شاہ نے تیزی سے میز کے اس طرف اپنی کرسی سنبھال لی۔

"آداب!" زہرہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ کالی چادر نے سنہری چہرے کے گرد ہالہ سا کر رکھا تھا، آنکھوں میں مٹا مٹا سا کاجل تھا اور ایک گھنگھریالی لٹ دوپٹے کے اندر سے نکل کر بائیں گال پہ جھول رہی تھی۔

"وعلیکم...... میں کل آئی تھی آپ......"

"بہت معذرت مجھے علم ہوتا، آپ آئی ہیں تو سارے کام چھوڑ دیتا۔" اسے احساس ہوا، اندرونی خوشی لہجے میں جھلکنے لگی ہے تو اس نے خود کو قدرے قابو کیا۔ "کہیے کیسے آنا ہوا؟"

وہ نگاہیں جھکائے، انگلیاں چٹخانے لگی، لب بار بار کھول کر بند کرتی۔ وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ...... کسی طرح......" بے ربط سا انداز تھا۔

''میں...... کسی طرح...... کیا......؟''

اس نے گھنیری پلکیں اٹھائیں، وہ اتنے غور و محویت سے اس پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھا کہ زہرہ کی نگاہیں پھر سے جھک گئیں۔

''آپ کسی طرح میم صاب کو یہاں سے بھیج دیں۔''

''کہاں بھیج دوں؟''

''کہیں بھی بھیج دیں۔'' وہ بے چین سی ہوئی۔ ''لیکن کم از کم وہ ہم سب سے بہت دور چلی جائے۔''

''آپ سب سے یا صرف بدر سے؟''

''بس وہ بدر سے دور چلی جائے ورنہ......'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''ورنہ میری منگنی ٹوٹ جائے گی اور آپ کو معلوم ہے، میری کتنی بدنامی ہوگی۔'' کل کی نسبت آج وہ عقل مندی کا مظاہرہ کرنے کا ٹھانے ہوئے تھی، سو اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے، اس نے معاشرتی نکتہ اٹھایا۔

''ہوں۔'' نادر شاہ بغور اس کو دیکھتا پیچھے کو ہو کر بیٹھ گیا۔

''بدر کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے، وہ چاچی کی مرضی کے بغیر میم صاب سے شادی نہیں کرے گا۔''

''چاچی؟''

''وہ اس کی ماں جی۔''

''اچھا اور میم صاب کیا کہتی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے سر جھٹکا، انداز جلتا کڑھتا سا تھا۔

''اچھا فرض کرو، تمہاری منگنی ٹوٹ جاتی ہے تو تم......''

''اللہ نہ کرے جی۔'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کوئی سبیل نکالیں۔ آپ تو تھانے دار ہیں جی! آپ تو سارے پنڈ کے لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔''

کچی عقل اور کچی عمر کی وہ چھوٹی سی لڑکی، وہ بے اختیار مسکرایا۔

''بھئی، اگر بدر سے منگنی ٹوٹ جائے گی تو کسی اور سے ہو جائے گی، ایسا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے نا یہ۔''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ برامان کراٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ تو......''

اسی پل اے ایس آئی دستک دے کراندر داخل ہوا، زہرہ نے چہرہ چھپالیا۔

''کیابات ہے؟'' نادرشاہ نے اُکتا کر پوچھا۔

''بدرغازان آئے ہیں۔''

اور زہرہ کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی، خود نادرشاہ بھی پریشان سااٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا کہتا ہے؟''

''آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا دوسرے کمرے میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔'' اے ایس آئی کو رخصت کر کے اس نے زہرہ کو دیکھا، جس کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

''اسے پتہ چل گیا کہ...... خدارا! اب کیا ہوگا۔''

''تسلی رکھولڑکی! وہ دن میں دس دفعہ میرے پاس آتا ہے۔تم یہاں بیٹھو، میں ذرا اسے اندر کمرے میں بٹھاتا ہوں، پھر تمہیں بتادوں گا، تم پچھلے دروازے سے نکل جانا۔''

''وہ دن میں دس دفعہ آپ کے پاس کیوں آتا ہے؟''

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو زہرہ کی حیران آواز نے اس کے قدم زنجیر کر دیے۔

''وہ میرا......'' دوست کہتے کہتے وہ رُک گیا، اس کے دل نے اسے روک دیا تھا، دوستی تو بہت خالص رشتہ تھا، جانے اب رہا بھی تھا یا نہیں کہ اب تو ان کے درمیان ایک عورت آ گئی تھی۔

''میں آتا ہوں۔'' وہ چلا گیا اور زہرہ اس کے ادھورے جملوں پہ غور کرتی رہ گئی، پھر چند لمحے گزرے اور اے ایس آئی نے آ کر اسے بتایا کہ وہ جاسکتی ہے تو وہ اچھی طرح چادر لپیٹے باہر چلی گئی۔صد شکر کہ بدر نے اسے نہیں دیکھا تھا۔وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔بدر اسے تھکا تھکا سالگا تھا، جیسے قدرے پریشان ہو۔

نادرشاہ نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس کو کیا پریشانی ہے۔اس کا دل اس کی پریشانی حل کرنے کو ہی نہیں چاہا تھا۔تلخیاں تو اسی روز ان کے تعلق میں گھل گئی تھیں جب بدر نے میم صاب کو

جانے دیا تھا، حالانکہ یہ ان کا اصول تھا کہ مقصد پہ ذاتی شناسائی کو ترجیح نہیں دی جائے گی، لیکن بدر نے عہد شکنی کی تھی۔ اب تو خیر سارے معاملے ہی مختلف ہو گئے تھے۔

''چوہدری منگل سنگھ قتل کیس کا کیا بنا نادر؟'' چند رسمی جملوں کے بعد وہ پوچھنے لگا۔ پژمردگی اور تھکان اس کے چہرے سے عیاں تھی، نادر کو لگا وہ ذہنی طور پہ تھکا ہوا ہے اور شاید بیمار بھی ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور خوبرو چہرہ قدرے کمزور دکھ رہا تھا۔

''قاتل پکڑا گیا۔ شوبھا سنگھ تھا، جس سے اس کا درخت پہ جھگڑا ہوا تھا۔''

''ہاں سنا تو تھا۔'' وہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

''کوئی مسئلہ ہے اس سے متعلق؟'' نادر کا لہجہ محتاط سا تھا اور لیا دیا بھی۔

''نہیں۔'' بدر نے سر جھکائے نفی میں سر ہلایا۔ ''بھوت کا کیا قصہ تھا؟ تمہارے خیال میں یہ کون ہو سکتا ہے؟''

''اب اتنا وقت کہاں ہے اپنے پاس کہ گاؤں والوں کی ہوائیوں پہ ضائع کروں۔'' نادر شاہ کا لہجہ روکھا سا ہو گیا، مگر وہ اپنے خیال میں اتنا گم تھا کہ دھیان نہیں دیا۔

''معلوم نہیں کون ہے؟'' وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔

''تم تو نہیں ہو؟'' نادر شاہ نے کہا۔

اس نے بے یقینی سے نادر کو دیکھا۔ ''تمہیں لگتا ہے میں ایسا کام کر سکتا ہوں؟''

''ایسا کوئی غلط کام تو بھوت نے ابھی تک نہیں کیا۔ قبریں کھود کر زیادہ سے زیادہ لاشیں ہی نکال لے جائے گا، یا ہڈیاں اب یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے۔''

''اور میں ہڈیاں کیوں لے کر جاؤں گا؟'' وہ سمجھا تھا نادر مذاق کر رہا ہے۔

''وہ جو جوگی ہے نا، جو پنڈ کے اس پار رہتا ہے، سنا ہے ہڈیوں پہ عمل کر کے دیتا ہے، میں سمجھا شاید تم عمل لینے میم صاحب کے ساتھ اس کے پاس گئے تھے۔'' نادر کا لہجہ بظاہر مذاق کرنے والا تھا مگر اندر طنز اتنا واضح تھا کہ بدر کو اچھا نہ لگا۔

''اچھا مجھے تو نہیں معلوم۔'' اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

''باقی تو پورے پنڈ کو معلوم ہے۔ خیر، اب یہ بھی جانے سچ ہے کہ نہیں، سنا ہے تم شادی کر رہے ہو۔''

''کس سے......؟'' بدر کا لہجہ محتاط ہو گیا۔

''تم شاید اپنے خاندان میں کہیں منسوب ہو۔''

''ہاں، ہوں۔''

''تو شادی وہیں خاندان میں کرو گے؟''

اب کے بدر کو واضح برا لگا۔ وہ شادی جس سے بھی کرے، یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا اور بیلی کے ہر غیرت مند مرد کی طرح اسے تھانے کچہری میں اپنا ذاتی معاملہ اچھالنا گوارا نہیں تھا۔

''ظاہر ہے، خاندان میں ہی کروں گا۔'' وہ مایا سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کر کے اسے خود پہ مزید کوئی طنز کرنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

''اچھا۔'' نادر کے دل کو دھکا سا لگا۔ ''گاؤں والے تو کہتے ہیں تم میم صاب کے چکر میں ہو، مجھے تو خیر تب بھی یقین نہیں آیا تھا۔''

نادر کا لہجہ اتنا کڑوا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''گاؤں والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آج کل داروغہ جی کے ٹھاکروں کی دعوتوں پہ بہت چکر لگ رہے ہیں، لیکن مجھے بھی تب یقین نہیں آیا تھا، چلتا ہوں۔ رب راکھا۔''

پھر ایک لفظ کہے بغیر، یہاں تک کہ مصافحہ بھی کیے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

نادر نے زور سے میز کو ٹھوکر ماری۔

''ڈاکو کی اولاد نہ ہو تو۔''

اسے بھول گیا تھا کہ بدر کو ڈاکو اسی نے تو بنایا تھا۔

* * *

زہرہ نے برآمدے سے دیکھا تھا، وہ پائیں باغ میں جھولے کے ساتھ کھڑا اپنے کتے کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا اور وہ گوری لمبی سی، سنہرے بالوں والی لڑکی ساتھ کھڑی ہنس رہی تھی۔ وہ کتے کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے کچھ بتا رہا تھا اور وہ ہنستی جا رہی تھی۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی رسوئی میں آئی۔ پیڑھی کھینچی اور بیٹھ گئی، کھلے دروازے سے پائیں باغ کا منظر اب بھی واضح تھا۔

چاچی روٹی کے لیے توا رکھ رہی تھی۔ خادماؤں کے ہوتے ہوئے بھی روٹی وہ خود ہی ڈالتی

تھی۔ کہتی تھی بدر اس کے علاوہ کسی کی روٹی نہیں کھا سکتا اور زہرہ نے سوچا، میم کو تو روٹی ڈالنی بھی نہیں آتی ہو گی، پھر وہ اس کے ساتھ کیسے زندگی بسر کرے گا؟

شاید وہ دونوں کا ساتھ تسلیم کر چکی تھی۔

''جی بھر کے دیکھ لے ان کو زہرہ!'' چاچی لکڑیوں کو پھونکیں مار کر سلگا رہی تھی، دھواں نکل نکل کر اس کے اوپر آ رہا تھا۔ ''یہ منظر بس چند روزہ ہے۔ تو اپنی چاچی کی بات لکھ کے رکھ لے، یہ میم یہاں ٹکنے والی نہیں ہے۔''

زہرہ یک ٹک کھڑکی سے نظر آتے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اب مایا جھک کر کتے کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی، مگر کتا ایک دم غرایا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ بدر نے کتے کو زنجیر سے کھینچ کر پیچھے کر لیا۔ زہرہ کے لبوں پہ اداس مسکان آ گئی۔

''تو جانتی ہے چاچی شیرو اجنبی لوگوں سے بہت دیر میں گھلتا ملتا ہے۔ خونخوار ایسا ہے کہ جان ہی لے ڈالے، مگر مجھ سے ایسے پیار کرتا ہے، جیسے میں بدر کا پرتو ہوں۔ بس ایک دفعہ بدر نے اسے بتایا تھا کہ یہ میری غم زاد ہے، اس کو دکھ نہیں دینا، وہ دن اور آج کا دن، شیرو مجھ پہ نہیں غرایا چاچی! میں سوچتی ہوں بدر نے یہ بات میم صاب کے لیے کیوں نہیں بتائی؟''

''اتنا نہ سوچا کر، زہرہ! بیمار پڑ جائے گی۔'' وہ روٹی کو ہاتھ پہ پھیلا رہی تھی۔ ''میں ہونے دوں گی بدر کو کسی اور کا؟''

''وہ تو ہو چکا کسی اور کا چاچی!'' وہ دکھ سے ان دونوں کو دیکھے گئی، اب میرے پاس واپس آ جائے، تب بھی میرا ہو کر نہیں رہے گا۔ میں نے تجھے کہا تھا نا، تیری زہرہ بھلے زیادہ حسین ہو لیکن یہ عورت تو ساحرہ ہے اور مجھے سحر کرنا کہاں آتا ہے؟''

''تم غم نہ کر، یہ چند دنوں کی مہمان ہے پھر چلی جائے گی۔'' لکڑیاں آگ پکڑنے لگیں تو چاچی نے ہاتھ پہ پھیلائی روٹی گرم توے پہ ڈال دی۔

''اور پھر صدیوں وہ اسی کا اسیر رہے گا۔'' اس نے دل میں کہا، پھر رُخ موڑ کر چاچی کو دیکھا، وہ اب توے سے اترتی روٹی کو کپڑے سے دبا رہی تھی۔

''کسی کو جیتا کیسے جاتا ہے؟''

''اپنا دل ہار کر۔''

''اور دل کیسے، ہارا جاتا ہے؟''

''اپنی ذات کو مٹی میں ملا کر۔''

''اور اگر تب بھی وہ نہ ملے، جس کی تمنا کی ہو تو......؟''

''تو صبر کر لیا جاتا ہے میری دھی! اللہ کسی کی ریاضت کو رائیگاں نہیں کرتا۔'' روئی جگہ جگہ سے سنہری ہونے لگی تو چاچی نے اسے اتار دیا۔

زہرہ گردن موڑ کر پھر سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ بدر کتے کو پیچھے لے کر جا رہا تھا، کیونکہ مایا دور کھڑی تھی۔ شاید شیرو اسے دیکھ کر بہت زیادہ بھونکنے اور غرانے لگا تھا۔

زہرہ کو یاد آیا، شیرو اسے دیکھ کر کبھی نہیں غرایا تھا۔ شیرو کو زہرہ کی عادت تھی، جانے کیسے بدر اپنے اردگرد کے لوگوں کو مایا کی عادت ڈالے گا۔

* * *

نادر شاہ نے بیلی کی ایک کٹنی کو بلا بھیجا تھا۔ نام تو جانے کیا تھا، اب تو لوگ اسے چھمن ہی کہتے تھے۔ رشتوں کے پیغام ادھر اُدھر لے کر جاتی تھی۔ لڑکے، لڑکیوں کے درمیان خطوں کے تبادلے کراتی، جہاں کسی نے کسی سے ملنا ہوتا وہاں پہرہ دیتی۔ تحفے حائف ادھر سے اُدھر۔ ہر گھر کی فکر، ہر معاشقے کی خبر ہوتی تھی۔

چھمن فوراً ہی حاضر ہوئی تھی۔

''حکم حضور! آج بڑے دنوں بعد ہماری یاد آئی۔'' وہ ہاتھ جوڑے بولی تو نادر شاہ نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''فضول باتیں چھوڑو، تم سے ایک خاص کام ہے۔''

''حکم کیجئے حضور!''

''تو بتاؤ۔'' وہ کچھ سوچتا ہوا کرسی پر آگے کو ہوا۔ ''یہ ملکوں کی دھی زہرہ کیسی لڑکی ہے؟''

چھمن نے آنکھیں گھمائیں۔ ''پورے گاؤں میں اس سے سندر لڑکی کوئی نہیں ہے، ایسی موہنی صورت، سلیقہ شعار اور سب سے بڑھ کر پاکیزہ اور باکردار۔''

''ہوں...... کسی کے ساتھ کوئی چکر وکر؟''

''نہ جی نہ، وہ بڑی پکی لڑکی ہے۔'' چھمن راز داری سے بتانے لگی۔ ''ایک دفعہ میں نے

کوشش کی تھی۔ شمس الدین کے بیٹے کا خط لے کر گئی تھی۔" اس نے ایک زمیندار کا نام لیا۔" مگر نہ جی، ایسی پکی اور کراری لڑکی ہے، نہ صرف خط میرے منہ پہ دے مارا، بلکہ درانتی اٹھالائی اور بولی، تیرا گلا کاٹ کر اپنے کتے کو کھلا دوں گی، اگر پھر کبھی ادھر آئی تو۔ شمس الدین کے الو کے پٹھے بیٹے کو بتا دینا کہ بدر غازان کی منگ کی طرف ٹیڑھی آنکھ بھی کی نا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں تو بس برقع اٹھا کر بھاگ ہی پڑی۔"

"تو شمس الدین کے بیٹے نے کیا کہا؟"

"اجی ملک بدر سے تو سب ڈرتے ہیں، رعب دبدبہ بھی تو کم نہیں ہے۔ وہ تو توبہ کرنے لگا، جب اسے علم ہوا کہ وہ بدر کی منگ ہے، ورنہ گاؤں والے تو اس بات سے مومالا علم ہی تھے نا جی۔"

ایک کٹنی کے منہ سے بدر کی ستائش نے نادر شاہ کے اندر کڑواہٹ گھول دی۔

"کب ہوا تھا ان کا رشتہ؟" وہ ناگواری چھپائے پوچھنے لگا۔

"بچپن کی بات ہے جی، اب تو سب کو علم ہو چکا ہے۔"

"زہرہ کے ماں، باپ؟"

"نور پور میں رہتے تھے، دریا کے کچے پہ گھر تھا۔ وہاں سیلاب آیا تو سب بہہ گئے، بس یہ بچ گئی، سو بدر کا پیو اسے گھر لے آیا، تب سے اس کو بیٹی بنا کر رکھا ہے۔"

"اچھا، ایک اور بات بتاؤ؟" وہ بظاہر سرسری انداز میں استفسار کرنے لگا۔" یہ میم صاب کیسی عورت ہے۔"

چھمن نے برا سا منہ بنایا۔" وہ تو پھیکی میم ہے جی!۔ عجیب مزاج عورت ہے۔ راجپوتوں کے ایک لڑکے نے جو ٹھاکروں کا دور پار کا رشتہ دار ہے، اس کے لیے پیغام بھیجا (ساتھ میں سونے کا ہار بھی تھا) تب کی بات ہے جب ٹھاکر شیکھر زندہ تھا۔ میں نے پیغام لا دیا۔ وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے کھول کر پڑھا، اچھا کہہ کر سر ہلایا اور سونے کا ہار نوکرانی کی گود میں ڈال دیا اور پھر سے لگی پڑھنے۔ میں نے جواب کا پوچھا تو بولی کل آنا۔ میں اگلے روز گئی اور جواب پوچھا تو مجھے اندر ٹھاکر شیکھر کے پاس لے گئی اور رقعہ اس کے سامنے رکھ کر بڑی معصومیت سے بولی۔" یہ عورت کل لائی تھی، پڑھ کر بتا دیں میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔" حالانکہ رقعہ انگریزی میں تھا اور پھر نہ پوچھو، ٹھاکر نے میرا کیا حال کیا۔"

''یہ بتاؤ۔'' نادر تفصیل سے اکتا کر بولا ''اس کا بدر کے ساتھ کیا چکر چل رہا ہے؟''

''ارے جی!''چھمن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''چکر ہی تو چل رہا ہے۔صبح شام ساتھ ساتھ پھر رہے ہوتے ہیں، دیکھ لیجئے گا۔ یہ فرنگی میم اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔''

''تمہیں لگتا ہے، اب بدر، زہرہ سے شادی کرلے گا؟'' اس نے وہ بات پوچھی جس کے لیے اس نے کمّنی کو بلوایا تھا۔

''ہاں جی، ضرور کرلے گا۔''

''مگر وہ تو میم صاحب سے......'' نادر شاہ کو جھٹکا لگا۔

''ارے یہ میمیں کہاں ٹکنے والیاں ہوتی ہیں۔ آج نہیں تو کل یہ یہاں سے چلی جائے گی۔ اجی کبھی تو فرنگی دفع ہوں گے نا اور شادی تو آخر میں بدر، زہرہ سے ہی کرے گا۔''

''وجہ......؟'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

''شاہ صاحب! ان کے ہاں شادیاں خاندان میں ہوتی ہیں اور زہرہ کے جوڑ کا اور کوئی اس کے خاندان میں نہیں ہے۔ دوسرے بدر، ماں کی بہت مانتا ہے، وہ ماں کو دُکھ نہیں دے گا۔ شادی زہرہ سے ہی کرے گا، نہ کی تو زہرہ کہاں جائے گی؟ وہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے؟''

''کون؟ کون نہیں کرتے؟ زہرہ کی تو ماں پیو ہی نہیں ہے اور ملکانی ٹھہری عورت ذات۔ کون فیصلہ کرے گا کہ بدر سے نہ ہوئی تو زہرہ کی شادی کس سے کرنی ہے؟''

''بدر خود فیصلہ کرے گا، اس کا باپ تو کئی برس ہوئے خاندانی جھگڑے میں قتل ہو گیا تھا نا، تب ہی تو وہ ولایت سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اب وہی تو ہے اپنے خاندان کا بڑا اور بدر کے ہوتے ہوئے زہرہ کی شادی کیسے کسی اور سے ہو سکتی ہے؟''

''اگر بدر بیچ میں نہ رہے اور میم سے شادی کرلے تب؟''

''ایسا نہیں ہوگا حضور! لکھ لی جیو۔''

''اچھا، ایک کام کرنا ہے تمہیں۔''

اور پھر چھمن کے جانے کے بعد اس کے ذہن میں اسی ایک فقرے کی تکرار گونجتی رہی۔

اگر بدر نہ رہے۔

اگر وہ بیچ میں سے نکل جائے۔

* * *

بی چھمن اپنا برقع سنبھالتی، خادمہ کے پیچھے اندر برآمدے میں داخل ہوئی تو ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھا کہ کیا منظر ہے اور منظر میں موجود ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

چارپائی پہ بیٹھی سبزی کاٹتی چاچی نے چھری رکھ دی تھی۔

کسی زمین کے کاغذوں سے کچھ پڑھتا بدر صفحہ پلٹتے پلٹتے رُک گیا تھا۔

برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے، چڑیوں کو باجرہ ڈالتی زہرہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''سلام ملکانی! کیسی ہو؟ ٹھیک تو ہو؟'' وہ پان چباتی، برقع پکڑے اندر داخل ہوئی تو بدر نے ایک ناگوار نگاہ اس پہ ڈال کر ماں کو دیکھا۔ چاچی نے حیرت سے شانے اچکائے کہ وہ لاعلم تھی۔

''ہاں چھمن! کہو کیسے آنا ہوا؟'' چاچی کا لہجہ محتاط اور روکھا سا تھا۔ چھمن جیسی بدکردار اور بدنام عورت کا ان کی حویلی میں اچھا سواگت ناممکن بات تھی۔

''ارے بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟ سلام چھوٹے ملک۔'' چارپائی پہ بے تکلفی سے بیٹھتے نگاہ بدر پہ پڑی تو جھٹ سلام جھاڑ دیا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اِدھر ہی تھا، داروغہ جی نے یہ ہی تو تاکید کی تھی کہ ساری بات چیت اس کے سامنے ہونی چاہیے۔

اس کے باپ کو مرے عرصہ ہو گیا تھا، مگر گاؤں والے اسے آج بھی چھوٹا ملک ہی کہتے تھے۔

''کیا کام ہے؟'' ماں کے بولنے سے قبل وہ بول پڑا۔

''بہت گرمی پڑ رہی ہے آج، اے میں تو گھڑی بھر میں پسینہ پسینہ ہو گئی ہوں۔'' وہ برقع ایک طرف رکھتی، آنچل درست کرتی تمہید کی غرض سے یوں بولی، جیسے برسوں سے میل ملاقات ہو۔

وہ جیسے ضبط کر کے رہ گیا۔ کاغذات ایک طرف کھسکا دیئے۔

زہرہ قدرے پریشان سی ہو گئی تھی۔ عرصہ پہلے چھمن اس کے لیے کوئی رقعہ لائی تھی، جانے اب کیوں آئی تھی۔ کہیں چاچی اور بدر اسے ہی قصوروار نہ سمجھیں؟ اللہ عزت رکھنا۔

’’کوئی کام تھا؟‘‘ چاچی جیسے اکتا گئی تھی۔ چھمن خوامخواہ دیر کیے جا رہی تھی، کبھی برقع ادھر اُدھر کرتی تو کبھی پسینہ پونچھتی۔

’’آں ہاں، بڑا خاص کام تھا، اے ذرا پانی تو پلاؤ، قسم سے بڑی گرمی ہے۔‘‘

’’جو بات کرنی ہے، جلدی کرو اور اپنا راستہ پکڑو۔‘‘ بدر بات کاٹ کر سختی سے بولا تو چھمن گڑبڑا گئی۔

’’آں ہاں وہی، وہ اپنا......‘‘ پھر ٹھہر کر جیسے الفاظ مجتمع کیے۔ ’’ساتھ والے گاؤں کے رئیس ہیں، انہوں نے رشتہ بھجوایا ہے۔‘‘

’’کس کا رشتہ؟‘‘ چاچی نے حیرت سے چھری رکھی۔

’’اپنی......اپنی زہرہ کا۔‘‘ چاچی کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ باجرے کے دانے اس کے ہاتھ سے گرے تھے۔

چاچی کے تو مانو سر پہ لگی تلوؤں پہ بجھی۔

’’ناں ان کی ہمت کیسے ہوئی رشتے کی بات ڈالنے کی؟ جانتی نہیں ہے تو۔ بتایا نہیں تھا ان کو کہ چڑھی نہ ماریں؟ زہرہ تو بدر کی منگ ہے۔‘‘

’’ہاں بتایا تو تھا، لیکن......‘‘

’’لیکن کیا؟‘‘ بدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

’’لیکن وہ دراصل......‘‘ حالات ناموافق دکھائی دینے لگے تو وہ برقع دبوچ کر یوں چوکنی ہو بیٹھی کہ اگر جو ملکانی نے چھری کھینچ کر ماری تو بھاگ اٹھے گی۔ ’’دراصل گاؤں والے کہتے ہیں کہ چھوٹا ملک تو اب شاید میم صاب سے، اس لیے انہوں نے رشتہ بھجوا......‘‘

اور بدر کی برداشت جواب دے گئی۔ میز کو ٹھوکر مارتا وہ کھڑا ہوا۔ ’’اٹھو!‘‘

چھمن نے پریشان سی ہو کر بدر کو دیکھا۔

’’چھوٹے ملک گل تو سن لو، بڑا اچھا رشتہ۔‘‘

’’میں نے کہا ہے اٹھو۔‘‘

وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ چھمن برقع چھوڑ کے کھڑی ہوگئی۔ اسے علم ہوتا کہ اتنی بے عزتی ہو گی تو نادر شاہ کے پانچ روپے لیتی نہ ادھر آتی۔

''آئندہ اس حویلی کا رُخ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچنا اور اگر تم پھر بھی زہرہ کے لیے اپنے جیسے بدکردار لوگوں کے رشتہ لائیں تو میں تمہاری بوٹیاں کرا کے اپنے کتوں کے آگے پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ اِدھر سے۔''

وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا لگی۔ ''مگر ملک صیب! جواب کیا دوں ان لوگوں کو؟'

''ان سے کہو، ہمارے اوپر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسے بدنام لوگوں سے رشتہ جوڑ بیٹھیں، جا دفع ہو جا۔''

وہ غصہ سے کھولتا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

زہرہ کی نگاہیں اسی پر جمی تھیں۔ اس نے انکار تو کر دیا تھا، لیکن اس باعث کہ رشتہ ایک کٹنی کے توسط سے آیا تھا اور بات لاج کی تھی۔ خدا معلوم اپنے جیسوں کا رشتہ ہی لائی ہوگی۔ بدر نے تو پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ کس کا رشتہ تھا لیکن اس نے ایک دفعہ بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی منگیتر ہے۔

زہرہ کے اندر کچھ زور سے ٹوٹا تھا، وہ بالآخر اس رشتے کو بھلا چکا تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے اندر چلی گئی۔ چاچی نے افسردگی سے اسے دیکھا۔

''اب تو گاؤں کے لوگ بھی کہنے لگے ہیں کہ تو میم صاب......''

''بھاڑ میں گئے لوگ۔ آئندہ اس عورت کو اندر داخل ہونے دیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ شریفوں کا گھر ہے یہ......رہ گئی زہرہ تو بھلے میری اس کی شادی ہو، یا نہ ہو۔ اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ کسی بوجھ کی طرح اسے سر سے اتار دوں؟ ایسے لوگوں کا رشتہ قبول کر لوں۔''

کھولتا بڑبڑاتا وہ باہر نکل گیا۔ چاچی تاسف سے سر جھکائے سبزی کاٹنے لگی۔

* * *

''وہ کہتا ہے اتنا برا ویلا نہیں آیا ہم پہ کہ بدنام، بدکردار لوگوں میں رشتہ کر بیٹھیں۔ زمانہ تھوتھو کرے گا ہم پہ، بے عزت کر کے نکال دیا جی......توبہ توبہ......''چھمن، نادر شاہ کے دفتر میں کرسی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی، پان چباتے ہوئے عادت سے مجبور بڑھا چڑھا کر بتا رہی تھی۔

''تو نے بتایا کہ کس کا رشتہ ہے؟''

''ارے نہیں جی، انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔''

"ٹھیک ہے، رشتے کا تو معاملہ تھا ہی نہیں، اصل بات تو ملک بدر کا میم صاب کے نام پہ بھڑ کنا سننا تھا تو نے اچھا کام کیا۔"

اور اس کے جانے کے بعد ساری باتیں نادر شاہ کے ذہن میں پھر سے گونجنے لگیں۔

"بدکردار، بدنام لوگ۔۔۔"

وہ ایک فیصلہ کر کے کھڑا ہوا۔"اب یہ تو وقت بتائے گا ملک بدر غازان کہ بدنام کون ہوتا ہے اور زمانہ کس پہ تھوکتا ہے۔"

پھر باہر آ کر ایک اہلکار کو بلایا۔"چھوٹے ملک کی زمینوں پر جاؤ، مدار کو ڈھونڈو اور اس سے کہو کہ چھوٹے ملک کو بولے، نادر شاہ رات کو نہر پہ تمہارا انتظار کرے گا۔ جلدی آ جانا، ضروری کام ہے، خود یہ پیغام اسے نہ دینا، کمدار کے ہاتھ یا اس کے کسی دوسرے ملازم مزارع کے ہاتھ کہلوانا، سمجھ گئے؟" اس کا ذہن ایک نئی سوچ کے تانے بانے بن رہا تھا۔

* * *

جس وقت اسے پیغام ملا، وہ کام سے گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ سن کر سوچا، کیا کام ہو سکتا ہے نادر شاہ کو، جو اسے یوں بلوایا ہے؟ اسے آخری ملاقات میں نادر شاہ کا بدلا لب و لہجہ یاد تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر نظر انداز کر گیا کہ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔ وہ شرمندہ ہو اور تعلقات میں آئی سرد مہری ختم کرنا چاہتا ہو، ٹھیک ہے، چلا جاؤں گا۔

گاؤں کی حدود ختم ہوتے ہی گھنا جنگل تھا، جس کے بیچ سے سڑک گزرتی تھی۔ وہ جنگل بھی بیلی کا ہی تھا۔ اس سڑک پہ قدرے آگے اس نے کئی روز گزرے، مایا کی بگھی کو روکا تھا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑاتے اسے وہ واقعہ یاد آ گیا، تو لبوں پہ آپ ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہ انجان فرنگی لڑکی اب اس کے دل و جان کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ اسے یاد آیا، دو روز گزر گئے وہ اس سے نہیں ملا۔ اس نے وجہ یاد کرنے کی سعی کی تو مایا کی آواز سماعت میں گونجنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا، گھوڑا آہستہ کر دیا۔ اتنا اسے سوچنے لگا تھا کہ اس کی آواز جنگل میں بھی سنائی دیتی تھی اور ......

یک دم اس نے گھوڑا روک دیا۔ وہ وہم نہیں تھا، اسے حقیقتاً مایا کی آواز جنگل کے درختوں سے ٹکراتی سنائی دے رہی تھی۔

زور،زور سے ماری گئی تین چیخیں۔

وہ چلا رہی تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا اور آواز کی سمت کا اندازہ کر کے، اس طرف دوڑا۔

سڑک کے قریب ہی چند درختوں کے درمیان اسے وہ نظر آئی۔

وہ شاخیں ہٹاتا، پتوں پہ پاؤں رکھتا اس کی طرف لپکا اور سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔

وہ درخت سے لگی تھی اور ایک آدمی اس پہ جھکا تھا، مایا کی گردن اسی کے ہاتھ میں تھی اور وہ انگریزی میں مغلظات بکے جا رہا تھا۔

''چھوڑو مجھے، میں پولیس کو بتا دوں گی کہ تم......''

''ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔''

اس کی گردن دبوچے ہوئے ایک جھٹکا دیا تو وہ زور سے چیخی، پھر نگاہ اس شخص کے کندھے پر سے ہوتی ہوئی پیچھے کھڑے بدر پہ پڑی۔

''بدر! مجھے بچاؤ۔'' وہ چلائی تو گھبرا کر اس آدمی نے اس کی گردن چھوڑی اور پلٹ کر دیکھا۔

وہ جان کارلس تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیلتی بھاگ کر بدر کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور جیسے خوف زدہ ہو کر سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ڈی سی بہادر! میری بات کان کھول کر سنو۔'' وہ اپنے غصے پہ قابو پاتا انگلی اٹھا کر بولا۔ ''اگر آئندہ تم نے اس عورت کی طرف نظر بھی ڈالی تو تمہاری سرکار کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ چلو۔'' مایا کو کہنی سے پکڑے، جان کارلس کے فق چہرے پہ ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا، اسے جنگل سے نکال لایا، گھوڑے پہ اپنے پیچھے بٹھایا اور ایڑھ لگا دی۔

گھوڑا اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ اس نے بدر کے شانے اور کمر کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ بالکل خاموش گھوڑا دوڑا رہا تھا، راستہ وہی تھا، جو گاؤں سے باہر جاتا تھا۔ وہ واپس گاؤں نہیں جا رہے تھے، مگر اس نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ اسے کدھر لے کر جا رہا ہے۔ بس وہ بے آواز رو

رہی تھی اور جب اس کی سسکیاں، ہچکیوں میں بدلنے لگیں تو اس نے گھوڑا روک دیا اور نیچے اتر آیا۔

''آؤ، نیچے آ جاؤ۔'' نرمی سے کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا، وہ اسی طرح سسکیوں سے روتی بدر کا ہاتھ تھام کر شانے کا سہارا لیے سڑک پہ نیچے اتر آئی۔ دونوں اطراف میں گھنا جنگل تھا۔

''ادھر آ جاؤ۔'' بدر نے ایک ہاتھ سے لگام تھامی، دوسرے سے اس کا کندھا اور اندر درختوں کے بیچ لے آیا۔

اونچے درختوں کے درمیان ایک قطعہ خالی تھا، سوکھے پتے اِدھر گرے تھے، شاید کوئی درخت طوفان سے ڈھے گیا تھا، جسے بعد میں محلے والے اٹھا کر لے گئے تھے، اس کا ایک فٹ تنا کٹا پڑا تھا۔

اس نے لگام چھوڑ دی، گھوڑا اِدھر اُدھر گردن جھکائے گھاس میں منہ مارنے لگا۔ وہ مایا کو تسلی دیتا شانوں سے تھامے کٹے تنے تک لایا اور بٹھا دیا۔

''آرام سے بیٹھو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے روتی بلکتی ہوئی تنے پہ بیٹھی تھی اور وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے اس کے ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

''مایا! خدارا! مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟ تم ادھر کیوں گئی تھیں؟ ڈی سی ادھر کیوں......''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے اس نے گیلا چہرہ اٹھایا۔

''بدر! شیکھر کو جان کارلس نے قتل کیا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''مجھے کھوجی اس روز ایک کھرا دکھانے لے گیا تھا۔ جو اس شخص کا تھا جو شیکھر سے کچے راستے پہ آخری دفعہ ملا تھا۔ میں نے وہ کھرا دیکھا اور جب اس کھرے کو چھوڑتے قدم دیکھ کر سر اٹھایا تو جان کارلس جا رہا تھا۔ میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا، بس خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے لگا کھوجی کو غلط فہمی ہوئی ہے، لیکن اس رات جان کارلس کو قبرستان میں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا یقیناً اس معاملے میں ہاتھ ہے۔ وہی شیکھر کے قتل میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہی ہے جو شیکھر سے آخری دفعہ ملا تھا۔ میں اس روز تو خاموش رہ گئی، مگر آج جب وہ مجھے راستے میں ملا تو میں نے کھرے کا ذکر کر دیا۔ وہ مجھے ایک ضروری بات بتانے کے لیے ادھر لے آیا اور پھر '' وہ

پھر سے رونے لگی۔

''اس نے اقرار کیا، اس نے شیکھر کو مارا ہے؟''

''نہیں...'' وہ سسکیوں کے درمیان بمشکل بول رہی تھی۔'' میں نے کہا اس نے قتل کیا ہے تو وہ بجائے انکاری ہونے کے مجھے مارنے کی دھمکیاں دینے لگا۔ میری گردن دبوچ لی۔ میں چلانے لگی تو تم آ گئے۔ بدر، بدر اس درندے نے شیکھر کو مار ڈالا ہے۔ شیکھر نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ تو بہت مہربان تھا، بہت اچھا، بہت مخلص انسان تھا وہ، اس کو کیوں؟'' وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی اور بدر کے لیے اس کو چپ کرانا مشکل ہو رہا تھا۔

''مایا! یہ بات کافی پیچیدہ ہے، جان کارلس کو ادھر آئے دو روز ہی گزرے تھے، جب شیکھر کا قتل ہوا۔ اس کی شیکھر سے کیسی شناسائی تھی کہ دو روز میں ہی کوئی جھگڑا بھی ہو گیا، یقیناً یہ لمبی کہانی ہے، کیونکہ اگر کارلس وہ بھوت ہے تو منگل سنگھ نے مرتے وقت شیکھر کا نام کیوں لیا تھا؟ ٹھاکر شیکھر اور کارلس میں کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔ کیا تمہیں کبھی شیکھر نے کارلس کے بارے میں بتایا تھا۔''

''مجھے کچھ نہیں پتا۔'' وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھے ابھی تک روئے چلے جا رہی تھی۔'' مجھے لگتا ہے شیکھر آج مرا ہے، ابھی میرے ہاتھوں میں دم توڑا ہے اس نے۔ بدر! اس درندے نے اسے مار ڈالا ہے، میں جانتی ہوں۔''

''آرام سے مایا!'' اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا، پھر گردن اٹھا کر اونچے درختوں کے درمیان جھانکتے نارنجی سورج کو دیکھا، جو ڈوبنے کو تھا۔'' کچھ دیر میں شام ڈھل جائے گی، ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ اندھیرے میں یہ جگہ خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں ادھر اس لیے لایا تھا، کیونکہ اب گاؤں میں سرعام ملنا مناسب نہیں لگتا، آؤ شاباش۔''

وہ کھڑا ہوا تو مایا بھی آنسو صاف کرتی کٹے تنے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی، سو بدر کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا، بس گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ گھوڑا تابعداری سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تو وہ مسکرا دیا۔

''یہ تمہیں پہچاننے لگا۔''

وہ آنسوؤں سے بھیگے چہرے سے مسکرا دی۔

''اسے میری عادت جو ہوئی ہے۔'' آج وہ بدر کو بہت مختلف لگی تھی، اپنے جیسی عام سی، سادہ سی لڑکی۔ وہ ملکہ والی تمکنت، غرور اور شانِ بے نیازی آج اس میں مفقود تھی، جس سے وہ اسے اپنی پہنچ سے بہت دور لگتی تھی۔

''تم کہاں جا رہے تھے؟''

''ساتھ والے گاؤں، کچھ کام تھا، لیکن اب وقت نہیں رہا۔ اب واپس چلتا ہوں۔''

''اوہ، میں نے تمہارا وقت ضائع کیا، لیکن بہت دیر نہیں ہوئی۔ تم اب بھی مجھے چھوڑ کر واپس جا سکتے ہو۔'' وہ دونوں سڑک پہ آ گئے تھے، گھوڑا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''نہیں، کل چلا جاؤں گا، آج رات بیلی میں کام ہے۔''

''کیسا کام......؟'' وہ رُک کر اسے دیکھنے لگی، آنسو اب خشک ہو چکے تھے۔

''کچھ خاص نہیں، نادر نے بلوایا ہے، آؤ بیٹھو۔'' وہ ہاتھ آگے کیے اسے بٹھانے کا منتظر تھا، اس کے بعد اسے چڑھنا تھا، مگر اس نے اس کا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔

''نادر شاہ نے کیوں بلوایا ہے؟''

''یہ تو نہیں پتا، جا کر پوچھوں گا۔''

وہ چپ چاپ متفکر سی اسے دیکھے گئی۔

''کیا ہوا مایا؟''

''تم نادر شاہ پہ کتنا بھروسا کرتے ہو؟''

''وہ میرا دوست ہے۔''

''وہ تو ٹھاکروں کا بھی دوست ہے، کوئی سچا اور مخلص دوست آپ کے دشمن سے دوستی نہیں گانٹھتا۔ اس روز وہ حویلی آیا بیٹھا تھا، تمہارا ذکر کر رہے تھے۔ تمہارے خلاف کوئی کھچڑی پک رہی ہے، میں پوری بات نہیں سن سکی، مگر وہ باپ، بیٹا نادر شاہ کو رخصت کر کے بہت خوش تھے کہ انہوں نے تمہیں چت کر دیا۔''

''ہوں، اندازہ تو مجھے بھی ہے، خیر دیکھتے ہیں۔'' اس کے انداز میں ہنوز لاپروائی تھی۔

''بدر!'' وہ کسی انجانے خوف کے زیر اثر بولی۔ ''تم مت جانا۔''

''کیوں......؟''

''وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''بڑی ذات اللہ کی ہے۔تم کیوں فکر کرتی ہو۔ پھر وہ جتنا ٹھاکروں کا دم بھرے، میرا وہ بہت اچھا دوست ہے، چلو بیٹھو۔''

وہ متذبذب سی اسے دیکھتی اوپر چڑھ گئی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کی فکر میں اس نے کارلس والے واقعہ کو فراموش کر دیا تھا۔

اسے حویلی کے باہر چھوڑنے لگا تو احتیاطاً پوچھ بیٹھا۔

''گوپال کہاں ہے؟''

''شکار پہ گیا ہے، مگر واپسی رات تک ہو جائے گی۔'' پھر ہلکا سا مسکرائی۔'' کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

وہ گھوڑے پہ بیٹھا تھا اور وہ گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اگر کیا تو مجھے لگے گا، میں تمہارا اپنا نہیں ہوں، اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ۔'' اس نے گھوڑا موڑا، پھر پلٹ کر بولا۔'' اور ہاں، اب رونا نہیں۔''

''اچھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دی۔ وہ تھوڑی دور گیا تھا کہ پیچھے سے پکار اٹھی۔

''سنو، کل شام کنویں پہ آ جانا۔''

وہ ہلکا سا مڑا۔

''نہیں اب بیلی کے لوگ باتیں بنانے لگے ہیں۔''

''بنانے دو، تم آ جانا۔''

''اچھا صبح آ جاؤں گا، شام میں دوسرے گاؤں جانا ہے۔''

مایا نے مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا اور وہ اس خوشگوار صبح کا تصور لیے گھوڑے کو ایڑھ لگاتا وہاں سے چلا گیا، جو بدر غازان کے لیے کل نہیں آئی تھی۔

* * *

رات اس نے کھانا جلدی کھا لیا۔

''کہیں جانا ہے؟ ابھی تو آیا تھا۔'' چاچی اس کو جانے کی تیاری پکڑتے دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔

''ہاں اماں! گھڑی دو گھڑی تک آ جاؤں گا، تم فکر نہ کرنا، سو جانا۔'' وہ شال گردن کے پیچھے

سے گزار کر دونوں سرے آگے لے آیا، پھر جوتی پہننے لگا۔

''پر جا کدھر رہا ہے؟'' چاچی بے چین سی اس کے اردگرد پھر رہی تھی۔ ''کہیں پھر اس ڈائن کے پاس تو نہیں۔''

''نادر کے پاس جا رہا ہوں، کچھ کام ہے۔'' پھر ماں کا پریشان چہرہ دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

''اماں! نہ فکر کر، جلدی آ جاؤں گا۔'' اسے تسلی دے کر وہ باہر نکل آیا۔ اس کا رُخ نہر کی طرف تھا۔

نہر گاؤں کے آخری سرے پہ تھی، جو شخص باہر سے گاؤں آتا، وہ نہر کے ساتھ سے گزر کر آتا تھا۔ نہر کے آگے گاؤں ختم ہوتا تھا اور وہاں سے جنگل کا آغاز ہوتا تھا۔ نادر نے اسے پہلے کبھی نہر کنارے نہیں بلایا تھا۔ کوئی خاص کام ہوگا۔

وہ سوچ کر جیسے مطمئن سا تھا۔

نہر کنارے درختوں کی قطار تھی، ان کے پیچھے جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگے تھے۔ وہ نہر پار کر کے جھاڑیوں تک پہنچا تو اسے نادر وہاں بیٹھا نظر آیا۔

''بدر!'' وہ گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اس سے گلے ملا۔ ''کیسے ہو......؟''

اور وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے اندازے کی درستی پہ مسکرا دیا۔ (تو نادر شرمندہ تھا اور معذرت کرنا چاہتا تھا۔)

''اور سنا یار! کتنے دن بیت جاتے ہیں، تجھ سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ میں خود کام میں اتنا مصروف رہا، اس روز بھی ٹھیک سے بات نہیں کر سکا، بعد میں بڑا افسوس ہوا۔'' وہ دونوں درختوں تلے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ نادر کی نگاہیں سامنے نہر کے اس پار راستے پہ تھیں۔

''چھوڑ یار!'' اسے اس روز برا تو لگا تھا، مگر کسی کو اپنی وجہ سے کیوں اتنا شرمندہ کرتا۔ ''اور سنا، ٹھاکروں کا کیا حال ہے؟''

''بڑا کھڑاگا ہے ان کو شیکھر کے قتل کے سلسلے میں، مگر نہیں مانتے، مجھے وہ بے قصور لگتے ہیں۔ میم صاحب کے پاس بہت سے گواہیاں ہیں اور وہ واقعی امرتسر میں تھی، ورنہ اسے شامل تفتیش کر لیتا۔''

''مجھے وہ اس معاملے میں بے قصور لگتی ہے۔'' وہ کارلس کا شک گول کر گیا۔

''ہوں۔'' نادر مسلسل سامنے راستے پہ دیکھ رہا تھا۔ بدر نے دیکھا ایک رومال میں لپٹا پستول

اس کے ہاتھ میں تھا، جسے وہ عادتاً انگلیوں کے درمیان گھمارہا تھا۔

''تو آج کل کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں، بس قبرستان والے بھوت کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔''

''ارے چھوڑ یار! مجھے نہیں لگتا وہاں واقعی کوئی بھوت ہے۔''

''مجھے بھی نہیں لگتا کہ وہاں واقعی بھوت ہے، مگر میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بھوت کا ناٹک کرنے والا کون ہے؟''

''مجھے تو یہ اس جوگی کا کام لگتا ہے۔ بدر اس کا ایک چیلا حکیم ماجد کے قتل کے کیس میں پکڑا گیا تھا۔ قبر سے کھوپڑی نکالنے گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے یہ جوگی کوئی چلہ کاٹ رہا ہے، جس کے لیے اسے ایسی چیزوں کی ضرورت ہے اور قبرستان میں کھدائی کے آثار ہیں۔''

پل بھر کو نہر کے کنارے خاموشی چھا گئی، اتنی خاموشی کہ بدر کو لگا ان دونوں کے پاس الفاظ ختم ہو گئے ہیں اور اگر ایسا تھا تو وہ ایک ساتھ کیوں بیٹھے تھے؟ کیا نادر نے اسے صرف اسی لیے بلایا تھا کہ اسے ساتھ بٹھا کر راستے پہ نگاہ رکھ سکے۔

''آج رات اس راستے سے چندری سنگھ نے گزرنا ہے، اس کے لیے ناکہ لگایا ہے۔'' چندری سنگھ ساتھ والے گاؤں کا نامی گرامی ڈاکو اور فراری تھا۔

''اوہ، باقی نفری کدھر ہے؟''

''وہ پیچھے ناکہ ہے، میں ادھر آ بیٹھا ہوں، تجھ سے ایک بات بھی کرنی تھی۔'' پھر رک کر تصحیح کی۔ ''بلکہ پوچھنی تھی۔''

''ہاں بولو۔'' بدر نے اس کا چہرہ دیکھا۔

نادر نے ایک گہری سانس لی، وہ ابھی تک راستے کو دیکھ رہا تھا۔

''آج بی چھمن تھانے آئی تھی۔''

''کیوں؟'' وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔

''تو تو جانتا ہے، وہ ہماری مخبر ہے، ادھر اُدھر کی خبریں لا کر دیتی ہے۔ اس نے آج ایک عجیب بات بتائی۔''

''کیا؟'' اس نے محتاط ہو کر سوال کیا۔

''اس نے کہا۔'' نادر نے رُخ اس کی طرف موڑ کر بغور اس کے تاثرات دیکھے۔'' کہ گوپال راج نے تمہاری منگیتر کے لیے پیغام بھیجا ہے، رشتے کا پیغام۔'' وہ سناٹے میں رہ گیا۔

''وہ پیغام گوپال نے بھیجا تھا؟ اس کی یہ ہمت؟ وہ جانتا نہیں کہ وہ ہندو ہے اور ہم مسلمان۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کا ردِعمل ظاہر کرے؟ وہ پہلے حیران ہوا، پھر اسے غصہ آیا تھا۔

''وہ کہتا ہے وہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہے۔''

''دیکھ چکے ایسوں کی تبدیلی مذہب۔'' اس نے غصے سے سر جھٹکا۔'' میں تو پوچھ ہی نہیں سکا کہ ایسا پیغام ڈالا کس نے ہے تو وہ گوپال تھا؟''

''تو نے انکار کیوں کیا، جب تجھے علم نہیں تھا کہ وہ گوپال کا پیغام ہے۔''

''جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ زہرہ میری منگ ہے، ایک کٹنی کے ہاتھوں رشتہ ڈالے، وہ شخص اچھے قماش کا نہیں ہو سکتا۔''

نادر شاہ کے اندر جوار بھاٹا سا پکنے لگا۔ پستول اس کی انگلیوں میں ساکت ہو گیا۔

''مگر گوپال...... اس کی یہ ہمت؟ اور وہ زہرہ کو کیسے جانتا ہے؟'' وہ غصے میں بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔

''جانتا تھا، جب ہی تو وہ چند روز قبل زہرہ کو ٹھاکروں کی حویلی لے کر گیا تھا۔'' بدر طیش سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا بکواس ہے؟''

نادر شاہ اطمینان سے اٹھا۔'' کیا تم نہیں جانتے کہ تین روز قبل ٹھاکر تمہاری منگیتر کو بہلا پھسلا کر اپنی حویلی لے کے گئے تھے۔ دو، تین گھنٹے اِدھر رکھا بھی تھا اور......''

''آگے ایک لفظ نہ بولنا نادر!'' وہ لب بھینچے انگلی اٹھائے بولا، اس کا چہرہ شدت طیش سے سرخ پڑ گیا تھا۔'' زہرہ کہیں نہیں گئی، ٹھاکروں نے بے پر کی اڑائی ہے۔''

''تمہیں میم صاب نے نہیں بتایا۔ وہ بھی تو اُدھر تھی۔'' بدر سناٹے میں رہ گیا۔

''نہیں نادر! یہ جھوٹ ہے۔'' اسے لگا اس کی عزت بیچ چوراہے پہ تار تار کر دی گئی ہے۔

اور اسی لمحے سامنے کچے راستے پہ ایک گھڑ سوار سست روی سے گھوڑا چلاتا نمودار ہوا۔ نادر

نے ایک نگاہ بدر کے سفید پڑتے چہرے پہ ڈالی اور پھر بہت اطمینان سے رخ سڑک کی طرف موڑ کر پستول اونچا کیا اور گولی چلا دی۔

گھڑ سوار اوندھا ہو کر گھوڑے کے سر پہ آن گرا۔ نادر نے دوسری گولی چلائی، اب کے گھڑ سوار نیچے زمین پہ گر کر خون میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ گھوڑا ہنہنانے لگا۔ نادر نے تیسری گولی مار دی تو زخمی کی حرکت رک گئی۔

پھر اس نے اسی اطمینان سے رومال میں لپٹا پستول بدر کی طرف بڑھایا، جو چونک کر سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''ذرا پکڑنا، میں اتنے میں اے ایس آئی کو لے آؤں۔''

اس نے بظاہر عجلت میں پستول بدر کے ہاتھ میں دینا چاہا، مگر وہ اس پریشانی اور نادر کی ذہن کو ماؤف کر دینے والی باتوں سے ابتر ہوئی ذہنی کیفیت کے باوجود اتنا ہوش مند تھا کہ جھنجلا کر پیچھے ہٹا۔

''تیرا پستول ہے، میں کیوں پکڑوں؟''

''میں آتا ہوں۔'' نادر نے پستول اِدھر ہی زمین پہ گرا دیا اور تیزی سے ایک طرف کو نکل گیا۔

''زہرہ کو اٹھا کر اپنی حویلی میں لے گئے؟'' عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ نادر جو بھی کہہ کر گیا تھا، اس پہ یقین کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا، بہت بڑا بوجھ تھا جو اسے اپنے کاندھے جھکاتا محسوس ہوا تھا۔

درختوں کے پار پتوں کے کھڑکنے کی آواز آئی تو اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔

دو گھوڑے سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ ایک پہ نادر شاہ سوار تھا اور دوسرے پہ اس کا اے ایس آئی۔ تیسرا گھوڑا ان سے چند قدم پیچھے تھا۔ جس پہ ایک اہلکار سوار تھا۔

''یہ تو ملک بدر ہے۔'' اس کی سماعت سے نادر شاہ کی حیران آواز ٹکرائی۔ وہ اپنے اے ایس آئی سے مخاطب تھا۔

بدر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

اسی پل تیسرے گھوڑے کا سوار اہلکار جست لگا کر اترا اور لاش کی سمت گیا۔

"بدر!" اب نادر شاہ دور سے جیسے آواز دے کر اسے پکار رہا تھا۔
"ہاں۔" دور کہیں اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔
"تو اِدھر کیا کر رہا ہے؟"
"میں؟ تو نے ہی تو۔" اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ تیسرا اہلکار بھاگتا ہوا واپس آ رہا تھا۔
"شاہ صاحب، لاش وہیں پڑی ہے۔" پھر بدر کو دیکھا اور نگاہ اس کے ہاتھوں کی طرف گئی، جو خالی تھے۔
"پستول کدھر ہے؟"
اے ایس آئی بھی اتر کر آ گیا تھا۔ زمین پہ پڑا پستول اس نے ہی دیکھا اور جھک کر رومال سے اٹھایا۔
"یہ کیا کیا تو نے بدر؟ تو نے بندہ مار ڈالا؟" نادر شاہ گھوڑے سے اتر کر اس کی طرف آیا اور بہت ششدر اور دکھ سے پوچھا۔
"میں نے؟ نہیں نادر۔" وہ تیزی سے بولا۔ کہیں کچھ بہت غلط تھا۔ "یہ تم نے مارا ہے، یہ چندری سنگھ ڈاکو تھا۔ تم نا کہ...... یہ تمہارا پستول ہے یہ میرا پستول نہیں ہے۔" اے ایس آئی جو اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا، اس سے ہاتھ چھڑا کر وہ جیسے وضاحت دے رہا تھا۔
"میرا پستول؟" نادر نے حیرت سے اسے دیکھتے ہولسٹر سے پستول نکالا۔ "میرا پستول تو میرے پاس ہے۔"
"نہیں۔" اس نے ہتھکڑی لگانے کے لیے بڑھتے اے ایس آئی کے ہاتھ کو پھر جھٹکا۔
"میں نے قتل نہیں کیا، میری بات سنو میں نے۔"
"بس کرو ملک! ہم سب نے دیکھا ہے۔ ادھر گولی کی آواز آئی، ادھر ہم آئے تو یہ پستول تیرے سامنے پڑا تھا تو نے بندہ مارا ہے، ہم سب جانتے ہیں۔" اے ایس آئی نے ڈپٹ کر اس کے ہاتھ پہ ہتھکڑی لگا دی۔
وہ ساکت رہ گیا۔
یہ سب کیا ہو رہا تھا، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
"تو نے قتل کیوں کیا بدر؟ تو ایسا تو نہ لگتا تھا۔" نادر شاہ بہت افسوس سے اسے دیکھتے آہ بھر کر

بولا۔ ''اسے تھانے لے چلو۔'' پھر ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''اور جاؤ جا کر دیکھو مرنے والا کون ہے؟ کس کو مارا ہے تو نے؟''

اب کے وہ کچھ نہیں بولا، اسے معلوم تھا اب ساری وضاحتیں، ساری صفائیاں بے کار ہوں گی۔ وہ پھنس چکا تھا اور دور، دور تک بچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا۔

''کیوں نادر؟'' وہ دکھ سے اسے دیکھے گیا۔ ''کیوں؟ تو تو میرا دوست تھا، پھر کیوں؟'' صدمہ، دکھ، افسوس...... وہ دوستی کی قبر پہ نوحہ پڑھ رہا تھا۔ ''ہم تو اندھیرے جنگلوں کے ساتھی تھے، پھر کس نے الگ کر دیا ہمیں؟''

''دوست تھا، لیکن تو نے قتل کیا ہے، میں قانون کا محافظ ہوں، قانون کیسے توڑوں؟ ہاں بھئی، لاش کی شناخت ہوئی؟''

وہ بے گانہ سا ہوا، اپنے ساتھی سے پوچھ رہا تھا۔

''جی صاب، شناخت ہو گئی ہے۔''

''کون تھا مرنے والا؟''

''ٹھاکروں کا لڑکا گوپال تھا۔''

''نادر! تو نے اچھا نہیں کیا۔'' اس نے بے بسی اور نفرت سے نادر کو دیکھا۔ اس نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے اور تب بدر نے دیکھا، نادر کے پیچھے دور درختوں کے بیچ ایک ہیولہ سا حرکت کر رہا تھا۔

اے ایس آئی اور دوسرے اہلکار اسے لے کر چل پڑے تو وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے کن اکھیوں سے دیکھا، وہ ہیولہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سیاہ چغہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اگلے ہی پل وہ درختوں کے اس پار اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔

تو یہ تھا قبرستان کا بھوت۔

ایک تسلی بخش احساس نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

کوئی تھا اِدھر جو اس کی بے گناہی کا گواہ تھا۔

* * *

رات کا تیسرا پہر ابھی باقی تھا، جب نیچے سے شور سنائی دینے لگا۔ اونچی اونچی آواز میں

عورتوں کے بین اور ماتم......

اس نے لحاف پھینکا، پلنگ کے پردے ہٹائے، نیچے اتری اور جوتے پہنے بغیر ہی ننگے پاؤں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سیڑھیوں کے اوپر کھڑے اس نے دیکھا، نیچے بڑے کمرے میں راجپوتوں کی دور قریب کی رشتے دار عورتیں جمع ہو رہی تھیں۔ بلند آوازیں، آہ و بکا، اونچے بین۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" اس نے کوفت سے بلند آواز میں پوچھا تو ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا، بہت سی گردنیں اوپر کو اٹھیں، جہاں وہ کھڑی تھی۔

گلابی ریشمی شب خوابی کا لباس پہنے سینے پہ ہاتھ باندھے وہ بے زاری سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ سنہرے بال شانوں پہ بکھرے تھے اور موتیوں سے پروئی لٹ دائیں کندھے پہ آگے کو پڑی تھی۔ ستواں ناک چڑھا رکھی تھی اور پیشانی شکن آلود تھی۔

"بدر غازان نے گوپال کو قتل کر دیا ہے۔" ایک نسبتاً ادھیڑ عمر ٹھاکرائن بولی اور آنچل میں منہ چھپائے رونے لگی۔ دفعتاً سارے میں ماتم کناں آوازیں پھر سے گونجنے لگیں۔

"کیا......؟" وہ تحیر میں رہ گئی۔ "کب ہوا یہ؟ کیسے ہوا؟"

رات کو گوپال شکار سے واپس آ رہا تھا، وہیں گھات لگائے ملک بدر بیٹھا تھا۔"

"گوپال کو گولی مار دی۔"

"پولیس کی پٹرول پارٹی قریب ہی تھی، فائر کی آواز پہ اسے جا لیا۔"

"بدر غازان حوالات میں بند ہے۔"

"رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، پھانسی چڑھ جائے گا۔"

بھانت بھانت کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں، جانے کون کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی ننگے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگی۔

"بڑے ٹھاکر کہاں ہیں؟" ایک ملازمہ کو روک کر پوچھا۔

"وہ مردان خان میں ہیں۔ بری حالت ہے ان کی، ایک ہی تو پتر تھا ان کا۔"

"سنو، بدر غازان پکڑا گیا ہے کیا؟"

"ہاں جی میم صاب! سنا ہے وہ تھانے میں بند ہے۔" وہ کہہ کر عجلت میں آگے بڑھ گئی اور وہ

متذبذب سی تاسف سے دیکھتی رہ گئی۔

جو ہو رہا تھا، بہت برا ہو رہا تھا۔

* * *

اس نے سگریٹ لبوں سے نکال کر میز کے کنارے سے مسلا اور ایش ٹرے میں رکھ دیا، پھر سپاہی کی جانب دیکھا۔ "جاؤ، ملک صیب کو لے کر آؤ۔" لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

وہ جتنا خوش ہوتا، کم تھا، سب کچھ اس کے حسب منشا ہوا تھا۔ بدر غازان قتل کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مجرم تھا اور اس کی کم سے کم سزا عمر قید اور زیادہ سے زیادہ پھانسی تھی۔ وہ حوالات میں بند تھا اور زہرہ نادر شاہ کو اپنی دسترس میں لگ رہی تھی۔ بدر کی سزا پر مہر اس وقت لگنی تھی، جب وہ اقبالی بیان دے دیتا، لیکن یہ کون سا مشکل تھا۔ زہرہ کا وجود ترپ کے اس پتہ کی طرح تھا جو نادر شاہ کو ابھی بہت سی جگہوں پہ کھیلنا تھا۔

عرصہ پہلے جب وہ دونوں ایک جتنا حصہ ڈال کر فرنگیوں کے خلاف راہزنی کی وارداتیں کرتے تھے تو بدر منہ نہیں چھپاتا تھا۔ نتیجتاً اس کا نام لوگوں کی زبان پہ آنے لگا۔ وہ آن کی آن میں بیلی کا ہیرو بن گیا کہ کمپنی صاحب کو کون پسند کرتا تھا بھلا؟ اور وہ جو منہ چھپائے، آواز بدل کر بولتا تھا، پس منظر میں چلا گیا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں ایک احساس کمتری پیدا ہو چلا تھا، جسے بدر کی دوستی بڑھنے نہ دیتی تھی لیکن اندر سے وہ اس پہ رشک کرنے لگتا تھا۔ سارے گاؤں کے مسلمانوں کے لبوں پہ بدر غازان کا نام ہوتا۔ وہ جو شہسوار ہے، وہ جو راہزن ہے، وہ جو ایسا بہادر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے...... ایسی ایسی باتیں سنتا تو کہیں نہ کہیں اسے اس سے حسد محسوس ہونے لگتا۔

پھر جب بدر نے ایک انگریز عورت سے شناسائی کی بنا پہ اسے جانے دے کر عرصہ پرانا اصول توڑا تو بات اتنی بڑی نہ تھی، لیکن نادر شاہ کے دل کو بری لگی یا شاید اسے کوئی موقع چاہیے تھا بدر کو پکڑنے کا۔ بظاہر وہ اس کا سب سے بڑا حامی بنا رہا۔ مایا کے کیس میں اس کی بہت مدد کی، لیکن جب اس حسین لڑکی نے بدر کا نام لیا تو اسے لگا اب وہ اس کی مزید حمایت نہیں کر سکے گا۔ وہ بیلی کا تھانے دار تھا۔ تھانے دار بادشاہ، اس کے ہوتے ہوئے کیوں کوئی دوسرا ہیرو بنے؟

اور اس منصوبے سے اس کے سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔ اسے معلوم تھا گوپال شہر سے

باہر گیا ہوا ہے اور بدر اور گوپال کی عداوت سے سب واقف تھے، اگر بدر اسے مار ڈالتا ہے تو سب کو یقین آ جائے گا، لیکن اگر نادر گوپال کو مارتا ہے تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔

سپاہی اکیلا واپس آیا تو وہ چونکا۔

''ملک کہاں ہے؟''

''شاہ صاحب، وہ کہتا ہے......'' وہ سر جھکائے خاموش ہو گیا۔

''کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے نادر شاہ سے بولو، میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں، جو تمہارے بلانے پہ آ جاؤں ملنا ہے تو خود اندر آ ؤ۔''

نادر شاہ تلملا کر کھڑا ہوا اور تیزی سے اندر کی جانب بڑھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی، مگر وہ دبا گیا۔ ابھی اسے ٹھنڈا کر کے کھانا تھا۔

اس پل دروازہ کھلا اور اے ایس آئی کے پیچھے مایا اندر داخل ہوئی، وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا۔

''شاہ صاحب! یہ ملک بدر سے ملنے آئی ہیں۔''

سفید ساڑھی میں ملبوس وہ شاید نہار منہ ہی اٹھ آئی تھی۔ ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا، ساڑھی کا پلو فرش پہ اس کے پیچھے پھسلتا آیا تھا، وہ اسے قدرے پریشان لگی تھی۔

''اچھا۔'' کچھ سوچ کر اس نے واپس نشست سنبھال لی۔ ''انہیں اندر لے جاؤ اور ملوا دو، پھر وہ مایا سے مخاطب ہوا۔'' آپ سمجھائیے گا اسے کہ اب چونکہ رنگے ہاتھوں پکڑا ہی گیا ہے تو اقبالی بیان بھی......''

''چلو۔'' وہ انسپکٹر نادر شاہ کو نظر انداز کر کے خود ہی انداز اً اندر کی جانب بڑھ گئی تو اے ایس آئی اس کے پیچھے لپکا۔

نادر شاہ تلملا کر رہ گیا۔

* * *

آہنی سلاخوں کے اس پار زرد دیواروں والا کمرہ تھا، وہ اسی دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے، سر جھکائے زمین پہ بیٹھا تھا۔

وہ دھیرے سے چلتی ہوئی سلاخوں کے قریب آئی۔ ''بدر......''

اس نے سر اٹھایا۔

''مایا؟'' اس کی رت جگے سے سرخ آنکھوں میں زندگی کی ایک رمق دوڑ گئی۔

وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ اتنا قریب کہ دونوں کے درمیان بس سیاہ سلاخیں حائل تھیں۔ مایا نے دیکھا، اس کے دائیں رخسار پہ زخم تھا، بائیں آنکھ تلے نیل پڑا تھا، گردن پہ ایک زخم سے خون ابھی تک ہلکا ہلکا رس رہا تھا۔

وہ دکھ سے اسے دیکھے گئی۔ ''کیسے ہو؟''

''جیسا دکھ رہا ہوں۔'' وہ زخمی سا مسکرایا۔

چند لمحے کو اس تنگ و تاریک کوٹھری میں خاموشی چھا گئی۔ اسے مایا کی آنکھوں میں کرب سا دکھا تھا۔ وہ اسے ویسی ہی لگی تھی، جیسے پچھلی شام بیلی کے جنگل میں اس کٹے تنے پہ بیٹھی لگی تھی۔ روتی بلکتی، سادہ سی لڑکی، پہلے والی مغرور، پُراعتماد مہارانی سے چنداں مختلف۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی، مگر آنکھیں ویران ویران سی تھیں۔ چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور ڈھیلے جوڑے سے بال نکل کر چہرے کے گرد بکھرے تھے۔

''بدر......'' اس نے خاموشی کو توڑا۔ ''یہ سب اچھا نہیں ہوا۔''

وہ خاموش رہا۔

''میں بھلے گوپال کو ناپسند کرتی تھی، وہ کتنا ہی برا کیوں نہ تھا، لیکن اسے قتل کرنا کہاں کا

انصاف تھا۔"

"مایا......" اس کے دل کو دھچکا لگا۔ "تم بھی سمجھتی ہو کہ میں نے گوپال کو قتل کیا ہے؟"

"کیا مطلب......؟" مایا پل بھر کو ٹھٹکی۔ "تم نے گوپال کو قتل نہیں کیا؟" وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھے گیا۔

"بدر! مجھے بتاؤ، تم نے گوپال کو قتل نہیں کیا؟ اگر ایسا ہے تو تم یہاں کیوں ہو؟"

وہ خاموش تھا، سلاخیں خاموش تھیں، دیواریں خاموش تھیں۔

"خدارا، مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ سلاخیں پکڑ کر التجا کرنے لگی، وہ تب بھی چپ رہا۔

"بدر بولو، کس نے مارا ہے گوپال کو؟"

"نادر شاہ نے۔"

مایا کے ہاتھ سلاخوں پر سے گر گئے۔

"تھانے دار نے؟ مگر کیوں......؟"

"کیا تم میرا یقین کرو گی؟"

"تمہیں لگتا ہے، میں نہیں کروں گی؟"

اور پھر وہ اسے بتاتا گیا، ہر بات، ہر شے، ہر لمحہ گنواتا گیا......

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مت جاؤ، مگر......"

"مجھے بس ایک بات بتاؤ، کیا زہرہ ٹھاکروں کی حویلی گئی تھی؟"

"ہاں وہ آئی تھی، مگر میرے سامنے، وہ مجھے باتیں سنانے آئی تھی۔ نیچے گئی تو بڑے ٹھاکر نے شربت کے لیے روک لیا۔ اسی وقت نادر شاہ بھی آ گیا۔ وہ تو گواہ تھا سارے معاملے کا۔ اسی کے سامنے تو زہرہ واپس گئی تھی اور گوپال تو نادر شاہ کے بھی جانے کے بعد آیا تھا۔ اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ تو سارے معاملے کا خود گواہ تھا۔"

"اور تم نے بھی مجھے نہیں بتایا؟"

"میں کیوں بتاتی؟ تاکہ تم اس پہ گرجو برسو؟ وہ پہلے ہی مجھے قصوروار سمجھتی ہے۔ میں کتنی بری بنوں اس کی نظروں میں؟"

''نادر نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ تھک سا گیا تھا۔

''کیا تم ابھی تک نہیں سمجھے؟''

''کیا......؟'' وہ چونکا۔

''اس کی نظر زہرہ پہ ہے۔ اسی نے اس عورت کو تمہارے گھر بھیجا ہوگا۔ گوپال ایسی ہمت نہیں کر سکتا۔ وہ تو جب سے اسے علم ہوا تھا کہ زہرہ تمہاری منگیتر ہے۔ اس نے اس کو تنگ نہیں کیا تھا۔ نادر تمہیں اس کیس میں پھنسا کر زہرہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''تم......تم ایک کام کرو۔'' وہ سلاخوں کے قریب آیا اور مایا کے ہاتھ تھام لیے، آواز مدھم سرگوشی میں بدل گئی۔ ''تم قبرستان کے بھوت کو ڈھونڈو، وہ گواہ ہے، اس نے سب دیکھا تھا۔''

''کیا......'' وہ بھونچکی رہ گئی۔ ''تم نے بھوت ڈھونڈ لیا؟''

''نہیں، مگر میں نے اس وقت اسے درختوں کے پار دیکھا تھا۔ وہ جانتا ہے میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ وہ اصل گواہ ہے۔''

''بدر! اصل گواہ تم ہو کہ قتل نادر شاہ نے کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ہم تفتیش کو اوپر تک لے جائیں گے۔ میں کسی سے بات کرتی ہوں، شہنشاہ برطانیہ کے راج میں بھلے تم لوگوں کو غلامی ملے، مگر ناانصافی نہیں ملتی۔ یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں اور جو بھوت خود کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے، وہ کیوں بھری عدالت میں گواہی دے گا؟ کیا نادر شاہ کا وکیل اس سے یہ نہیں پوچھے گا کہ وہ اس وقت خود وہاں کیا کر رہا تھا، خیر تم فکر نہ کرو، میں کچھ کرتی ہوں۔''

''شکریہ۔'' وہ تشکر سے کہہ اٹھا تو وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''کس بات کا......؟''

''جو تم کر رہی ہو اس کا۔''

''تمہارے لیے تو نہیں کر رہی۔ اس محبت کے لیے کر رہی ہوں، جو مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے ہے۔ ہے نا بدر۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ملاقات کا وقت ختم ہونے والا ہے، میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔ تم پریشان نہ ہونا۔ وہ چلی گئی اور وہ دور تک نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔

* * *

''چاچی! بس دو نوالے کھا لے تو نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ صبح سے تیسری دفعہ کھانا اس کے سامنے رکھ چکی تھی، مگر چاچی سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتی تسبیح کے دانے گرائے جا رہی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے، یہ اٹھا لے یا خود کھا لے۔''

مگر وہ کیسے بتاتی کہ جب سے بدر کے گرفتار ہونے کی خبر آئی تھی، بھوک تو اس کی بھی اُڑ گئی تھی۔ بس ایک گہرا سکوت تھا، جس نے حویلی کو اپنے پروں تلے ڈھانپ لیا تھا۔ عجب ویرانی اور وحشت تھی۔ چاچی بس بیٹھی روتی تسبیح پڑھتی رہتی اور وہ سارے میں بولائی بولائی پھرتی۔ رہتا تو وہ بھی سارا دن گھر پہ تھا۔ فجر کے وقت نکل جاتا۔ دوپہر میں کھانا کھانے کبھی کبھی ہی آتا۔ واپسی رات میں ہی ہوتی، اکثر و بیشتر تو رات بھی باہر آ جاتی۔ وہ اور چاچی تنہا ہی ہوتی تھیں، مگر ایسی ویرانی تو پہلے نہ تھی جو اس کے گرفتار ہونے کی خبر کے ساتھ ان کے دلوں میں اتر آئی تھی۔ ہر رنگ پھیکا، ہر موسم، خزاں کا بن چکا تھا۔

''کوئی ملنے گیا ہے اس سے؟ ارے کوئی تو مجھے بتائے، پولیس نے اسے کیوں پکڑا ہے؟ میرا بچہ کیسے کسی کا خون کر سکتا ہے۔ تھانیدار تو اس کا پکا یار تھا، پھر اسے کیوں پکڑا۔'' وہ آنچل میں منہ چھپا کر پھپک کر رو پڑی اور زہرہ ایک دم چونکی۔

''ہاں، تھانیدار تو بدر کا دوست تھا۔ یہی تو وہ ہمیشہ سے سنتی آئی تھی، پھر اس نے کیسے پکڑ لیا اسے؟ کیا اسے جا کر اس سے پوچھنا چاہیے؟''

''میں چلی جاؤں تھانے؟''

''نہیں، نہیں تو نہ جا۔ بدر برا مانے گا۔'' چاچی نے فوراً منع کر دیا، مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔ چاچی کی بات اس نے سنی ہی نہیں تھی۔

* * *

''تو پھر کیا سوچا تم نے؟''

بدر نے سر اٹھایا، سلاخوں کے اس پار نادر شاہ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ وہ مسکراہٹ تھی، جو پہلے کبھی اس نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان دونوں کی دوستی کی قبر تھی۔ کاش وہ پہلے اس کا کتبہ پڑھ لیتا۔

''کوئی فیصلہ کیا ہے؟''

وہ اسی طرح دیوار سے کمر ٹکائے بیٹھا سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔

''بتاؤ ملک صیب! اقبالی بیان دو گے یا نہیں؟''

وہ بے تاثر نگاہیں نادر شاہ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ نیل اور زخموں سے بھرا تھا، فقط ایک روز میں ہی وہ کتنا کمزور اور زرد پڑ چکا تھا۔

''دیکھ بدر! تو اقبالی بیان دے ڈال۔ سب نے تیرے قریب پستول پڑا دیکھا ہے۔ تیرے جرم کے سب گواہ ہیں، اب تو بچ نہیں سکتا۔ بیان دے ڈال، نہیں تو تیرا معاملہ زیادہ خراب ہوگا۔''

وہ مسلسل چپ رہا تو نادر شاہ کو تاؤ آ گیا۔

''نہ تو کیا سمجھتا ہے؟ تو مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی ہونے سے پھر جائے گا تو تیری جان چھوٹ جائے گی؟''

پھر ایک لمحے کے توقف سے لہجہ بدل کر، کسی مخلص دوست کی طرح نرمی سے بولا۔

''تم مجھے کیس ٹھیک کرنے دو، میں تمہارا دوست ہوں، تم ایک دفعہ اقبالی بیان دے دو۔ میں استغاثہ میں دو تین کمزوریاں رکھ دوں گا۔ کیس ایسا بناؤں گا کہ تم تین چار پیشیوں میں ہی بری ہو جاؤ گے۔''

''اچھا۔'' وہ طنز سے ہولے سے ہنسا۔ ''نادر! تمہیں لگتا ہے اب میں تمہارا اعتبار کروں گا؟ میں زندگی میں لوگوں پہ بس ایک بار اعتبار کیا کرتا ہوں۔ وہ اسے توڑ دیں تو میں دوسرا موقع کبھی نہیں دیا کرتا۔''

''تیری تو......'' وہ کوئی سخت لفظ کہتے کہتے رکا اور لہجہ ہموار کر کے بولا۔ ''ٹھیک ہے، اعتبار نہ کر، مگر معاہدہ تو کر سکتا ہے۔''

''کیسا معاہدہ......؟'' اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''کچھ لو اور کچھ دو کا معاہدہ۔''

''بسم جایے تجھے؟''

''اونہوں۔'' نادر شاہ مسکرایا۔ ''مجھے زہرہ چاہیے تو اسے میرے نکاح میں دے دے۔ تو نے کون سا میم کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنی ہے اور میں تجھے چھوڑ دوں گا۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' بہت دیر بعد وہ بولا۔

''پھر تو تو پھانسی چڑھے گا ہی۔ میں تیری اس منگیتر کو اِدھر تھانے بلا کر تیرے سامنے اپنی قید میں پڑے اشتہاریوں کے حوالے.....''

وہ تیر کی طرح اٹھا تھا اور جھپٹ کر سلاخوں سے ہاتھ گزار کر نادر شاہ کی گردن دبوچ لی تھی۔

''آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا، ورنہ تیرا خون میرے ہاتھوں لکھا جا چکا ہے۔''

نادر شاہ نے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر بمشکل گریبان چھڑایا، اگر سلاخیں بیچ میں حائل نہ ہوتیں تو شاید اب تک وہ اس کو مار چکا ہوتا۔

''میں بھی دیکھتا ہوں تو کیسے اقبالی نہیں بنتا۔ تیرا تو باپ بھی اب قبر سے اُٹھ کر بیان دے گا تو نے نادر شاہ کو بدکار، بدنام بولا تھا نا، اب پورا بیلی دیکھے گا کہ بدنام کون ہے اور بدکار کون؟'' وہ گریبان درست کرتا بکتا جھکتا باہر نکل گیا۔

''اسے انگریزوں کی بیٹھک میں لے جاؤ اور سارا قصہ اگلواؤ۔'' اپنے سپاہیوں کو حکم دے کر وہ گہرے سانس لیتا بمشکل غصہ قابو کرنے لگا۔

ہندوستانی تھانیدار جب تشدد کرتے تھے تو فرنگی افسر اس طریقہ کار کو تھرڈ ڈگری اور ٹارچر سیل کو 'ڈرائنگ روم' کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ بعد میں یہ اصطلاحات پورے ہندوستان میں رائج ہو گئیں اور اب تک رائج ہیں۔

اسی وقت کھلے دروازے سے سیاہ چادر میں لپٹی زہرہ داخل ہوئی۔ لبوں میں کچھ بڑبڑاتا نادر شاہ ایک دم حیران سا کھڑا ہو گیا۔ اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔

''آؤ آؤ بیٹھو۔'' سارا تنتنا فراموش کر کے بہت نرمی اور عزت سے اس نے کرسی پیش کی۔

وہ جھجکتی پریشان سی بیٹھ گئی۔

''کہو خیریت؟'' وہ بظاہر بہت فکر مند سا اس سے مخاطب ہوا۔

''داروغہ جی! چاچی بہت پریشان ہے۔ بدر کو آپ نے کیوں پکڑا ہے، وہ قتل نہیں کر سکتا۔''

''یہی تو میں حیران ہوں۔ خیر تم فکر نہ کرو، جا کر اپنی چاچی کو تسلی دو۔ وہ بہت جلد گھر آ جائے گا۔''

''واقعی......؟'' اس کی سیاہ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔'' وہ گھر کب آئے گا؟''

''بہت جلد، تم تسلی رکھو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

''میں......'' وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔'' میں اس سے مل سکتی ہوں؟''

''ملنا تو قدرے مشکل ہوگا، لیکن میں تمہیں اسے دکھا سکتا ہوں۔''

''ملنا کیوں نہیں؟'' وہ بے چین ہوئی۔

''قانونی پیچیدگیاں ہیں، خیر تم ادھر آؤ۔'' وہ دلی خوشی پر قابو پاتا اسے اپنے ہمراہ لیے اندر آیا۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا، آہٹ پہ سر اٹھایا تو نادر شاہ کے ساتھ آتی زہرہ کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

''وہ دیکھو، وہ ادھر بیٹھا ہے، اب جاؤ۔''

''میں اس سے......''

''نہیں، ادھر آؤ۔'' اس سے پہلے کہ بدر اٹھتا اور کچھ کہہ پاتا، وہ زہرہ کو واپس لے گیا۔

چند لمحے بعد اس کی تنہا واپسی ہوئی۔

''اب بتاؤ ملک صیب؟'' لبوں پہ وہی مسکراہٹ سجائے وہ سلاخوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''نادر! خدا کے لیے اسے جانے دو۔'' وہ بے بس سا کھڑا ہوا۔

''تمہاری یہ سندری منگیتر اس وقت میرے تھانے میں بیٹھی ہے۔ میں نے اے ایس آئی کو جوگندر اور شام کو لانے بھیج دیا ہے۔'' اس نے چند نامی گرامی غنڈوں کے نام لیے۔'' وہ ایسا تازہ شکار ہاتھ سے کہاں جانے دیں گے۔ چند منٹ تک وہ تھانے پہنچ جائیں گے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں بندھوا کر ادھر تمہارے سامنے۔''

''بس کرو۔'' اس نے نڈھال ہو کر سلاخیں تھام لیں۔'' میں اقبالِ جرم کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر تم یا کوئی بھی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اسے عزت اور خیریت سے یہاں سے جانے دو۔ وہ چلی جائے گی تو میرا بیان لکھ لینا۔''

اطمینان و سکون نادر شاہ کی رگ رگ میں اتر گیا۔

''نہیں، پہلے تم بیان دو، پھر میں اسے بھیج دوں گا۔'' وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ بدر کا

کیا تھا، وہ زہرہ کے جاتے ہی پھر جاتا۔ اس جیسا سخت جان تشدد سے قائل ہونے والا تھا ہی کب......

''مجھے منظور ہے، مگر اسے جانے دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کسی کو آواز دی۔ ''اسے باہر لاؤ اور بی بی کو دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔''

***

اور اگلی صبح مایا امرتسر سے سیدھی تھانے کے سامنے سواری سے اتری اور اندر آتے ہی نادر شاہ سے بدر کو ملوانے کا کہا، تو وہ شائستگی سے مسکرایا۔

''آپ کاہے کو خوار ہوتی پھر رہی ہیں میم صاحب؟ وہ تو اقبال جرم کر چکا ہے۔''

وہ دھک سے رہ گئی۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ ہکلائی۔ ''بدر ایسا نہیں کر سکتا، اس نے یہ قتل نہیں کیا تو وہ کیوں کرے گا اقبال جرم؟''

نادر شاہ کو بے ساختہ وہ شام یاد آ گئی۔ جب وہ پرچہ کٹوانے آئی تھی۔ اٹھی گردن، تنفر بھری نگاہیں، حکمیہ انداز، وہ پُر اعتماد سی چال اور اب...... اب بغیر کاجل کے کالی آنکھیں۔ بے پروائی سے چہرے کے اطراف میں بکھری لٹیں، ڈھلی چوٹی۔ وہی کل والی سفید ساڑھی، خشک سوکھے لب، شاید اس نے تب سے اب تک ٹھیک سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اسے لگا تھا، جیسے اس کا غرور و تنتنا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہو اور اس میں سے ایک کمزور، بے بس سی لڑکی نکلی ہو، جس کا چہرہ ہر بات پر سپاٹ نہیں رہتا، جو بات بے بات پریشان ہو جاتی ہو۔

''وہ جرم کر چکا ہے۔ ظاہر ہے قتل کیا ہے تو اقبال جرم بھی کرے گا نا۔'' وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے مسرور سا بیٹھا تھا۔

''میں...... میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ملوائے دیتے ہیں میم صاب۔'' اس نے ایک اہلکار کو آواز دی۔

چند ساعتوں بعد وہ اس کے سامنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ دونوں کی کرسیوں کے درمیان میز تھی۔

وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے مایا کو اس پہ بے پناہ غصہ آیا تھا۔

''کیوں کیا تم نے اقبال جرم؟'' وہ چپ چاپ گردن جھکائے رہا۔

''بدر! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ تم نے کیوں کیا اعتراف؟ تم نے تو یہ قتل نہیں کیا، تم تو خود گواہ ہو۔ نادر شاہ نے......''

اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''میں نے کیا ہے قتل، میں نے ہی مارا ہے گوپال کو، کر لیا ہے اعتراف، دے دیا ہے میں نے بیان، جاؤ تم، مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔''

''میں کیسے چھوڑ دوں تمہیں تمہارے حال پہ۔'' اس نے بے اختیار بدر کے میز پر رکھے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیئے...... اس نے سرعت سے اپنے ہاتھ نکال لیے، وہ خالی ہاتھ رہ گئی۔

''بدر! ایسے مت کرو۔''

''تم جاؤ......''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''خدا کے لیے جاؤ۔ مت آیا کرو میرے پیچھے۔ تم سب، مزید مسائل کھڑے کرنے۔'' وہ جیسے تھک گیا تھا۔ مایا نے دیکھا، اس کی گردن کے زخم کا خون جم چکا تھا۔

''میں تمہیں بہت مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتی تھی، مگر تم اتنے سے تشدد سے ہار گئے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔'' تیزی سے کہتے کہتے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

''پھر کیا بات ہے؟ کس طرح کروایا ہے تم سے انہوں نے اقبال جرم؟''

''وہ زہرہ کو بیچ میں لے آیا تھا۔'' وہ بہت دیر بعد بولا تو اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔ ''زہرہ تھانے میرا پتہ کرنے آئی تھی۔ نادر نے کہا کہ وہ اسے میرے سامنے بے عزت کرائے گا، اگر میں نے اقبال جرم نہ کیا تو۔''

''اور تم نے یقین کر لیا؟ تم اتنے بے وقوف تو نہ تھے بدر! جس عورت کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہ سب کر رہا ہے، اسے ہی کسی اور کے ہاتھ میں دے دے گا؟ ارے کسی اور کو دینا ہوتا تو تم برے تھے کیا۔ وہ یہ سب کرتا ہی کیوں؟ بیلی کا کون سا مرد ہے جو اپنی عورت پہ کسی دوسرے کی نگاہ بھی برداشت کرے اور اگر زہرہ اتنے آرام سے تھانے آ گئی تو یقیناً پہلے بھی آتی رہی ہو گی۔ تم

نے نہیں سوچا، وہ کیوں آتی ہے؟ کیونکہ نادر شاہ نے اس کے سامنے خود کو اس کا سچا ہمدرد ظاہر کیا ہو گا۔ کیا وہ زہرہ سے بدسلوکی کر کے خود کو اس کی نظروں میں گرائے گا؟"

بدر متذبذب سا اسے دیکھے گیا۔

"بدر! اس وقت بیلی کی وہ واحد عورت جس کی عزت کی حفاظت نادر شاہ خود کرے گا۔ وہ زہرہ ہی ہے، پھر تم نے کیوں کیا اقبال جرم، کوئی اور نہیں......"

"اگر اس نے خود زہرہ کے ساتھ کچھ......"

"تاکہ ساری عمر کے لیے زہرہ کو خود سے نفرت کرنے پہ مجبور کر دے؟ ہمدردی اور خلوص وہ اس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے ہی تو دکھا رہا ہے۔"

اس نے سر جھکا لیا، شاید اسے مایا کی بات پہ یقین آ گیا تھا۔

"تم نے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گلہ کر گئی۔ "مجھ پہ اعتبار تو کیا ہوتا۔"

"تم کیا کر لو گی؟"

"میں کر چکی ہوں، نتیجہ تم جلد دیکھ لو گے۔" پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کل تک مجھے امید ہے کہ سی آئی ڈی کو یہ معاملہ تفتیش کے لیے دے دیا جائے گا اور صبح تمہاری مجسٹریٹ کے سامنے پیشی ہے۔"

"ہاں، مجھے بیان دینا ہے۔"

"بدر! خدا کا واسطہ ہے، تم اقبالی بیان سے پھر جانا اور کہنا کہ پولیس کے دباؤ میں آ کر لکھوایا گیا ہے۔ کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ تاکید کر کے چلی گئی اور وہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کی تکان بھری سنہری آنکھوں کو اپنے اردگرد محسوس کرتا رہا۔ بہت عرصے بعد اسے لگا تھا کہ وہ فرنگی شہزادی اپنے خول سے باہر آ رہی ہے۔

مگر وہ کیا تھی، وہ کبھی بھی نہ سمجھ سکا۔ جانے بعض لوگ اتنے پیچیدہ کیوں ہوتے ہیں۔ انہیں برسوں جان لو، پھر بھی ہر دفعہ ملنے پر وہ مختلف لگتے ہیں۔

* * *

اس نے وہی کیا، جو مایا نے کہا تھا، وہ مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی ہونے سے پھر گیا تھا۔

''نادر شاہ کے ذہنی دباؤ اور تشدد کی وجہ سے مجبور ہو کر میں نے اقبالی بیان پہ دستخط کیے تھے۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ میرے گھر کی عورتوں کو بیچ چوراہے پر بے عزت کرے گا، میں مجبور ہو گیا تھا۔''

کیس سی آئی ڈی کے پاس چلا گیا۔ سی آئی ڈی کے دو افسران جن میں ایک انگریز انسپکٹر اور دوسرا مسلمان تھا، کیس کی تفتیش کے لیے بیلی راجپوتاں آ گئے۔ نادر شاہ کو فی الحال کام کرنے سے روک دیا گیا۔ کمدار جس کو نادر نے بدر کو بلوانے کے لئے پیغام دلوایا تھا اور بی چھمن کے بیان نئے سرے سے لکھوائے گئے۔ تفتیش از سر نو شروع ہوئی تو دوسرے ہی روز جب ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا، بدر ضمانت پر رہا ہو گیا۔

وہ جب تھانے سے لینے آئی تو اسے وہ پہلے سے قدرے بہتر لگا تھا۔

''تم کیوں آئیں؟ کسی ملازم کو بھجوا دیا ہوتا۔''

وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔

''ملازم کس کا؟ تمہارا یا میرا، تمہارا تو علم نہیں، مگر اپنی تو ساری حویلی خالی پڑی ہے۔''

''کیوں......؟ بڑے ٹھاکر کہاں گئے؟''

''وہ......'' مایا نے رنجیدہ سی گہری سانس لی۔''ان کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے، جو گڑھا انہوں نے تمہارے لیے کھودا تھا، وہ گھاس کا ڈھکن اوڑھ کر ان کے قدموں تلے آ گیا۔ اب حویلی میں، میں ہوتی ہوں یا چند خادمائیں۔ بڑے ٹھاکر تو کمرے میں بیمار ہی پڑے رہتے ہیں بے چارے، خیر اگر کبھی آنا چاہو تو آ جانا۔''

''مایا......؟'' دور فصلوں کو دیکھتے اس نے پکارا۔''تم نے یہ سب کیسے کیا؟''

''میں نے ایک اعلیٰ افسر سے بات کی تھی۔''

''کس افسر سے......؟'' وہ خاموش رہی تو بدر کو اپنا سوال دہرانا پڑا۔

''جان کارلس سے۔''

''مایا......؟'' وہ دنگ رہ گیا۔ وہ ناخن کھرچتی نیچے دیکھ رہی تھی۔

''جان کارلس نے میرے لیے اتنا کچھ کیوں کیا؟''

''میں نے اس سے کہا تھا، میں شیکھر کا کیس بھول جاؤں گی، مگر وہ تمہیں رہائی دلائے۔''

"تم نے......" وہ شدید حیرت کے باعث بول نہیں پار ہا تھا۔ "تم شیکھر کے قاتلوں کو بھول جاؤ گی؟"

"تمہارے لیے۔" اس نے ہاتھ سینے پہ باندھ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "ہاں بھول جاؤں گی چلو، شام ڈوبنے کو ہے۔"

وہ آگے چل دی تو وہ...... اس کے پیچھے چلنے لگا۔ جانے اس کے کتنے اور روپ ابھی اس نے دیکھنے تھے۔

* * *

وہ گھر واپس آیا تو خزاں آلود حویلی میں جیسے عید اتر آئی تھی۔

سارے میں چراغاں ہوا، دیگیں پکیں، خیرات بٹی۔ کئی روز تک لنگر چلتا رہا، قرآن خوانی اور درس کی محفلیں سجتی رہیں، مگر چاچی تھکتی نہیں تھی۔

وہ بار بار اس کے سر کا صدقہ دیتی، کبھی دودھ میں ہلدی ڈال کر پلاتی تو کبھی زخموں کی ٹکور کرتی۔

"کیا حال کر دیا ہے ظالموں نے میرے بچے کا۔" وہ اس شام اس کی ٹکور کرتے ہوئے دکھی سی کہہ رہی تھی۔

"میں نے تو کبھی سخت ہاتھ نہیں لگایا تھا، جا زہرہ اسے گرم کر کے لے آ۔" اس نے کٹوری دروازے سے لگی زہرہ کی طرف بڑھا دی تو وہ جھجکتے ہوئے اندر آئی۔

وہ جب سے آیا تھا، اس سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ بس کبھی کبھی ایک خاموش، مگر سنجیدہ نگاہ ڈال دیتا، لبوں سے کچھ نہیں بولتا۔

اب بھی جب وہ کٹوری لے رہی تھی تو بس ایک نظر اس پر ڈالی، پھر رخ پھیر لیا۔

"کتنی خدمت کرتی ہے بے چاری، آدھی رہ گئی تیری فکر میں۔" اس نے چوکھٹ پار کی ہی تھی کہ چاچی بولی، دروازے کے دوسری جانب اس کے قدم رک گئے۔ "تیرے پیچھے رو رو کر ہلکان ہو گئی تھی۔ اب تو کر لے قدر اس کی بدر! اب نہ دیکھنا اس میم کی طرف۔ ارے جس دن اس نے اپنا قدم رکھا تھا حویلی میں، اس دن سے ہی برا وقت آیا ہے ہم پر۔"

"برا وقت تیری اس چہیتی کی وجہ سے آیا، نہ کہ میم صاحب کی وجہ سے۔" وہ جیسے پھٹ پڑا

تھا۔

''ایں؟ کیا کہہ رہا ہے؟''

''اماں! پوچھ زہرہ سے کہ یہ کیوں گئی تھی ٹھاکروں کی حویلی؟ نہ یہ جاتی ادھر، نہ وہ کمینہ تھانے دار اسے دیکھتا، نہ وہ چھمن کو رشتہ دے کر بھیجتا اور ذلیل کر کے نکالنے پہ مجھ سے بدلے کی خاطر مجھے کیس میں پھنساتا اور یہ بے وقوف لڑکی، پھر تھانے چلی گئی۔'' وہ بولتا گیا۔ چاچی حق دق سنتی رہی اور زہرہ، اس کے تو جسم سے جیسے سارا لہو نچڑ گیا تھا۔

''مایا نے کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی کہ زہرہ حویلی آئی تھی اور یہ مایا ہی تھی، جس نے صاحب لوگوں سے بات کر کے میری ضمانت کروائی ہے۔ مت کوسنے دیا کر اسے اماں! وہ اتنی بری نہیں ہے۔ جتنی تم دونوں اسے سمجھتی ہو۔''

اس نے ''دونوں'' کہا تھا، شاید اسے علم تھا کہ زہرہ تک آواز جا رہی ہے۔ چاچی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ زہرہ کو بُت بنا دیکھ کر رکا بھی نہیں، بس باہر چلا آیا۔

* * *

روز وہ تھانے جاتا تھا، تفتیش شروع تھی۔ نادر شاہ کو حراست میں لے لیا گیا تھا، مگر معاملہ ابھی دبا نہیں تھا۔ بدر ابھی تک مشتبہ تھا کہ اس کی گوپال سے پرانی دشمنی تھی۔ صرف اور صرف ایک شخص اس قصے سے اس کی گلوخلاصی کروا سکتا تھا اور وہ تھا قبرستان کا بھوت۔ وہ پچھواڑے آ گیا، دیوار کے ساتھ ایک کونے میں اس کا شکاری کتا شیرو بندھا تھا۔ زنجیر سے وہ اپنے پاؤں اور دم کو چاٹے جا رہا تھا۔

''رکھے...... رکھے۔'' بدر نے ملازم کو آواز دی۔ رکھا دوڑتا ہوا آیا۔

''جی مالک!'' اس نے گیلے ہاتھ قمیص کے دامن سے پونچھے۔

''یوں کر و مہری......''

اسی پل شیرو نے رکھے کو دیکھتے ہی بے تحاشا بھونکنا شروع کر دیا۔ بدر نے بات روک کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

''گوشت ڈال رہا تھا دیگ کے لیے، ہاتھ دھو لیے تھے، پھر بھی اس کو بو آ جاتی ہے۔'' وہ جیسے جھنجلا کر شیرو کو دیکھنے لگا۔ ''بڑی ناک ہے اس کی، دور سے ہر شے سونگھ لیتا ہے۔ اچھی قسم کا

گوشت ہوتو زیادہ بھونکتا ہے۔'' رکھا کہہ رہا تھا اور وہ جیسے خواب سے جاگا۔

''اوہ خدایا! میں نے پہلے کیوں دھیان نہیں دیا اس بات پر؟''

''یوں کرو اس کا گوشت وغیرہ ساتھ لو اور اسے میرے ساتھ لے کر آؤ، جلدی سے۔'' وہ تیزی سے ہدایات دیتا اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔

اور جب وہ تینوں پرانے قبرستان پہنچے تو رکھا ڈر کے پیچھے ہٹا۔'' صاحب! میں اندر نہیں جاؤں گا۔''

''اندر جانا بھی نہیں ہے۔'' وہ چڑ کر بولا اور زنجیر اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''پھر کیا......؟''

''شیرو کو اِدھر باندھ رہا ہوں، صبح کھول دیں گے۔''

''مگر کیوں صاب یہ تو......؟''

''میرے باپ مت بنو۔'' اس نے جھڑکا، پھر شیرو کی زنجیر خستہ حال پھاٹک کے ساتھ ایک جگہ سے باندھ دی۔'' اب جو بھی اندر جائے گا، اسے شیرو کو پھلانگ کر جانا ہوگا اور ایسے میں اس کی بو تو وہ پا ہی لے گا۔'' وہ اس کو کھلا بھی چھوڑ سکتا تھا، مگر اس صورت میں شیرو شاید اس بھوت کا قیمہ ہی کر دیتا، جبکہ بدر یہ نہیں چاہتا تھا۔

کتے کو باندھ کر اس نے ایک الوداعی نگاہ پرانے قبرستان پہ ڈالی۔ تباہ حال قبریں، ٹوٹے پھوٹے کتبے۔ ان پہ جھکا سایہ کرتا برگد کا وہ بوڑھا اُداس درخت اور قبرستان کی خاموش پُراسرار فضا...... ان دیکھی سفید لبادوں میں اِدھر اُدھر اڑتی روحیں...... گو کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا، مگر اس کا تخیل اسے دور لے گیا۔

''شیرو میری بات سنو، کسی کو اندر نہیں جانے دینا، مارنا بھی مت، مگر اندر مت جانے دینا۔''

وہ اسے سمجھاتا گیا اور شیرو دُم مٹی پہ مارتا زمین پہ بیٹھ گیا۔

* * *

''ملک صاب ...... ملک صاب!'' کسی نے صبح سویرے اس کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

رکھا اسے پکارنے کے ساتھ ساتھ دروازہ زور زور سے بجا رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلنگ سے

اترا اور دروازہ کھولا۔

''سب خیر تو ہے؟''

''خیر نہیں ہے ملک صاب......'' حواس باختہ سے رکھے کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟''

''شیرو کو کسی نے قتل کر دیا ہے، اس کی لاش پرانے قبرستان کے باہر پڑی ہے۔''

وہ اسے دیکھتا رہ گیا، شاید وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ صدمہ بہت شدید تھا۔

''یوں لگتا ہے کہ زبردست مار اماری ہوئی ہے جی، شیرو جوان منڈا تھا، شاید جم کر مقابلہ کیا تھا، مگر ظالموں نے ٹوکے سے گردن ہی کاٹ دی اس کی۔''

''چلو!'' اس نے قمیص کے بٹن بند کیے، جوتی پہنی اور باہر نکل آیا۔

''بدر......ناشتہ تو کر لے۔'' اماں پکارتی رہ گئی، مگر وہ تقریباً بھاگتا ہوا باہر جا رہا تھا۔

ویران پڑے قبرستان کا پھاٹک بند تھا، پھاٹک کی طرف شیرو کی لاش پڑی تھی۔ وہ پہلو کے بل گرا پڑا تھا، گردن پہ کسی تیز دھار آلے کا نشان تھا، شاید کلہاڑی کے دو چار وار کیے گئے تھے، قریب ہی ڈھیر سارا خون پڑا تھا۔

اس کے قدم سست پڑ گئے۔ دل میں ڈھیروں دکھ اتر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا شیرو کے قریب آیا اور پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا دکھ سے اسے دیکھے گیا۔

وہ اس کا بہت پرانا، بہت وفادار دوست تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے بہترین گوشت، بہترین دودھ منگواتا تھا۔ وہ بہت خونخوار تھا، مگر بدر کی آنکھ کا اشارہ سمجھتا تھا۔ اسے یاد تھا، جب وہ اسے اِدھر باندھ کر گیا تھا تو اس کی ہدایت سن کر وہ کتنی سمجھداری سے بیٹھ گیا تھا، جیسے واقعی وہ کسی کو اندر نہیں جانے دے گا۔

وہ ایک دم چونکا، اسے یاد آیا، اس نے شیرو کو قبرستان کے باہر باندھا تھا تاکہ وہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دے، اسے اندازہ تھا کہ قبرستان کا بھوت پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوتا تھا، وہ چاہتا تو چھوٹی سی چار دیواری کو پھاند بھی سکتا تھا، مگر جانے کیوں وہ ہمیشہ پھاٹک استعمال کرتا تھا۔ اس نے اس لیے کتے کو باہر باندھا تھا، جبکہ اب اس کی زنجیر کھلی پڑی تھی، جیسے کسی نے ہاتھ سے کھولی ہو، نہ کہ شیرو نے تڑوائی ہو۔ قریب ہی تازہ مٹی کی کھدائی کا نشان تھا۔

بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کیا وجہ تھی کہ کتے کو بھوت نے کھول دیا تھا؟

اس نے بغور دیکھا۔ شیرو کی لاش سے چند قدم دور گوشت کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فاختہ اور دو گلہریاں مری پڑی تھیں۔ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔

چغہ پوش کو یقیناً کتے کی بابت علم ہو گیا تھا، سو وہ زہر آلود گوشت ساتھ لایا تھا۔ اس نے یقیناً اس کے سامنے گوشت پھینکا تھا، شیرو گوشت کو دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھا ہوگا اور گوشت کو شاید اس نے سونگھا بھی ہو، مگر جیسے ہی چغہ پوش نے اندر داخل ہونا چاہا ہوگا، اپنے مالک کی ہدایت کے پیش نظر وہ لپک کر اس کو روکنے لگا ہوگا تو اپنے دفاع میں بھوت نے اسے مار ڈالا ہوگا۔ گوشت پڑا کا پڑا رہ گیا اور گلہریاں اور فاختہ اس کا شکار بن گئیں۔

''پھر یہ مٹی؟ اور کھلی زنجیر؟'' وہ غور سے مٹی کو دیکھنے لگا۔

پھاٹک کے قریب مٹی کی چھوٹی ڈھیری تھی، ساتھ کھدائی کا نشان تھا، جیسے پچھلی رات تازہ کھدائی کی گئی ہو۔ یعنی کہ بھوت نے کتے کو مارنے سے پہلے کھدائی بھی کی اور جب کتا بھونکنے لگا یا اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے جاتے جاتے کتے کا کام تمام کرنا مناسب سمجھا، مگر کیوں؟ اسے کتے سے کیا خطرہ تھا؟ وہ آرام سے دیوار پھاند کر بھی تو جا سکتا تھا، اس نے کتے کو مارنا کیوں ضروری سمجھا؟ شاید اسے ڈر ہو کہ کتا اس کی بو پا گیا ہے۔ اس نے کتے کو زہر آلود گوشت سے مارنا چاہا اور کتے نے حملہ کر دیا ہو تو اس نے اپنے بچاؤ میں کتے کو قتل کر ڈالا ہو۔

وہ اِدھر اُدھر زمین پہ غور سے دیکھتا پھاٹک تک واپس آیا۔ چیونٹیاں شیرو کی لاش کے اِرد گرد رینگ رہی تھیں۔ شیرو کی گردن پہ خون جم چکا تھا۔ اس نے جھک کر شیرو کا منہ کھولا۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس نے چغہ پوش کو کاٹا ہے کہ نہیں۔ کیا کرے؟ اور پھر وہ ٹھہر گیا۔

شیرو کے پنجوں پہ ناخون کے اندر گوشت کے ریشے پھنسے تھے اور معمولی خون بھی جما تھا۔ یعنی شیرو نے بھوت پہ پنجوں سے حملہ کیا تھا اور یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ خون رس کر شیرو کے پنجوں پہ بھی لگ گیا تھا۔ یہ خون اس کا اپنا خون نہ تھا کہ اس کے ساتھ ریشے بھی تھے۔ یعنی اس وقت چغہ پوش کے جسم پہ کتے کے کاٹے کا نشان موجود تھا۔

وہ اِدھر اُدھر پھر سے دیکھنے لگا۔ اس کے نوکروں کے قدموں نے کھرے تباہ کر ڈالے تھے، ورنہ اسے امید تھی کہ اس صورتحال کے بعد چغہ پوش کو کھرے مٹانا یاد نہیں رہے ہوں گے۔ پھاٹک

کے باہر دائیں طرف بالآخر اسے تین قطاروں میں کھرے نظر آ گئے۔ اس کے آگے پیچھے کے کھرے تباہ ہو چکے تھے۔

وہ غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ قدموں کے کھرے تھے، جوتی کے نہیں۔ دائیں پاؤں کا کھرا صاف تھا، بائیں پاؤں کا کھرا آدھا تھا، جیسے چغہ پوش بس ایڑی پہ زور دے کر پنجہ اٹھائے چل رہا ہو۔ کیا وہ لنگڑا تھا؟ مگر نہیں شاید وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یقیناً شیر دے نے اس کی ٹانگ پہ زخم دیا تھا اور وہ زخم یقیناً ٹانگ کے خاصے نچلے حصے یا پاؤں پہ تھا، کیونکہ بائیں کھروں پہ خون کے تین چار قطرے گرے تھے۔ زخم شدید تھا۔ وہ کھرا کس کا تھا؟ یہ صرف کوئی کھوجی بتا سکتا تھا، مگر کھوجی پولیس کا آدمی تھا۔ وہ نادر شاہ کے اب کسی بندے پہ بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔

بہر حال مرتے مرتے بھی شیر دا اپنا کام کر گیا تھا۔ اسے اب گاؤں میں کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا تھا، جس کے پاؤں یا پنڈلی پہ تازہ زخم ہو، یا جو لنگڑا کر چلتا ہو۔ شیر دے نے مرتے مرتے بھی وفاداری نبھا دی تھی۔

* * *

''حکیم جی اندر ہیں ماسی؟''

اس نے سب سے پہلے ماسی نذیراں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ دروازہ کھولا اور آنکھیں ملتے ہوئے اسے دیکھا، شاید وہ ابھی سو کر اٹھی تھی۔

''بدر بابو؟'' وہ حیران ہوئی، وہ بہت کم اِدھر آیا کرتا تھا۔ ''آ...... ہاں، حکیم جی اندر ہیں، آؤ اندر آؤ۔''

وہ اسے بیٹھک میں لے آئی۔

''بیٹھو ملک صاب۔'' وہ کپڑے سے جگہ جھاڑنے لگی۔ ''خیر نال آئے ہو؟''

''ہاں جی۔'' وہ سوچتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ''بس حکیم جی سے کام تھا۔''

ماسی نذیراں دروازے تک جاتی ٹھٹک کر پلٹی۔ ''کیسا کام؟''

''ایک مریض کا پوچھنا تھا، وہ اِدھر آیا تھا شاید۔''

''کس ویلے؟''

''کل رات۔''

''کل رات......؟'' وہ حیران سی سوچ میں پڑ گئی۔ ''رات تو بس مولوی غفور کی بیوی آئی تھی، بچے کی دوائی لینے، اسے یرقان تھا۔''

''تم حکیم جی کو بلاؤ، شاید انہیں علم ہو۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ ادھر اس لیے آیا تھا، کیونکہ بیلی میں حکیم جی کتے کے کاٹے کا علاج کرنے والے واحد حکیم تھے۔ اگر جبغہ پوش بھوت کو شیرو نے کاٹا تھا تو وہ یقیناً ادھر ہی آیا ہو گا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ شہر چلا جاتا، وہ یہ بھی کر سکتا تھا، لیکن اگر وہ بھوت جوگی شیکھر ہی تھا تو لازماً ادھر ہی آتا۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی تو وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ حکیم جی اندر داخل ہوئے۔ پچاس سے اوپر کا سن تھا، ڈھلکے کندھے، سر پہ ٹوپی اور شانے پہ صافہ، لاغر سا استخوانی وجود۔ اسے دیکھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

''کیسے آئے پتر؟'' پھر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''نیک بخت بتا رہی تھی کہ کسی مریض کا پوچھنا تھا۔''

''ہاں جی۔'' وہ بے چینی سے بولا۔ کل رات کوئی شخص کتے کے کاٹے کا زخم پنڈلی یا پاؤں پہ لیے آیا تھا۔''

''کل رات؟'' وہ حیران ہوئے۔ ''نہیں، ہرگز نہیں۔''

''پھر سے سوچ کر بتائیے۔'' اسے ڈر تھا کہ اس نے رشوت دے کر حکیم کا منہ بند نہ کر دیا ہو۔

''نہیں، کل رات تو کوئی نہیں آیا۔ بس مولوی غفور کے بچے کو یرقان......''

وہ پوری بات سنے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

''شکریہ حکیم جی! چلتا ہوں۔'' حکیم جی۔ ''ہیں ہیں'' کرتے رہ گئے، وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

اگر وہ حکیم جی کے پاس نہیں آیا تو یقیناً اس کے پاس خود کوئی توڑ ہو گا، یا وہ شہر گیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے جوگی شیکھر کے پاس توڑ ہو، وہ دوا دینے کا کام بھی کرتا تھا، لیکن اگر وہ شہر گیا ہے تو وہ جان کارلس ہو سکتا تھا۔ جانے کیوں بار بار اس کا ذہن بھٹک کر جان کارلس کی طرف جاتا تھا۔ وہی تھا جو شیکھر کے قتل میں ملوث تھا، وہی تھا جو اس رات قبرستان میں تھا۔ اسی نے مایا کو دھمکی دی تھی اور

یہی دھمکی بھوت نے بھی دی تھی۔

اسے اب ان دونوں افراد کو از سر نو چیک کرنا تھا۔ حویلی واپس آ کر اس نے ایک رقعہ لکھا۔

''میں قبرستان کے بھوت تک پہنچ چکا ہوں۔ شام تک حاضر ہو کر بتاؤں گا۔ رقعہ ملازم کو دے کر مایا کی طرف روانہ کیا۔

اب اس کا رخ جوگی شیکھر کی کٹیا کی طرف تھا۔

***

آج پھر اس کا چیلا باہر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا۔

''بابا سے ملنا ہے۔''

''منگل تو کل گزر گئی۔'' اس نے کہتے ہوئے چند سکے نکالے اور انہیں ایک ہتھیلی سے دوسری میں منتقل کیا۔ سکے کھنک اٹھے۔ چیلے نے بے اختیار اِدھر دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''کہو تو اگلی منگل کو آ جاؤں؟''

''نہیں نہیں، تمہارے لیے وقت نکل سکتا ہے۔''

''بہت بہتر۔'' اس نے سکے اس کی جھولی میں ڈالے اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

خیمے میں آج بھی وہی تعفن پھیلا ہوا تھا، کپڑے کی دیواروں پہ الٹے سیدھے حروف لکھے تھے۔ ایک کونے میں ہنڈیا جل رہی تھی، جانے اندر کیا پک رہا تھا۔

شیکھر بابا چوکڑی مارے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ وہ ایک نظر اس کے چغے کے اندر چھپے پاؤں پہ ڈال کر مؤدب سا بیٹھ گیا۔

''بول، کیا مانگتا ہے۔''

''اپنی بیوی کو حضور کے پاس علاج کے لیے لانا چاہتا ہوں۔ اس دن لایا تھا، اگر سرکار کو یاد ہو۔'' جوگی نے آنکھیں کھولیں اور اگلے ہی پل اسے پہچان گیا۔ اس کی لال انگارہ آنکھوں میں رمق سی دوڑ گئی۔

''ہاں ہاں یاد ہے، آگے بول۔'' پھر اس کے پیچھے خیمے کے دروازے کو دیکھا۔ ''بیوی کہاں ہے؟''

''وہ نہیں آتی، وہ آپ سے علاج کروانے سے ہچکچاتی ہے حضور!''

اب کے جوگی نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

''سرکار!'' وہ قدرے آگے کو ہوا۔ ''میری بیوی کہتی ہے، میں جسم گودوانے والے سے اپنا علاج کیونکر کروا سکتی ہوں؟''

''ہائیں؟ ہم اپنا جسم نہیں گودواتے۔''

''پر سرکار! وہ کہتی ہے کہ اس نے خود دیکھا تھا، آپ نے اپنی بائیں ران گودوا رکھی ہے، وہ کہتی ہے جب تک اسے تسلی نہ ہو جائے کہ ایسا نہیں ہے، وہ نہیں آئے گی۔ اسے وہم ہوتے ہیں۔''

''نہیں...... کدھر؟'' جوگی نے پریشان سا ہو کر چغہ ہٹا کر اپنی سوکھی سڑی بائیں پنڈلی سامنے کی۔ بدر نے بے اختیار گردن اونچی کر کے دیکھا۔

اس کی پنڈلی بالکل صاف تھی، نہ کتے کے کاٹے کا کوئی زخم تھا، نہ ہی گودوانے کا نشان۔

''ٹھیک ہے سرکار!'' وہ جیسے نتیجے پہ پہنچ گیا تھا۔ ''میں اسے شام کو لے آؤں گا، اجازت دیجئے۔''

تو اس کا اندازہ ٹھیک تھا، وہ چغہ پوش کوئی اور نہیں، بلکہ جان کارلس تھا۔ اب اسے صرف اور صرف اپنے شک، بلکہ یقین کی تصدیق چاہیے تھی۔

* * *

آج شاید قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی، وہ جیسے ہی گھوڑے پہ سوار گاؤں سے نکلنے لگا، جان کارلس اپنے گھوڑے پہ سوار سامنے کچی سڑک سے آتا دکھائی دیا۔ بدر کو لگا، آج ساری گتھی سلجھ جائے گی۔

''آہ...... ڈی سی بہادر......'' اس نے گھوڑا روک لیا اور مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ ''یقین کیجئے مہاراج! میں ابھی آپ سے ملاقات کے لیے ہی جا رہا تھا۔''

''کہو ملک! کوئی خاص کام تھا۔'' جان کارلس نے بھی گرم جوشی دکھائی۔

وہ دونوں کچی سڑک کے وسط میں آمنے سامنے گھوڑوں پہ تھے، اطراف میں بیلی کے درخت سر اونچا کیے کھڑے تھے۔

''آپ کو کچھ دکھانا تھا مہاراج!'' اس نے ذرا کی ذرا نگاہ جان کارلس کی پتلون میں چھپی

بائیں ٹانگ پہ ڈالی، پاؤں میں بوٹ اور جرابیں تھیں اور اوپر کوٹ اور سر پہ ہیٹ۔

''ارے وہ کیا؟'' کارلس متجسس ہوا۔

''نہر میں مجھے کچھ دکھائی دیا ہے، تھانیدار پہ بھروسہ نہیں ہے، سو آپ کو زحمت دوں گا۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی واردات کا سراغ مل گیا ہو۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔'' وہ بار بار ایک چور نگاہ اس کی ٹانگ پہ ڈالتا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' کارلس تیار ہو گیا۔ ''ابھی چلو۔''

وہ دونوں اپنے گھوڑے آگے پیچھے نہر کے قریب لے آئے۔ کارلس متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''شما کیجئے مہاراج! آپ کو زحمت ہو گی، مگر آپ کو اترنا پڑے گا۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' کارلس ہیٹ سنبھالتا گھوڑے سے اتر آیا۔ اس کی چال سے کچھ ظاہر تو نہ ہوتا تھا، مگر اصل اندازہ اس کی پنڈلی دیکھ کر ہی کیا جا سکتا تھا۔

''ادھر آیئے۔'' بدر نہر میں اتر آیا اور پانی میں ہاتھ مارنے لگا، جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ کارلس متذبذب سا کنارے پہ کھڑا رہا۔

''آ جائیے مہاراج! مجھے یہاں خون نظر آیا تھا، یقیناً کوئی لاش قریب ہی ہے۔'' اس سے آگے کارلس کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ''اچھا'' کہہ کر وہ پانی میں اترنے کیلئے تیار ہو گیا۔

بدر پانی میں ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا، اسے معلوم تھا کہ جان کارلس جیسا فرنگی بہادر پتلون اوپر چڑھا کر ہی پانی میں اترے گا اور یہی اسے دیکھنا تھا۔

کارلس جھکا اور پتلون اوپر موڑنے لگا۔ دائیں پنڈلی سامنے آئی، اب وہ جوتے اتار کر بائیں طرف کی پتلون اوپر تہہ کر رہا تھا۔

بدر ہاتھ روکے دم سادھے اسے دیکھتا رہا اور پھر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کارلس کی سرخ و سفید ٹانگ بالکل صاف تھی۔ ہلکے سے سنہری بالوں کے روئیں کے علاوہ کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

پھر وہ کون تھا......؟؟؟

کارلس اب پانی میں اتر رہا تھا۔ بدر کو ایک دم ہی وہ بے حد معصوم نظر آنے لگا۔ وہ تو بے قصور ہی تھا۔ بھوت تو کوئی اور تھا اور یقیناً اب تک گاؤں سے بھاگ چکا تھا۔ اب وہ مایا کو کیا بتائے گا، اس نے تو بھوت پکڑنے کا دعویٰ کر دیا تھا۔

شدید شرمندگی، زک اور مایوسی نے اسے ایک آن گھیرا۔ وہ پھر سے وہیں کھڑا تھا، جہاں پہلے دن تھا۔ کوئی سراغ، کوئی سرا، کوئی نشان اس کے ہاتھ نہ تھا۔

بہت مشکل سے کارلس سے جان چھڑا کر وہ راجپوتوں کی حویلی آیا تھا۔ حویلی خاموش اور ویران پڑی تھی۔ اس کے مکین اندھی دشمنیوں اور سازشوں کی نذر ہو چکے تھے۔ اس لمحے اس عالی شان حویلی کے سامنے کھڑے اسے ٹھاکر رگھوناتھ پہ بے پناہ ترس آیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ بڑے پھاٹ کے سامنے کھڑا رہا، یہ دہلیز اس نے کبھی پار نہ کی تھی، پھر آج کیسے کرتا؟

اور تب اسے بالکونی میں وہ سوگواری بیٹھی سنہری بالوں والی لڑکی نظر آئی۔ وہ بالکونی میں کرسی ڈالے گود میں اون کے گولے لیے سلائیوں پہ کچھ بُن رہی تھی، یکبارگی نگاہ اٹھا کر نیچے دیکھا تو چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

زور زور سے وہ کسی کو آواز دینے لگی اور پھر مسکرا کر بدر کو دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا بھی نہ سکا۔ اسے عجیب سی خفت ہو رہی تھی۔ وہ مایا کو کیا جواب دے گا؟

روپ وتی بھاگتی ہوئی آئی اور پھاٹک کھولا۔

''میم صاب آپ کو اوپر بلاتی ہیں۔''

اور اس سے انکار نہ ہو سکا۔ وہ کسی معمول کی طرح چلتا ہوا روپا کے پیچھے اندر آ گیا۔

حویلی ویران ہو گئی تھی، فضا سوگوار اور در و دیوار ماتم کناں تھے۔ کبھی یہ مہاراجہ بلدیو سنگھ کا محل ہوتی تھی، اب بس ایک حویلی رہ گئی تھی۔ مگر مہاراجہ کی عظمت اور شان و شوکت آج بھی اس کے میناروں کے کنگروں سے ٹپک رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں عبور کر کے مایا کے کمرے تک آیا تو روپا واپس پلٹ گئی۔

دھیرے دھیرے چلتے کمرہ عبور کر کے وہ بالکونی تک آیا۔ سلائیاں ابھی تک مایا کے ہاتھ میں تھیں، وہ اس کے استقبال کے لئے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اون کا گولا زمین پہ گر گیا۔

''آ ؤ بیٹھو۔'' وہ یقیناً اس کے آنے سے خوش تھی۔ بدر بمشکل مسکرا پایا، پھر وہیں منڈیر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیسے ہو؟'' وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی، اون کا گولا جھک کر زمین سے اٹھا کر گود میں رکھا، سلائیاں بھی چھوڑ دی تھیں۔

''ٹھیک ہوں؟'' اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اسے کیا جواب دے گا؟

''تم نے بھوت کا سراغ لگا لیا؟'' وہ بے صبری سے پوچھنے لگی۔

''میں نے پیچھا تو کیا، مگر......'' وہ سر جھٹک کر منڈیر کے اس پار دیکھنے لگا۔

دور کھیتوں کے اوپر سورج کی سرخ سی گیند نیلے آسمان پہ واضح تھی، چڑیوں کے غول اڑ کر اپنے آشیانوں کو واپس پلٹ رہے تھے۔ وہ اڑتی چڑیوں کو دیکھے گیا۔

''مگر کیا؟ تم نے کس کا پیچھا کیا؟ شیکھر کا؟''

''ہاں مگر میں جان کارلس سے بھی ملا۔'' وہ اب بھی دور ہوتی چڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''تو کیا وہ بھوت کارلس ہے۔'' وہ بے صبری سے کھڑی ہوئی تو اون کا گولا زمین پہ لڑھکتا چلا گیا۔ دھاگا کھلتا گیا، مایا نے جھنجلا کر اسے پکڑنا چاہا، مگر گولا دور جا رہا تھا۔

ٹھہرو۔'' وہ گولے کے پیچھے گئی، جو بالکونی کے کونے پہ جا کر رکا تھا اور جھک کر اسے اٹھایا۔ بدر گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے؟'' وہ گولا اٹھا کر واپس آ رہی تھی اور بدر بھول گیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کیا کہنے آیا تھا، وہ سارا دن کیا کرتا رہا تھا، اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ بس یک ٹک سامنے کا منظر دیکھے گیا۔

مایا اون کا گولا اٹھائے اس کے قریب آ رہی تھی۔ بدر نے دیکھا، وہ لنگڑا [illegible] رہی تھی، دائیں پاؤں پہ زور دیتی، بایاں پاؤں قدرے ٹیڑھا رکھ کر چلتی وہ واپس کرسی پہ بیٹھی۔ گولا پھر سے گود میں دھرا اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی تو نائٹی قدرے اوپر ہو گئی، اس کی بائیں پنڈلی جھلکی جہاں ٹخنے سے ذرا اوپر پٹی بندھی تھی۔

وہ جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

''ہاں...... تم کیا کہہ رہے تھے؟ کون ہے وہ بھوت؟'' وہ اسی طرح عام سے انداز میں پوچھ

رہی تھی اور...... ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

"بدر......!" اس نے پکارا تو وہ جیسے خواب سے جاگا۔

"وہ بھوت تم ہو مایا! وہ چغہ پوش تم ہو۔ تم ہو جو روز رات کو جاتی تھیں پرانے قبرستان۔ وہ چغہ تمہارا ہے، تم تھیں جس نے منگل سنگھ کو مرتے دیکھا تھا۔ اسے اگر زندگی موقع دیتی تو وہ مجھے بتا دیتا کہ وہ بھوت دراصل شیکھر کی میم صاحب ہے، مگر وہ کہہ نہ سکا۔ وہ تم تھیں مایا، وہ ہمیشہ سے تم ہی تھیں، تم نے کل رات شیرو کو مارا اور یہ بھی جانتی ہو کہ شیکھر کو کس نے مارا ہے۔ تم جانتی تھیں کہ وہ بھوت نہ گوپال ہے اور نہ ہی جوگی، مگر تم نے مجھے غلط راستے پہ لگایا تاکہ میں تم پہ شک نہ کر سکوں اور اس رات جب گوپال کا خون ہوا تو وہ تم تھیں مایا جس نے نادر شاہ کا جرم دیکھا تھا۔ وہ تم تھیں مایا۔"

اس کا دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا، اتنا بڑا دھوکا؟

وہ خاموشی سے اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ سنتی رہی، پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "تو تمہیں جان کارلس نے سب کچھ بتا دیا؟"

تو کارلس سب جانتا تھا، مگر وہ یہ سوچ کر حیران نہیں ہوا، اب کوئی چیز اسے مزید حیران نہیں کر سکتی تھی۔

"جان کارلس تمہارا کیا لگتا ہے؟" وہ بولا تو اس کی آواز میں عجیب سی شکستگی اور اجنبیت تھی۔

مایا نے ہولے سے استہزائیہ سر جھٹکا۔

"وہ خبیث بڈھا، میرا باپ ہے۔" اور وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

سامنے کھڑی عورت کون تھی؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو کبھی جان ہی نہ سکا تھا۔

"تم کون ہو مایا؟ تم کون ہو؟"

وہ اسی طرح سامنے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ نارنجی بادلوں کے سامنے سے اکا دکا پرندے اڑ رہے تھے۔

"تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں بدر؟" وہ بہت دیر بعد بولی تو آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔

"یہی کہ تمہارا نام مایا فرنینڈس ہے تم...... تم فرنگی شہزادی ہو اور تم شیکھر کی محبت میں ہندوستان آئیں۔" مایا نے آہستہ سے چہرہ اس کی طرف موڑا۔

’’نہ میں شہزادی ہوں، نہ ہی میں شیکھر کی محبت میں ہندوستان آئی تھی اور نہ میرا نام مایا فرنینڈس ہے۔‘‘ اس کی سنہری آنکھوں میں بے پناہ تھکاوٹ تھی۔ ’’میں تو لندن کے تھیٹر کی ایک اداکارہ ہوں بدر! میں نے تو بکنگھم کا شاہی محل آج تک اندر سے نہیں دیکھا۔‘‘

وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی تھی۔

’’میں، میرین جان کارلس عرف مایادتی کون ہوں، ہندوستان کیوں آئی ہوں، یہی تم سے چھپانے کیلئے میں نے تمہیں ہر ممکن طریقے سے غلط راستے پہ لگایا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے خطرہ تھا، یقین کرو تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔‘‘ وہ یاسیت سے مسکرائی، بدر کو لگا اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

’’بلکہ صرف اس لیے کہ میں جانتی تھی، جس دن تم جان جاؤ گے، میں تمہارا اعتبار کھو دوں گی، پھر بھلے تمہیں اپنی محبت کا کتنا یقین دلاؤں، تم کبھی نہیں مانو گے کہ اتنے عرصے سے تمہارے ساتھ اداکاری کرنے والی لڑکی کو واقعی تم سے محبت ہے۔‘‘

اس نے اضطراری انداز میں بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ موتیوں کی لڑی سے ہاتھ ٹکرایا تو اس نے چونک کر اسے انگلیوں کے بیچ تھاما اور کرب سے مسکرائی۔

’’میں نے بہت چھوٹی عمر میں چاقو دکھا کر لندن کی ایک سنسان گلی میں ایک امیر و کبیر عورت سے یہ موتیوں کی مالا لوٹی تھی، بعد میں مالا توڑ کر اسے بالوں میں پرو دیا، چوریاں...... ہاں بہت چوریاں کی ہیں میں نے۔‘‘

وہ پھر سے وہی ٹوٹی بکھری، عام سی، سادہ سی لڑکی لگنے لگی تھی، جو اس روز جنگل میں درخت کے کٹے تنے پہ بیٹھ کر رو رہی تھی۔ شہزادیوں کا نقاب، جو اس نے چڑھا رکھا تھا، جانے کدھر کھو گیا تھا۔

’’تم میری کہانی سننا چاہو گے؟‘‘ وہ جیسے خود پہ ہنسی۔ بھیگی سی ہنسی۔ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ پھسلتا گیا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر ایک بات طے تھی، اسے اب اس کے کسی آنسو کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس کی خاموشی پہ وہ خود سے کہنے لگی۔

''میرا نام میرین جان کارلس عرف مایاوتی ہے۔ میرین کے نام سے میرا بپتسمہ ہوا تھا۔ یہ نام مجھے میرے باپ جان کارلس نے دیا تھا اور مایاوتی میری ہندوستانی ماں نے۔ ہندوستان میں فرنگیوں کی ہندوستانی عورتوں سے اولادوں کے دو نام ہوتے ہیں۔ میری ماں کارلس کی بیوی نہیں تھی، وہ صرف اس کی ''بی بی'' تھی، کارلس میرا باپ نہیں ہے، یہ کارلس کو بہت دیر سے علم ہوا۔

میری ماں اپنے حقوق کے لیے ساری عمر کارلس کی منت کرتی رہی کہ وہ اس سے شادی کر لے، انگریز سرکار کی عدالت میں، مگر کارلس نے ایسا نہ کیا۔ پھر جب اس کی پوسٹنگ واپس برطانیہ ہوئی تو وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ میری ماں پیچھے روتی رہی، بلکتی رہی اور پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی۔ اسے جگر کا سرطان تھا، اس نے پیچھے سے کارلس کو بہتیرے خط لکھے، مگر وہ واپس نہ آیا، نہ اس نے مجھے میری ماں کے حوالے کیا۔ حالانکہ فرنگیوں کے حرم میں داخل ہونے والی ہر بی بی کی طرح میری ماں بھی جانتی تھی کہ اس کی اولاد کبھی اس کی نہیں رہے گی، مگر اس وقت دولت کی ہوس میں وہ اتنی اندھی تھی کہ اس نے یہ نظر انداز کر دیا۔ جب کارلس واپس نہ آیا تو اس نے اسے ایک آخری خط لکھا، جس میں بہت سی گالیوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ میں کارلس کی اولاد نہیں، بلکہ اس کے ایک فرنگی دوست کی اولاد ہوں، جو اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ اس خط کے پہنچنے کے تیسرے روز میری ماں مرگئی۔

تب میں نو برس کی تھی۔ جب کارلس کو یہ علم ہوا، اس نے مجھے ایک بوجھ کی طرح پالا۔ وہ مجھے دن رات میری ماں کے طعنے دیتا تھا، مگر کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ میری ماں نے آخری وقت یہ جھوٹ اس لیے بولا تا کہ وہ تنگ آ کر مجھے ہندوستان واپس اس کو دے آئے، مگر پھر جب وہ میرے نین نقش دیکھتا تو اسے لگتا میں اس کی بیٹی نہیں ہوں۔ اس کے لیے میں بوجھ تھی۔ بہت بڑا بوجھ۔

وہ مجھے بورڈنگ میں داخل کرا کے دوبارہ ہندوستان چلا گیا۔ سال میں ایک آدھ بار جانے کس جذبے کے تحت ملنے آتا تھا، میں کبھی نہ جان سکی۔ میں یتیموں کی طرح بڑی ہوتی گئی۔ نہ میں پڑھائی میں اچھی تھی، نہ کھیل کود میں۔ میری شکل بھی معمولی سے ذرا اچھی تھی۔ میں غریب لڑکی تھی۔ یہاں تک کہ وہ دن آن پہنچا جب میری سرایڈمنڈ سے پہلی ملاقات ہوئی۔''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔ نارنجی بادل شام کی گہری نیلاہٹ میں بکھرتے جا رہے تھے۔ اس

کے لبوں پہ مغموم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ یہاں نہیں تھی، وہ کہیں دور بہت دور، بہت پیچھے تھی، کھوئی ہوئی......اس کی آنکھوں میں ایک منظر جھلملا رہا تھا۔ سکول کی ایک راہداری میں سے گزرتا وہ کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس اُدھیڑ عمر شخص جو ساتھی ٹیچر سے مصروف انداز میں بات کرتا ایک دم راہداری کے سرے پہ ٹھٹک کر رُک گیا تھا۔

''سر ایڈمنڈ تھیٹر کے بہت بڑے اداکار و ہدایت کار تھے۔ ان کی میرے سکول کے ایک استاد سے دوستی تھی۔ اس سے کسی کام کے سلسلے میں وہ سکول آئے تو راہداری میں سے گزرتے انہوں نے میری آواز سنی۔ میں دوسری طرف سیڑھیوں پہ بیٹھی اپنے خرگوش سے باتیں کر رہی تھی، کبھی بلی کی آواز نکالتی، کبھی شیر کی، کبھی ہاتھی تو کبھی طوطے کی، کبھی ممی بن کر ڈانٹتی، کبھی ڈیڈی بن کر بہلاتی تو کبھی سٹھیائی ہوئی بوڑھی لینڈ لیڈی بن کر کرایہ مانگتی......

میں خرگوش سے عادتاً کھیل رہی تھی۔ وہ بھلا کہاں سمجھتا تھا، مگر سر ایڈمنڈ نے سمجھ لیا۔ وہ لپک کر میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے۔ میں ڈر گئی، میں نے کہا، میں نہیں جانتی۔ انہوں نے مجھ سے میرے ماں باپ کے متعلق سوالات کیے تو میں نے بہت مہارت سے پے در پے جھوٹے بولے۔ وہ سن کر، سمجھ کر چلے گئے اور بعد میں میرے کاغذات نکلوائے تو تمام معلومات اس کے برعکس نکلیں۔ وہ واپس میرے پاس آئے، غصہ کرنے نہیں، بلکہ یہ بتانے کہ میں ایک دن تھیٹر اور فلم کی ایک بہت بڑی اداکارہ بنوں گی اور یقین مانو، میں نے ان کا اعتبار نہیں کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے تھیٹر میں کبھی چانس چاہیے ہو تو ان کے پاس آ جاؤں، میں نے ان کا پتہ لے لیا۔ اس وقت میں چودھویں برس میں تھی۔ مجھے معلوم تھا، میں ان کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی۔

وہ رک کر ہولے سے ہنسی، پھیکی، ماتم کناں سی ہنسی۔

سورج اب ڈوب رہا تھا، سرخی مائل روشنی میں بدر دیکھ سکتا تھا، اس کی آنکھوں کے گوشے ابھی تک بھیگے تھے۔

''اور پورے دو برس بعد میں ان کے تھیٹر کے باہر کھڑی تھی۔ مجھے سکول سے خارج کر دیا گیا تھا، میرے پاس کھانے کو پھوٹی کوڑی نہ تھی، تب میں نے پہلی دفعہ چوری کی اور یہ موتی چرائے۔

پھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا تو میں نے سر ایڈمنڈ کے تھیٹر چلی گئی۔ وہاں کسی نے مجھے داخل نہ ہونے دیا۔ معلوم ہوا کہ سر ایڈمنڈ کو تو مرے ڈیڑھ سال ہو چلا تھا۔ میں نے کئی مہینے تھیٹروں اور اسٹوڈیو کے چکر لگائے، مگر وہاں کوئی مجھے اندر داخل تک نہ ہونے دیتا تھا۔ کارلس کبھی واپس آیا ہی نہیں، میں چھوٹی موٹی چوریوں پہ گزارا کرتی رہی، پھر ایک روز مجھے ایڈگر ملا۔ لوئی ایڈگر، وہ فرانسیسی ماں کا بیٹا تھا۔ تھیٹر کا بہت بڑا نام۔ میں روز اس کو دیکھتی تھی، پھر ایک دن میں نے اس کے گھر تک اس کا پیچھا کیا اور رات دیر تک انتظار کرتی رہی، پھر جب چوکیدار اِدھر اُدھر ہوا تو میں دیوار پھاند کر اندر چلی گئی اور سوتے ہوئے لوئی کی گردن پہ چاقو رکھ کر اسے اٹھایا۔

وہ بہت بڑا اداکار تھا، بالکل نہ گھبرایا، پرسکون سا مجھے دیکھنے لگا۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔" مجھے کیا چاہیے، میں نے کہا، وہ مجھے اپنے ساتھ ڈرامے میں رول دلوائے۔ لوئی نے ہامی بھرلی اور ایک رقعہ مجھے دیا، اسے لے کر کل اسٹوڈیو آ جاؤں۔ میں خوشی خوشی چلی گئی اور اگلے روز اسٹوڈیو آ گئی، مگر رقعہ کے باوجود جب دو دن تک کسی نے مجھے داخل نہ ہونے دیا تو مجھے احساس ہوا کہ لوئی نے مجھے محض بہلا وادے کر جان چھڑائی تھی۔ اگلی رات میں پھر اس کے گھر چلی گئی۔ اس دفعہ میں نے اسے نہ جگایا، بلکہ اس کی ایک قیمتی ہیرے کی گھڑی، جو میں نے پہلے بھی اس کے گھر دیکھی تھی، اٹھالی اور اس کی جگہ وہی رقعہ رکھ دیا۔

وہ گھڑی لوئی کو اس کی محبوبہ نے دی تھی، وہ اس کا دیوانہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتا رہا، اسے وہ گھڑی واپس چاہیے تھی۔ اس نے پولیس کو نہ بتایا کہ وہ جانتا تھا، میں اداکاری کی دیوانی اس کی گھڑی تباہ کر دوں گی۔ ہفتے بھر بعد میں تھیٹر گئی اور گھڑی لوئی کو لوٹا دی، اس روز مجھے اپنا پہلا کردار مل گیا۔"

بادل سیاہ پڑ گئے تھے، نیلے آسمان پہ تارے جگمگانے لگے تھے، شام بس ڈھلنے کو تھی۔

"میں چند برسوں میں لندن کے تھیٹر کی کامیاب اداکاراؤں میں سے ایک ہوگئی۔ میں نے بہت سے کردار کیے، ایتھنز کی جادوگرنی کا کردار، پاگل عورت کا کردار۔ میں نے کون سا کردار نہیں کیا۔ ہر کردار میں خود کو ڈھالا، یہاں تک کہ تین برس پہلے جب میں نے ایک اطالوی شہزادی کا کردار کیا تو ناٹک دیکھنے والوں میں کھڑے ہو کر تالیاں بجانے والا جان کارلس بھی تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا، میں تو خیر اسے برسوں سے پہچانتی تھی۔ وہ کھیل کے بعد مجھ سے ملا، مگر میں نے

اس سے رکھائی برتی، وہ مایوس سا چلا گیا۔ جانے وہ کس رشتے کے تحت آیا تھا؟ پھر وہ اکثر چلا آتا، میں اس کے ساتھ بے رخی برتتی، مگر وہ برا نہ مانتا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ دے رکھا تھا، مگر میں کبھی اس سے ملنے نہیں گئی۔ مجھے جان کارلس سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔''

وہ یاد کر کے بول رہی تھی، بہت سی الجھی یادوں کے سرے ایک دوسرے میں پھنسے تھے، وہ جیسے ٹھہر ٹھہر کر انہیں سلجھا رہی تھی۔

''میں جب کردار کرتے کرتے تھک گئی تو سوچتی تھی کہ کبھی تو ایک دن ایسا آئے گا، جب میں کوئی ایسا کردار کروں گی، جو صدیوں تک امر ہو جائے گا اور وہ کردار اسٹیج پر نہیں عام انسانوں کے بیچ پرفارم ہوگا۔ اس کے داد دینے والے، اس کو سراہنے والے، اس کے لیے تالیاں بجانے والے اردگرد کے لوگ ہوں گے۔ میں برسوں اس کردار کی تلاش میں رہی اور پھر ایک شام کارلس نے مجھے وہ کردار دکھا ہی دیا۔ تب میری سمجھ میں آیا، وہ کیوں میرے پاس پلٹ پلٹ کر آتا تھا۔

''اسے تلاش تھی، ایک ایسی چیز کی، جس کے بارے میں جاننے والی ہندوستانی نسلیں کب کی مرکھپ گئی تھیں مگر وہ برسوں ہندوستان میں رہا تھا، اسے یہاں کے بہت سے غیر سرکاری رازوں کا پتہ تھا۔ جانے کہاں سے اس کے ہاتھ ایک خط کا آدھا ٹکڑا لگا تھا، جس میں ''ماہ ملکہ'' کا ذکر تھا، وہ جو چاند سے زیادہ خوب صورت ہے اس کا ذکر تھا، مگر وہ خط کس نے کس کو لکھا تھا، وہ جانتا نہ تھا اور سراغ رسانی اس کی طبیعت میں نہ تھی۔

اس خط میں مہاراجہ بلدیو سنگھ کا ذکر تھا، جس نے ''ماہ ملکہ'' کو گاؤں کے پرانے قبرستان میں ایک لکڑی کی چھوٹی سی ناند میں کوئلوں کے بیچ رکھ کر دفن کر دیا تھا۔ مہاراجہ بلدیو سنگھ کون تھا؟ نہ وہ جانتا تھا، نہ میں اور میں تو تب یہ بھی نہ جانتی تھی کہ یہ ''ماہ ملکہ'' کیا ہے؟ میں نے تو جھٹ کارلس کو انکار کر دیا تھا کہ میں ہندوستان جا کر ان فضول قصے کہانیوں کے پیچھے خوار نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہتا تھا میں اس کی مدد کروں، مگر میں نے توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گزر گئے اور جب میرے کیریئر پہ برا وقت آنے لگا۔ پیسے کی تنگی ہوئی اور کرداروں کی کمی تو میں نے کارلس کی مدد کرنے کی حامی بھر لی۔ اس شرط پہ کہ ''ماہ ملکہ'' میں آدھا حصہ میرا ہوگا۔

دو برس میں نے برٹش لائبریری اور بعد میں ہندوستان آ کر یہاں کی لائبریریوں اور کاغذات کو کھنگالنے میں گزارے۔ شاید دو برس سے بھی زیادہ گزر گئے۔ میں کھوجتی رہی، سر کھپاتی

رہی اور پھر مجھے علم ہوا کہ مہاراجہ بلدیو سنگھ کو مرے عرصہ بیت چکا ہے، وہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس کا تعلق بیلی راجپوتاں نامی گاؤں سے تھا، جو اب ایک مختلف سرکاری نام سے موجود ہے۔ میں نے اور کارلس نے مہاراجہ بلدیو سنگھ کے جانشینوں کو کھوجنے میں عرصہ گزارا، یہاں تک کہ ہمیں شیکھر مل گیا۔

ٹھاکر شیکھر راج بھی بیلی کے دوسرے لوگوں کی طرح ''ماہ ملکہ'' کے وجود سے لاعلم تھا، وہ اسے ایک فرضی داستان گردانتا تھا۔''

''وہ فرضی داستان ہی مایا!'' بدر کہہ اٹھا۔'' ماہ ملکہ ایک myth ہے، ایک فرضی لیجنڈ، اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مہاراجہ بلدیو سنگھ کی پگڑی میں جو ہیرا جڑا تھا، وہ ایک عام سا ہیرا تھا، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بعد میں لوگوں نے اسے ''ماہ ملکہ'' کا نام دے کر اس سے کہانیاں منسوب کر ڈالیں۔''

وہ کرب سے مسکرائی۔ ''کاش کہ ایسا ہوتا۔''

پھر اندر کمرے میں چلی آئی۔ دیوار پہ وہ قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ وہ بوڑھا مہاراجہ بہت تمکنت سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پگڑی میں بڑا سا ہیرا جڑا تھا، جس سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں، نیچے کونے میں لکھا تھا۔

''شبیہ حقیقی، مہاراجہ بلدیو سنگھ۔''

''کاش! ایسا ہوتا، جیسے تم کہہ رہے ہو، ہندوستانی نیزہ باز! مگر ایسا نہیں ہے۔'' ماہ ملکہ'' کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ مہاراجہ بلدیو سنگھ کے پاس کیسے آیا، مگر شاید تم نے آندھرا پردیش کے غار سے نکلنے والے اس دوسرے ہیرے کے متعلق سنا ہو، جسے دنیا کوہ نور کے نام سے جانتی ہے، جو کبھی مغلوں کے پاس رہا تو کبھی رنجیت سنگھ کے پاس اور جب کمپنی بہادر نے ہندوستان پہ قبضہ کیا تو یہ ہیرا ملکہ عالیہ کے تاج کی زینت بنا۔ اسی غار سے نکلنے والا دوسرا ہیرا'' ماہ ملکہ'' مہاراجہ بلدیو سنگھ کی ملکیت میں آیا۔

میں نے تم سے کہا تھا نا، مجھے شیکھر میں وہ نظر آیا تھا، جس کی قیمت تم ایک بلند و بالا چار دیواری کو ہیروں جواہرات سے بھر کر بھی پوری نہیں کر سکتے۔ قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تنومند آدمی اپنے چاروں اطراف چار پتھر پھینکے اور ریاضی کی کسی تصویر کی طرح ان چار کونوں کو ملا

دے اور اس قطعے کو ہیرے جواہرات سے بھر دے، تب بھی وہ کوہ نور کی قیمت پوری نہیں کر سکتے اور آندھرا پردیش کے غار سے نکلنے والے پتھروں پہ وہ Curse ہے، جس کے باعث کارلس کو میری مدد لینی پڑی۔

جانتے ہو کوہ نور برطانیہ کے شاہی خاندان کی عورتوں کو ہی کیوں دیا جاتا ہے؟ کیونکہ مقدس کتابوں میں درج ہے، کوہ نور کو صرف عورت پہن سکتی ہے یا بھگوان۔ یہ مرد کے لئے مناسب نہیں ہوتا، یہ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اس کے ٹوئن ڈائمنڈ ''ماہ ملکہ'' نے مہاراجہ بلدیہ کو اتنا تباہ کیا کہ وہ جب دشمن کی یلغار سے گھبرا کر بھاگا تو اس منحوس ہیرے کو قبرستان میں دفن کر کے بھاگا۔''

''ہیرے محض پتھر ہوتے ہیں لیڈی شیکھر!'' وہ اجنبیت سے بولا۔ ''مہاراجہ پہ برا وقت اس کی حرکتوں اور غداروں کے باعث آیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور ہم پتھروں کی کرامات کو مانتے ہیں، نہ پتھر کے بتوں کی مگر ''ماہ ملکہ'' کی داستان وہ فرضی کہانی ہے، جو بیلی کے ہر بچے کو بچپن میں ہی سنا دی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے گاؤں پہ فخر کر سکے اور بڑے ہو کر اس کو علم ہوتا ہے کہ وہ ہیرا تو محض ایک عام سا ہیرا تھا، جو جانے کہاں کھو گیا، کسی کو علم نہیں۔''

''ایسا نہیں ہے بدر!'' وہ مضمحل لہجے میں بولی۔

''یہ مہاراجہ کا خوف تھا، جس نے اسے ایسی کہانیاں عام کرنے پہ مجبور کیا تھا، مگر جب بیلی کی ریاست اس کے قبضے سے نکل گئی اور وہ وہاں سے ہزاروں میل دور کسمپرسی کے عالم میں ایک کٹیا میں مرا تو اس کی بیوی نے اپنی موت سے قبل اپنے بیٹے کو خط لکھا جو بیلی میں غلام بنا لیا گیا تھا کہ وہ ''ماہ ملکہ'' کو قبرستان سے نکال لے۔ اس کے بیٹوں نے بعد میں بغاوت کی اور ریاست واپس ہتھیا لی، مگر وہ خط ان تک نہ پہنچ سکا۔ کئی سال بعد وہ خط جان کارلس کے ہاتھ لگا اور وہاں سے کارلس نے ایک منصوبہ بنایا۔ ''ماہ ملکہ'' کے حصول کا ایسا بے جھول منصوبہ، جس کے ذریعے ہم دونوں دنیا کے سب سے امیر کبیر لوگ بن سکتے تھے۔ آنسو اسی طرح بے آواز اس کے گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔

''شیکھر اور میں نے انگلستان میں شادی نہیں کی تھی، ہم انگلستان میں کبھی نہیں ملے تھے، ہماری ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ میں بطور ایک فرنگی شہزادی اس دعوت میں گئی تھی، جو کمپنی کے ایک افسر نے اپنے بنگلے پہ منعقد کر رکھی تھی اور بھلا مجھے بطور شہزادی متعارف کروانے والا وہ فرنگی

افسر اور کون ہوسکتا تھا، سوائے کارلس کے، اسے جب سے علم ہوا تھا کہ شیکھر کا تعلق مہاراجہ بلدیو سنگھ کے خاندان سے ہے، اس نے اس سے شناسائی پیدا کر لی تھی۔ شیکھر سے میرا تعارف بھی اسی نے کرایا تھا۔

شیکھر برا آدمی نہیں تھا، وہ بس قدرے عیاش تھا، مگر میں نے اسے کبھی جج نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے اس روز وہ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ میں میرین کارلس عرف مایا وتی سے اس کے لیے محض میرین فرینڈس عرف مایا فرینڈس بنا دی گئی تھی۔ فرینڈس اس برطانوی شہزادی کا آخری نام تھا، جو کچھ عرصہ قبل روپوش ہوگئی تھی، غالباً کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میں وہی شہزادی بن کر شیکھر سے ملی۔

میری اداکاری اور اس خول کے باعث جو میں نے خود پہ چڑھا رکھا تھا، وہ بہت جلد چاروں شانے چت ہوگیا۔ ہم دونوں نے کلکتہ جا کر شادی کی، اس نے دنیا والوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ ہماری شادی انگلستان میں ہوئی تھی۔ کارلس بطور ہمارے فیملی فرینڈ، شیکھر کے آس پاس ہی رہتا۔ ہمارا منصوبہ شیکھر کے ذریعے، مگر اسے آگاہ کیے بغیر "ماہ ملکہ" حاصل کر کے واپس انگلستان بھاگ جانا تھا۔ سو جب وہ مجھے بیلی لایا تو میں ہر رات اسے نیند کا شربت دے کر وہ سیاہ چغہ پہنکر قبرستان چلی جاتی تھی اور ایک ایک جگہ کو کھودتی۔ وہ سیاہ چغہ میں خود کو اندھیرے میں گم کرنے کو پہنتی تھی، مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ بیلی کے توہم پرست لوگ مجھے بھوت سمجھنے لگے ہیں۔ سو جب بھی کوئی قبرستان کے قریب سے گزرتا تو میں عجیب وغریب آوازیں نکالتی، نتیجتاً لوگوں نے قبرستان کے نزدیک آنا بھی چھوڑ دیا اور اس کی کھدائی کے لیے مجھے یہی چیز درکار تھی۔ لوگ ڈرنے لگے، طرح طرح کی باتیں بنانے لگے، یہاں تک کہ شیکھر کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی۔

یہ اس کی موت سے چند دن پہلے کی بات ہے، وہ اس روز گھر آیا تو بہت چپ چپ تھا۔ میں نے پوچھا، مگر اس نے جواب نہ دیا۔ میں اس وقت تو نہ جان سکی، مگر مجھے بعد میں علم ہوا کہ اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ یہ جو شہزادی اس کی بیوی ہے، وہ جان کارلس کی بیٹی اور لندن کے تھیٹروں میں کام کرنے والی ایک اداکارہ ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، اس نے کارلس کو خط لکھا کہ وہ اس سے ملے۔ جس دن ملاقات طے ہوئی، اس نے مجھے ایک سرکاری کام سے امرتسر بھیج دیا۔ میں چلی گئی اور پیچھے وہ اور کارلس شام میں ملے۔ یہ اس کی موت سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ روپا

نے اسے اس روز کچے راستے پہ دیکھا تھا۔ وہ کچے راستے سے ہو کر جنگل تک گیا تھا، اس نے کارلس کو کہا کہ وہ مجھے طلاق دے رہا ہے اور یہ کہ میں اسے سب کچھ بتا چکی ہوں۔"

"ماہ ملکہ کے بارے میں بھی؟" کارلس پوچھ بیٹھا اور شیکھر جیسے ذہین آدمی نے ساری کڑیاں ملا لیں۔ یقیناً ماہ ملکہ پرانے قبرستان میں دفن تھا، تب ہی تو وہ چغہ پوش اُدھر پھرتا تھا، اس نے گھر جا کر میرا سامان تلاشا تو چغہ اسے مل گیا۔ اگلی صبح وہ کارلس سے قبرستان میں ملا اور اسے اس کا سارا منصوبہ کھول کر بتا دیا۔ کارلس چکرا کر رہ گیا۔"

وہ جیسے تھک کر خاموش ہوگئی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

"شیکھر کو لالچ نے گھیر لیا۔ اس نے کارلس سے "ماہ ملکہ" میں اپنا حصہ مانگا، دونوں کا جھگڑا ہوا اور شیکھر جب بکتا جھکتا واپس گھر آیا تو کارلس نے بہت مہارت سے اسے قتل کر دیا۔

دو چیزیں ہمارے منصوبے کا حصہ نہیں تھیں، ایک شیکھر کا قتل اور ایک...... بدر غازان۔"

وہ آنکھیں بند کیے آہستہ آہستہ بولتی جا رہی تھی۔ رات ڈھل چکی تھی، آسمان تاروں سے چمکنے لگا تھا۔

"دو روز قبل ہی کارلس نے اپنا تبادلہ منصوبے کے مطابق اس علاقے میں کرایا تھا۔ شیکھر کا قتل ہوا اور مجھے علم تک نہ ہو سکا۔ میں جب تک واپس آئی، اس کی چتا جلائی جا چکی تھی۔ مجھے راجپوتوں پہ شک تھا، مگر ان کے خلاف گاؤں میں خبریں میں نے اس شک کے باعث نہیں پھیلائی تھیں۔ وہ تو ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔ مجھے اپنے حوالے سے ٹھاکروں کو اتنا بدنام کرنا تھا کہ وہ مجھے روک ہی نہ سکیں، آخر ایک روز تو مجھے "ماہ ملکہ" لے کر واپس انگلستان بھاگ جانا تھا۔ سو ایک طرف تو میں نے ٹھاکروں کو بدنام کیا اور دوسری طرف خود سے ہر ممکن شک ہٹانے کے لیے خود ہی اس بھوت کا سراغ لگانے کی ٹھانی۔ نوکروں کے سامنے، تمہارے سامنے، ہر کسی کے سامنے خود کو اس بھوت کی سب سے بڑی دشمن ثابت کیا، مگر پھر، منگل سنگھ کا قتل ہو گیا۔

وہ مجھے دیکھ چکا تھا اور میں مطمئن تھی کہ وہ جلدی ہی مر جائے گا، مگر اگلی صبح روپا نے یہ بتا کر میرے ہوش اڑا دیئے کہ وہ بھوت کا ذکر تم سے کر چکا ہے۔ میرے دل میں چور تھا، سو میں نے روپا پہ ظاہر کیا کہ مجھے تم پر شک ہے اور وہ یقین کر بیٹھی۔ مجھے معلوم تھا، اگر کوئی اور بھوت کا سراغ لگانے نکلا تو یہ خبر اس کے کانوں تک ضرور پہنچے گی کہ بدر غازان ہی وہ بھوت ہے۔ روپا کے پیٹ میں

بات کہاں رہنی تھی، لیکن یہ بے چینی کہ منگل سنگھ نے تمہیں کیا بتایا ہے، مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی۔ تمہارا رویہ مبہم تھا، میں اندازہ نہ کر سکی کہ تم کیا جانتے ہو، مگر اس روز میں نے تمہارا اعتماد لینے کے لیے تمہیں گوپال والا قصہ بتایا۔ اس کے اپنے کمرے میں آنے سے مجھے یہی ڈر تھا کہ وہ میرا چغہ نہ دیکھ لے، جو اس وقت پلنگ کی پائنتی کے ساتھ پڑا تھا، تب مجھے شیکھر بہت یاد آیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک ایسی ڈھال تھا، جس کی اوٹ میں، میں اپنا کام بآسانی کر سکتی تھی۔

میں نے تم سے کالی چادر والے شخص کے متعلق جھوٹ بولا تا کہ تم مجھے کچھ تو بتاؤ اور جب تم نے شیکھر کا نام لیا تو ایک لمحے کو تو میں چکرا کر رہ گئی۔ مجھے لگا وہ واقعی زندہ ہے، میں کچھ دن تو متذبذب رہی کہ معاملہ کیا ہے اور خوش گمان بھی کہ چلو وہ زندہ ہے۔ ٹھاکروں کو بھی خوب خوب جتایا، مگر جب عقل سے کام لیا اور سوچا کہ آخر منگل سنگھ نے اس کا نام کیوں لیا ہوگا تو خیال آیا کہ وہ یقیناً شیکھر کی میم صاحب کہنا چاہ رہا ہوگا۔ تب میں پھر سے تذبذب میں پڑ گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر تم ذرا سا بھی دماغ استعمال کرو گے تو جان جاؤ گے، سو مجھے تمہاری توجہ کسی اور طرف مبذول کرانی تھی۔

اتفاق ہے اسی روز مجھے تمہارے اور شیکھر کے ایک تنازع کا علم ہوا۔ پہلے تو میں حیران ہوئی کہ مجھے یہ پہلے پتا کیوں نہیں چلا اور مجھے کھیلنے کو ایک اور پتا مل گیا۔ میں اس چیز کو بنیاد بنا کر تم پہ مقدمہ کرنے ہی والی تھی کہ میں نے جوگی شیکھر کا نام سنا۔ میرا کام اور آسان ہو گیا، نہ صرف میں تمہیں یہ سوچنے پہ مجبور کر سکتی تھی کہ وہ شیکھر ہی جوگی ہے، بلکہ تمہیں کچھ عرصے کے لیے کہیں اور مصروف بھی کر سکتی تھی۔ نادر شاہ کو تھانے میں دیکھ اور پہچان کر مجھے اندازہ ہوا کہ بلی کے ڈاکوؤں کو کوئی کیوں نہیں پکڑتا۔ تب مجھے پہلی دفعہ شیکھر کی موت کا معمہ حل ہوتا نظر آیا۔ مجھے شک گزرا کہ تم ہی لوگوں نے اسے مارا ہے۔ سو میں نے پرچہ کٹوا دیا، مگر جب میں نے کھوجی کو تمہارا کھرا دکھایا اور اس نے تصدیق کی کہ یہ وہ کھرا نہیں تھا۔ جو شیکھر کے ساتھ قبرستان سے ملا تھا۔ تو مجھے تم بے قصور لگے۔

میں "ماہ ملکہ" ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ شیکھر کے قاتل کو بھی ڈھونڈ رہی تھی اور مجھے کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے پورا قبرستان کھود ڈالا، مگر مجھے وہ نہ ملا۔ تب مجھے اپنی اڑھائی برس کی ریاضت رائیگاں جاتی دکھائی دی۔

دوسری جانب تم ہاتھ دھو کر بھوت کے پیچھے پڑے تھے۔ میں نے ایک اور پتا کھیلا۔ تمہارے نام قبرستان میں رات ٹھہرنے کا رقعہ لکھ کر روپا کو دے دیا، مجھے علم تھا وہ گوپال کو دکھائے گی اور گوپال اپنی فطرت کے باعث میرا پیچھا کرتا قبرستان تک آئے گا اور تمہیں یقین ہو جائے گا کہ بھوت گوپال ہی ہے اور ایسا ہوا بھی، مگر گوپال کی بزدلی نے سارا معاملہ خراب کر ڈالا۔

دوسری جانب کارلس میرے اور تمہارے تعلق سے بے زار تھا۔ وہ سمجھتا تھا میں کام پہ توجہ نہیں دے رہی اور تمہارے ساتھ عشق بگھار رہی ہوں۔ ہم اکثر جنگل میں ملتے تھے، وہ مجھے بار بار دھمکی دیتا کہ اگر بیلی راجپوتاں کی ملکہ (یعنی ماہ ملکہ) اسے نہ ملی تو وہ مجھے بھی پرانے قبرستان میں دفن کر دے گا اور یقین کرو بدر! وہ ایسا ہی کرے گا۔

میں اپنے تئیں پوری کوشش کر رہی تھی، مگر اس روز تو جیسے میرا تاش کے پتوں کا گھر زمین پہ آن گرا، جب کھوجی نے مجھے وہ کھرا دکھا دیا جو شیکھر کے ساتھ ملا تھا اور جب میں نے اس کھرے کے آگے چلتے کارلس کو دیکھا تو زمین، آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ کیا میرے ساتھ بھی کوئی گیم ہو رہا تھا؟ میں یہی سوچتی رہی اور اس رات جب وہ خبیث بڈھا قبرستان آیا تو مجھے یقین آ گیا کہ وہ میرے ساتھ ڈبل کراس کر رہا ہے۔ قبرستان کا معاملہ مجھے سنبھالنا تھا، مگر وہ خود بھی چپکے چپکے "ماہ ملکہ" ڈھونڈنے آ جاتا تھا۔

میں جانتی تھی اگر اسے بیلی کی ملکہ ملی تو وہ اسے لے کر خود ہی واپس بھاگ جائے گا۔ مجھے چھوڑ کر اور اگر ہیرا مجھے پہلے ملا تو وہ شاید مجھے مار کر اسے لے کر چلا جائے۔ اس شخص کا لالچ کبھی ختم نہیں ہو سکتا، میں جانتی ہوں۔"

"صرف اس کا کیوں مایا؟" وہ سرد مہری سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تمہارا لالچ بھی تو اس میں شامل تھا، شیکھر کا قتل تم لوگوں نے اسی لیے تو کیا تھا۔"

"بدر!" اسے جیسے دھکا لگا تھا۔ "ایسے مت کہو۔ میں کبھی نہیں چاہتی تھی کہ شیکھر قتل ہو، وہ تو بہت......"

"اگر ایسا ہے تو تم کارلس کے خلاف رپٹ کیوں نہیں کراتیں؟" وہ تیزی سے بولا۔

"میں نے اسے یہ دھمکی دی تھی، جب اس نے جنگل میں مجھے یہ سب بتایا تھا، مگر تم جانتے ہو، میں نے تمہارے لیے......" مگر اس کی ہر دلیل ضائع جا رہی تھی، وہ کچھ بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔

''تم نے میرے لیے کچھ نہیں کیا مایا!'' وہ ایک دم زور سے چلایا۔ ''تم نے سب کچھ اپنے لیے کیا۔ میری ماں ٹھیک کہتی تھی۔ تم فرنگی ہوتے ہی چور، غاصب اور لٹیرے ہو۔''

''نہیں بدر!'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آئی اور بے قراری سے اس کے بازو کو پکڑ کر اس کا رخ اپنے سامنے کیا۔ ''ایسے تو مجھے جج مت کرو۔ تم مجھے یوں کس طرح جج کر سکتے ہو؟ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے، میں نے تو کچھ نہیں چھپایا۔''

''تم نے یہ سب تب بتایا ہے، جب میں خود ہی جان گیا تھا کہ تم وہ بھوت ہو۔'' وہ زہرخند ہوا۔

''مگر اس سے زیادہ تو تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ میں نے تمہیں ''ماہ ملکہ'' کے بارے میں خود بتایا ہے، نہ بھی بتاتی تو تم کیا کر لیتے۔ مجھے تو ''ماہ ملکہ'' مل گیا ہے۔ کل رات تمہارے کتے نے ہی مجھے وہ ڈھونڈ کر دیا ہے۔ وہ قبرستان کے باہر دفن تھا، بلکہ دفن تو قبرستان کے احاطے میں ہی تھا، مگر یہ چار دیواری تو چند برس پہلے ادھر بنی ہے، ایسے کہ وہ مدفن ناند پھاٹک کے قریب ہی باہر کی طرف تھا۔ شیرو اس جگہ کو کھودنا چاہ رہا تھا، میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی، مگر جب اس نے مجھ پر حملہ کیا تو مجھے اسے مارنا ہی پڑا، پھر وہ جگہ کھودی اور ناند نکال کر......''

''مجھے تمہاری کہانیاں نہیں سننی۔'' وہ تلخ ہوا۔ ''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تم ایک چور ہو، فرنگی چور۔''

''تو کیا تم نہیں ہو؟ ہاں؟ تم ڈاکو نہیں ہو؟'' وہ تلملا کر بولی۔

''میں اگر راہزنی کی واردات کرتا ہوں تو وہ صرف......''

''کس مقدس کتاب میں لکھا ہے بدر غازان کہ بغاوت میں ڈاکے ڈالنا جائز ہوتا ہے، ہاں؟ کدھر لکھا ہے؟ چوری تو بس چوری ہوتی ہے۔ میں چور ہوں تو تم کیا ہو؟ مگر میں نے تو تمہیں کبھی اس طرح جج نہیں کیا۔''

''تمہاری ہر دلیل بے کار ہے مایا! میں بس چاہتا ہوں کہ تم اپنا یہ ناپاک وجود لے کر یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔'' وہ کہہ کر جانے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے حائل ہوئی۔

''نہیں بدر!'' مایا نے اسے کہنی سے پکڑ کر روکا۔ ''تم یوں مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے، میں تم سے محبت کرتی ہوں، بہت زیادہ اور تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو نا، میں ''ماہ ملکہ'' کارلس کو دے

دوں گی، میں اسے نہیں رکھوں گی، کیا تب ہم دونوں ایک ہو سکتے ہیں۔''

''تم میرا اعتبار کھو چکی ہو، مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے، میرا راستہ چھوڑ دو۔''

''تم ایسے نہیں جا سکتے۔ تم...... تم مجھ سے محبت کرتے تھے، تم تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔'' بدر نے دیکھا، وہ رو رہی تھی، آنسوؤں سے، ہچکیوں سے، مگر اس کا دل نہیں پگھلا۔ وہ اسے ہٹا کر جانے لگا۔

''نہیں بدر!'' اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''دیکھو میری بات سنو، میں مانتی ہوں میں نے لالچ میں یہ سب کیا، مگر میں یہ بھی اعتراف کرتی ہوں کہ یہ غلط تھا۔ میں اپنے عمل کو اگر Justify نہیں کر رہی تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مجھے جج کرو۔ میں...... میں اب...... اب میرے لیے وہ ہیرا کوئی حیثیت...... نہیں بدر! پلیز، دیکھو...... اس طرح مجھے مت چھوڑو۔''

اور اس طرح بھیگا چہرہ لیے اس کی منت کرتی وہ فرنگی لڑکی اسے کہیں سے بھی تو بیلی کی وہ ملکہ نہیں لگ رہی تھی، جسے وہ جانتا تھا۔ لیکن وہ بیلی کی ملکہ تھی ہی کب؟ وہ اسے جب بھی بیلی کی ملکہ کہتا تھا تو اس کے ذہن میں ہمیشہ ''ماہ ملکہ'' کی اس کہانی کا تصور آتا تھا جو گاؤں کے بڑے بوڑھے سنایا کرتے تھے۔ بیلی کی اصل ملکہ تو وہ پتھر تھا۔

''تم نے میرے ساتھ فریب کیا ہے مایا! تم نے مجھے دھوکے میں رکھا ہے۔''

''کیا دھوکا کیا ہے میں نے؟ ماہ ملکہ تمہاری ملکیت تو نہیں تھا، تمہارے بزرگوں کی میراث تو نہ تھا، وہ شیکھر کی میراث تھا اور شیکھر اپنی جائیداد میرے نام کر کے مرا ہے۔ گوپال بھی مر چکا ہے، بدر! میں اس ہیرے کی قانونی وارث ہوں۔ تمہارے ساتھ تو کوئی دھوکا نہیں ہوا۔''

وہ جواب دیئے بنا آگے بڑھ گیا، مایا نے تڑپ کر اسے روکنا چاہا، مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر، اسے پرے دھکیلتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

''بدر...... بدر!'' وہ اسے پکارتی دیوار سے لگی نیچے بیٹھتی چلی گئی، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ سننے کی حد سے باہر جا چکا تھا۔ اسے لگا اب وہ کچھ بھی نہیں سننا چاہے گا۔

وہ اسی طرح زمین پہ بیٹھی روتی رہی۔

* * *

''خیر تو ہے پتر!'' چاچی اس کے پاس آئی، جو برآمدے میں چارپائی پہ نیم دراز تھا، سر گاؤ تکیے پہ رکھے وہ بے تاثر نگاہوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

''بدر! میں نے کہا خیر تو ہے، بکاول کہہ رہا تھا صبح سے تین دفعہ میم صاب تیرا پوچھنے آئی ہے، پر تو نے کہلوا دیا ہے کہ تو گھر پہ نہیں ہے۔'' وہ پریشان سی چارپائی کی پائینتی پہ بیٹھ گئی۔

''میں کسی میم صاب کو نہیں جانتا۔'' وہ اسی طرح چھت کو گھور رہا تھا۔

''پر ہوا کیا ہے؟''

''کیا ہونا ہے؟''

''تو اس کو کیوں نہیں مل رہا؟''

وہ جھلا کر اٹھ بیٹھا۔ ''جب ملتا تھا، تب بھی تجھے یہی اعتراض تھا، اب چھوڑ دیا ہے، تب بھی تو پریشان ہے، میں کدھر جاؤں اماں؟''

''ہائے نہیں میرا پتر......!'' چاچی بوکھلا گئی۔ ''ماں صدقے واری تو نے اسے چھوڑ دیا، چنگا کیا پتر، تجھے اسے چھوڑ دینا چاہیے تھا...... اب تو جب کہے گا میں تیری شادی کر دوں گی، دیر سویر کی کوئی چنتا نہیں پتر! جب تیری مرضی ہوگی۔''

''پھر اسی جمعہ کو کر دے اماں۔'' وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

چاچی ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر گیا ہے، پھر ذرا حواس واپس آئے تو وہ خوشی اور فکر مندی کی ملی جلی کیفیت میں نوکروں کو آوازیں دینے لگی۔

''رکھی، جنتے، ارے سنتے ہو کوئی؟''

''کیا ہوا چاچی؟'' زہرہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی، اس نے آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور ہاتھوں پہ گیلا آٹا لگا تھا۔

''جا، جا کر صندل سے ہاتھ منہ دھو اور آرام کر، یہ کام جنتے کو دے دے، اب تیرے یہ کام کرنے کے دن نہیں ہیں۔'' خوشی اور جوش چاچی کے چہرے سے پھوٹ رہا تھا۔

''پر ہوا کیا ہے چاچی؟'' وہ قدرے پریشان سی ہو گئی۔

''بدر شادی کے لیے مان گیا ہے، اس جمعہ کو کہتا ہے کہ بیاہ کر دو۔ چلو اچھا ہے، مگر پنڈی سے رشتے داروں کو نہ بلا پائیں گے، مگر خیر ہے ولیمہ بعد میں دے دیں گے، اب مانا ہے تو ہم بھی اس

کی مانیں۔''

''اور ..... اور میم صاب؟'' اس نے خود سے منصوبے بناتی چاچی کو قدرے ہراساں آواز میں چونکایا۔

''ارے وہ چھوڑ آیا ہے اسے، کہتا ہے میں اسے نہیں جانتا، اچھا ہی ہوا تو جا کر آرام کر۔ جنتے! اری او جنتے!'' وہ جنتے کو بلاتی رسوئی کی طرف بڑھ گئی اور زہرہ اسی طرح آٹے میں لتھڑے ہاتھ لیے متذبذب سی برآمدے میں تنہا کھڑی رہ گئی۔

* * *

وہ مضطرب سی دالان میں اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ بار بار بند پھاٹک کو دیکھتی، پھر کلائی پہ بندھی گھڑی کو، سنہری بال ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ رکھے تھے اور سفید ساڑھی کا پلو گھاس کو چھو رہا تھا۔

اسی پل پھاٹک کھلا، چرچراہٹ کی آواز پہ وہ فوراً رک کر اِدھر دیکھنے لگی۔

روپ وتی ساڑھی کے پلو سے سر ڈھکے، تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ مایا کی نگاہیں بے اختیار اس کے ہاتھوں پر ٹک گئیں، جن میں وہی رقعہ دبا تھا جو اس نے اسے دے کر بھیجا تھا۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''وہ حویلی میں نہیں ہیں میم صاب! ملازم یہی بتاتے ہیں، پیغام بھی نہیں لیتے۔'' روپا نے قدرے شرمندگی اور تاسف سے بند رقعہ اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے آہستہ سے اسے تھاما۔

''ملازم کہہ رہا تھا کہ ملک صاب یہ پیغام دے کر گئے ہیں کہ.....''

وہ ہچکچا کر رکی تو مایا چونکی۔

''کیسا پیغام.....؟''

''یہی کہ.....'' وہ پھر متذبذب سی رکی۔

''کیا.....؟''

''یہ کہ مایا دیوی سے کہو، اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ نیلی راجپوتاں سے چلی جائے۔ اس سے پہلے کہ اسے انگریز سرکار کو خط لکھنا پڑے، آخر انگریز سرکار ملکہ عالیہ کے تاج کو مزید سجانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''اچھا۔'' ایک مغموم مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بدر کی بات ایک طرح کی دھمکی تھی کہ اگر وہ نہ گئی تو وہ ہیرے کے متعلق سرکار کو بتا دے گا اور سرکار اسے گرفتار کر کے ہیرا ملکہ کے تاج میں سجا دے گی۔

''یہ چھوٹا ملک ایسا کیوں کر رہا ہے؟'' روپا خود کو روک نہ سکی۔

مایا نے شانے اچکا دیے۔

''اسے انسانوں کی اچھائیوں، برائیوں کو تول کر بھاری پلڑے کے مطابق فیصلہ کرنے کی عادت ہے روپا! اور یوں انسانوں کو جج کرتے وقت وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ابھی وہ دن بہت دور ہے، جب انسان جج کیے جائیں گے۔ خیر جانے دو۔'' وہ سر جھٹک کر افسردہ سی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''چھوٹے ملک کی شادی ہو رہی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ بے یقین سے پلٹی۔

''جی میم صاب!'' روپا قریب آئی۔ ''زہرہ مایوں بیٹھ گئی ہے، جمعہ کو نکاح ہے اور پچھلی رات مہندی۔ پوری حویلی سجائی جا رہی ہے، قمقمے، فرشی، فانوس، چھت گیر قندیلیں، بتیاں، دیے اور ایسی ایسی رنگ برنگی کلیاں شہر سے منگوائی ہیں چھوٹے ملک نے......خوب چراغاں ہوگا۔ صرف حویلی نہیں، پورا علاقہ سجا رہے ہیں وہ۔''

روپا کہہ رہی تھی اور اس کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ وہ اسے ایسی سزا دے گا، اسے کب اندازہ تھا۔

ڈلہوزی کی وہ ڈھلتی شام اس کی انگلیوں سے جانے کب ریت کی طرح پھسل گئی تھی، اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔

* * *

وہ اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

پیلا انگرکھا، نیچے پائجامہ اور سر پہ یہ بڑا سا گوٹہ کناری سے بھرا پیلا دوپٹہ، سیاہ لمبے بالوں کا پراندہ دائیں شانے پہ پڑا تھا، اس میں موتیا کے پھول اٹکائے گئے تھے۔ کلائیوں میں بھر بھر کر کانچ کی زرد چوڑیاں تھیں اور ماتھے پہ موتیے کے پھول کا ننھا سا ٹیکا۔

ایک آسودہ مسکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔

کیا کوئی اتنا بھی خوب صورت لگ سکتا تھا؟ جتنی آج وہ لگ رہی تھی۔، تین دن سے وہ مایوں بیٹھی تھی۔ کسی کی نظر تک اس پہ نہ پڑی تھی۔ بدر نے بھی نہ دیکھا تھا گو کہ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ایک نظر تو اسے دیکھ لے بس وہ ایک نظر ڈالے اور پھر وہ اس کا مبہوت ہونا دیکھ سکے۔ اے کاش کہ ایسا ہو سکتا۔

وہ یہ سوچ کر غمگین ہو گئی، مگر یہ کوئی بڑا مسئلہ تھوڑی تھا؟ بس دو دن بعد وہ اس کا ہو جانا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، پھر کوئی میم صاب ان دونوں کے درمیان نہ آنی تھی۔ ویسے یہ میم صاب گئی کہاں؟ وہ ابھی تک اس بات پہ حیران تھی۔ کہاں وہ اس کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا اور کہاں وہ اب اس سے ملتا تک نہ تھا۔ اس نے سنا تھا، وہ روز کتنے ہی چکر حویلی کے لگاتی، مگر بدر اس سے نہ ملتا۔ پھر جب سے ان دونوں کی شادی کا شور اٹھا، ڈھولک بجنے لگی، اس دن کے بعد میم صاب حویلی نہیں آئی۔ اچھا ہی ہوا، جو بھی ہوا۔

وہ خوش تھی، مطمئن تھی، بے فکر تھی۔ اس کی کل کائنات بدر ہی تو تھا، وہ اسے مل رہا تھا، اسے اور کیا چاہئے تھا بھلا۔

وہ مگن سی چاندی کی منقش پرات میں پاؤں ڈالے بیٹھی تھی جو عرق گلاب سے بھری تھی اور سطح پہ گلاب کی پتیاں بکھری تھیں، اتنی کہ ٹخنے سے نیچے اس کے پاؤں پتیوں سے ڈھک گئے تھے۔ وہ ہولے ہولے گلاب کے پانی میں انگلی سے لکیر کھینچتی تو زرد چوڑیاں کھنک اٹھتیں۔ ان کی کھنک کے دوران ہی اسے دروازے پہ ہونے والی دستک سنائی دی تھی۔

وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ رات کے اس پہر اس کے دروازے پر کون آ سکتا تھا؟ چاچی؟ مگر وہ تو عشاء کے فوراً بعد سو جایا کرتی تھی تو کیا بدر......؟

اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ دعائیں ایسے بھی قبول ہو جاتی ہیں، اسے اندازہ نہ تھا۔

وہ آنچل سر پہ درست کرتی، گیلے پاؤں پرات سے نکال کر، بھاگتی ہوئی گئی اور دروازہ کھولا۔

وہاں کوئی نہ تھا۔

زہرہ نے سر نکال کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

راہداری سنسان پڑی تھی، سامنے برآمدہ تھا، اس کے آگے دالان، وہ بھی خالی پڑا تھا، پھر دروازہ کس نے کھٹکھٹایا؟

وہ چوکھٹ پہ کھڑی پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہی تھی، جب اسے برآمدے میں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کوئی کھڑا نظر آیا۔ سیاہ بڑا سا لبادہ، جس میں چہرہ تک واضح نہ تھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی، اسی پل اس نے دیکھا، وہ جو کوئی بھی تھا، اسے اشارے سے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

وہ گھبرا کر واپس اندر ہونے لگی۔ چاچی نے اسی لیے تو حاجراں سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ رہے، ورنہ مایوں بیٹھی دلہن کو جن بھوت ستانے لگتے ہیں۔ مگر حاجراں کی ماں بیمار تھی، سو وہ شام کو ہی چلی گئی تھی۔

''شش......اِدھر آؤ......'' سیاہ لبادے میں سے آواز آئی، ساتھ ہی اس نے چہرے پر سے سیاہ ٹوپی اوپر اٹھا کر سر کے پیچھے پھینک دی اور وہ جو خوف زدہ سی ہو کر دروازہ بند کرنے لگی تھی، ساکت رہ گئی۔

''میم صاب......آپ؟''

وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آئی، زہرہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔ اس نے لمبا سا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا اور سنہری بال کچھ چغے کے اندر اور کچھ باہر تھے۔ چہرہ ہر طرح کے سنگھار سے بے نیاز، اسے قدرے کمزور اور زردی مائل سا لگا تھا۔ وہ تمکنت، وہ سحر، سب غائب تھا۔ یہ تو کوئی عام سی لڑکی تھی۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ زہرہ کا چہرہ اور پیلا جوڑا دیکھ کر مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
''تم اتنی حسین ہو کہ کوئی تمہارے لیے قتل ہو بھی سکتا ہے اور کر بھی سکتا ہے۔ ایسے ہی تو کل نادر شاہ نے پھانسی کی سزا نہیں سنی۔''

''اسے پھانسی ہو گئی؟''

''ابھی نہیں ہوئی، مگر جرم تو ثابت ہو ہی چکا ہے، سزا بھی جلد ہی مل جائے گی۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''شادی کب ہے تمہاری؟''

''دو روز بعد جمعہ کو، آپ آؤ گی میم صاب؟'' وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی، اسے اب وہ

اپنے لیے ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں لگ رہی تھی۔

''نہیں، میں کل کلکتہ جا رہی ہوں، وہاں سے انگلستان چلی جاؤں گی۔ تم سناؤ، تم خوش ہو؟''

زہرہ کو لگا اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی ہے۔

''جی......'' وہ بہ دقت مسکرائی۔

''اور بدر، وہ خوش ہے؟''

اس نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا، حالانکہ وہ تو تین روز گزرے اس سے ملی بھی نہ تھی۔

''اچھا۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ ''بدر سے اب کب ملوگی۔''

''معلوم نہیں......'' وہ جھجکی۔

''ہوں۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

''آپ اس طرح رات کو کیوں آئی ہیں؟'' زہرہ دل میں مچلتا سوال زبان پہ لے آئی۔

''دن میں تمہارے ملازم کہاں آنے دیتے ہیں زہرہ بتول؟'' وہ غمزدہ سا مسکرائی۔ زہرہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم میرا ایک کام کروگی؟''

''جی...... بتائیے۔''

''بدر کو میرا ایک پیغام دے دوگی؟''

زہرہ کے دل کو کچھ ہوا، اب جب وہ اس کا ہونے جا رہا تھا، اب بھی وہ...... مگر وہ انکار نہ کر سکی۔

''بتائیے۔''

''تم فکر نہ کرو، میں اسے تم سے چھین نہیں رہی۔ وہ تمہارا ہی ہے، تمہارا ہی رہے گا۔ بس اس سے کہنا، مایا اس کی شادی سے اگلی رات ادھر اس جہاز پہ اپنے باپ سے ملے گی۔'' اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی، جس پہ انگریزی میں دو تین الفاظ لکھے تھے۔

''اچھا۔'' زہرہ نے نا سمجھی کے عالم میں چٹ پکڑی۔ ''اور اس سے کہنا، انسانوں کو جج نہیں کیا کرتے، ان سے محبت کیا کرتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو جج کرنے لگ جاؤ گے تو ان سے محبت نہیں کر سکو گے۔ بس اس کو کہنا، وہ کبھی تمہارے ساتھ وہ نہ کرے، جو میرے ساتھ کیا ہے۔'' وہ زخمی سا

مسکرائی۔ ''جب کسی سے محبت کی جاتی ہے تو دل میں ایک قبرستان بھی بنایا جاتا ہے۔ اس میں اپنے محبوب کی تمام خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور پھر ان کے کتبے نہیں لگائے جاتے۔ بس اس کو یہی کہہ دینا۔''

زہرہ کچھ سمجھ پائی اور کچھ نہیں، مگر اُلجھی اُلجھی سی سر ہلا دیا۔

''اور کچھ......؟''

''ہاں......'' ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گرا۔ ''یہ اسے دے دینا، اس کی شادی کا تحفہ ہے۔''

اس نے ایک سرخ مخملیں پوٹلی زہرہ کے ہاتھ پہ رکھی، جس کا منہ سنہری ڈوری سے بند تھا۔

''دے دوں گی اور کچھ میم صاب؟''

''نہیں زہرہ!'' اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ''میرے پاس دینے کو اور کچھ نہیں ہے۔'' اس نے چغے کی ٹوپی سر پہ ڈال لی اور پلٹ کو بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔

زہرہ شش و پنج میں مبتلا کبھی برآمدے کے اس ستون کو دیکھتی اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی کو۔ وہ بہت ہلکی نہ تھی تو زیادہ بھاری بھی نہ تھی۔ جانے اندر کیا تھا۔

وہ واپس آئی اور سنگھار میز کے ایک خانے میں اسے رکھ کر تالا لگا دیا۔

اس کا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ جانے کیوں اسے میم صاحب بری نہیں لگ رہی تھی۔

* * *

''میں کچھ کروا دوں میم صاب؟''

اسے کپڑے صندوق میں رکھتے دیکھ کر روپا جھٹ آگے بڑھی۔

''نہیں روپا! میں نے اپنے لیے یہ سارا پھیلاوا خود ہی اکٹھا کیا تھا، اسے مجھے ہی سمیٹنا ہے۔'' وہ مغموم سا مسکرائی۔

سامنے پلنگ پہ جس کے پردے ایک طرف نفاست سے بندھے تھے، کپڑوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا، مایا سست روی سے ایک ایک کپڑا اٹھا کر تہہ کر کے صندوق میں رکھ رہی تھی۔

''یہ ساڑھی بہت خوب صورت ہے میم صاحب! آپ پہ بہت سندر لگتی ہے۔''

وہ سرخ ساڑھی اٹھا کر تہہ کرنے لگی تو روپا کہہ اٹھی۔ مایا نے ایک نظر ہاتھ میں پھسلتی ریشمی سرخ ساڑھی کو دیکھا اور دوسری نظر گردن موڑ کر دیوار پہ ٹنگی اپنی اور شیکھر کی شادی کی تصویر پہ ڈالی۔

''کاش شیکھر نہ مرتا۔'' وہ تو ایسا ہرگز نہ چاہتی تھی۔

''اس تصویر کو یہاں سے ہٹا دینا روپا اور سنو، یہ ساڑھی بھی تم رکھ لو۔''

''میں؟'' روپا حیران رہ گئی۔ دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں کیا؟ ابھی تو وہ سوچ رہی تھی کہ اجے سے کہہ کر امرتسر سے اپنے لیے بھی ایسی ہی ریشمی ساڑھی منگوائے گی؛ چاہے اس کے لیے اسے کانوں میں پڑی بالیاں ہی بیچ ڈالنی پڑیں۔

''ہاں تم اسے پہننا اور پہن کر مجھے یاد کرنا۔ چلو کوئی تو مجھے بھی یاد کرے۔'' اس نے کپڑے رکھ کر صندوق کا منہ بند کیا۔

''اسے تالا لگا دوں جی؟''

''رہنے دو، میرے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''راستے میں بیلی کا جنگل ہے، وہاں ڈاکو روک لیتے ہیں مایا دیوی!''

اور وہ روپا کو دیکھ کر رہ گئی۔

''کاش! کہ وہ مجھے روک لیں، روپا!'' پھر اداسی سے سر جھٹک کر دوسرے صندوق کو بھرنے لگی۔

''آپ واپس کیوں جا رہی ہیں مایا دیوی؟ کیا..... کیا چھوٹا ملک آپ سے اس لیے خفا ہے؟'' ہچکچاتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھی۔

''کاش! کہ وہ اسی لیے خفا ہوتا۔ یہ صندوق گاڑی میں رکھوا دو، رام ناتھ سے کہو، تیار ہو جائے، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی، روپا نے سمجھ کر سر ہلا دیا اور باہر چلی گئی۔

اس نے سنہری آنکھوں میں کاجل ڈالا، بال سنوارے، گردن سے چپکا نازک سا ہیروں کا ہار درست کیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر اس بڑی سی تصویر کے سامنے آئی۔

''شبیہ حقیقی، مہاراجہ بلدیو سنگھ۔''

بوڑھا مہاراجہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''اے راجوں کے مہاراجہ! تمہیں لگتا تھا کہ تمہارے اوپر ساری مصیبتیں اس پتھر کے باعث آئیں۔ سو تم نے اسے قبرستان میں دفن کر دیا تاکہ کبھی کوئی اسے قبر سمجھ کر نہ کھودے۔ تم جانتے تھے، کوئی قبرستان کی حرمت پامال نہیں کرے گا، سو وہ منحوس مگر دنیا کا سب سے قیمتی پتھر ہمیشہ کیلئے مٹی میں دفن رہے گا، نہ کوئی اسے کھوجے گا، نہ وہ کسی کو ضرر دے گا۔ مگر اے راجوں کے مہاراجہ! پتھر تو پتھر ہوتے ہیں۔ وہ جسے تم مرد کے لیے تباہی مگر عورت کے لیے خوش بختی کی علامت سمجھتے تھے۔ وہ جس دن میری دسترس میں آیا، مجھے تباہ کر گیا۔ کاش! تم نے وہ پتھر دفنانے کے بجائے تباہ کر دیا ہوتا اور کاش! میں لالچ نہ کرتی۔''

وہ سر جھٹک کر باہر آئی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ نیچے روپ وتی اس کا سامان ملازموں سے اپنی نگرانی میں اٹھوا رہی تھی۔ وہ ٹھاکر رگھوناتھ کے کمرے کی طرف آئی۔

دروازہ نیم وا تھا، مایا نے آہستگی سے اسے دھکیلا۔ سامنے پلنگ پہ وہ نحیف، کمزور سا بوڑھا ٹھاکر لیٹا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ان کے پلنگ کے قریب آئی۔

''بڑے ٹھاکر!''

اس نے آہستہ سے پکارا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

''کون؟ گوپال؟'' وہ اٹھنے لگے تو اس نے اشارے سے انہیں روکا۔

''میں ہوں، مایا!''

''مایا......؟'' وہ نڈھال سے واپس لیٹ گئے۔ ''جیسے آج تم آئی ہو، کیا کبھی وہ ایسے نہیں آئے گا۔''

''چھوڑ کر جانے والے واپس نہیں آتے بڑے ٹھاکر! میں نے سمجھوتہ کرلیا ہے، آپ بھی کر لیں۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''اتنا چھوٹا سا تھا، جب وہ کہتا تھا، میں اسے گھوڑا لے کر دوں، گھوڑے کے لیے وہ شیکھر سے لڑتا بھی تھا۔'' وہ چھت کو تکتے کہہ رہے تھے۔ ''مگر اس نے شیکھر کو نہیں مارا، وہ تمہیں قید کر کے بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ گاؤں والے جھوٹی باتیں کہتے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔''میں آپ کو الوداع کہنے آئی تھی، میں جا رہی ہوں۔''

''کاش تم نہ آتیں مایا! جب تم آئیں تو شیکھر بھی مر گیا اور پھر گوپال بھی...... میرا گوپال بھی...'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ شیکھر بھی اس کی وجہ سے مرا تھا، گوپال کی موت بھی اسی کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔

وہ انہیں روتا چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔ بگھی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

وہ آہستہ سے چلتی قریب آئی۔ رام ناتھ نے سیڑھی بگھی کے ساتھ لگائی۔ وہ دھیرے دھیرے زینوں پہ قدم رکھتی اوپر چڑھنے لگی۔ اس کی سفید چوٹی کے سنہری پکھراج شام کی مدھم روشنی میں ماند پڑ گئے تھے۔

اس نے بگھی کا دروازہ کھولا، پردہ ہٹایا، اندر بیٹھی، ایک آخری نگاہ حویلی پہ ڈالی۔ روپا کو ہاتھ ہلایا اور مسکرا دیا۔ رام ناتھ نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی نشست سنبھال لی۔

روپ وتی بگھی کو دور ہوتے دیکھتی رہی، اس کا ہاتھ فضا میں بلند رہ گیا تھا۔

بگھی درختوں کے بیچ گھری سڑک پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ بیلی کے جنگل کے درخت، اونچے، اتنے گھنے کہ روشنی گھاس کو چھو نہ پاتی تھی۔

اندھیرا ڈھلنے لگا تھا، جب بیچ سڑک پہ بگھی کا راستہ چند گھڑ سواروں نے روک لیا۔ رام ناتھ نے سرعت سے لگام کھینچی، گھوڑے ہنہنائے اور بگھی رک گئی۔

''نیچے اترو۔'' تین گھوڑوں سے سوار اتر کر بہل بان رام ناتھ کے سامنے آئے۔ رام ناتھ تذبذب سے ایک نظر پیچھے دیکھ کر نیچے اترا۔

''ساتھ کون ہے؟'' برچھیت اپنی برچھی بلند کیے غرایا۔

''میم صاحب ہیں، شہر جا رہے ہیں۔'' اسے پچھلا تجربہ یاد تھا سو فر فر کہنے لگا۔

''ہوں۔'' برچھیت نے دستی بردار کو دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا۔ پھر رام ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔''میم صاحب سے بولو، اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دے۔''

اسی پل بگھی کا دروازہ اندر سے کھلا، اس مرمریں ہاتھ نے پردہ ہٹایا اور گہرے ہوتے

اندھیرے میں اس کا چہرہ مدھم سا نظر آیا۔

"کون ہے رام ناتھ؟"

"راہزن ہیں مالکن! کہتے ہیں زیور اتار دیں۔" رام ناتھ بے بس سا کھڑا تھا۔

مایا کے لبوں پہ مغموم سی مسکراہٹ بھر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر اپنے ہار کا ہک کھولا اور اسے گردن سے علیحدہ کر کے رام ناتھ کی طرف بڑھایا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ہار لے لیا۔

اسی پل وہ سفید گھوڑا گاؤں کے رستے سے بھاگتا ہوا ان تک آیا، جس کو مایا کی عادت پڑ گئی تھی۔

"ٹھہرو...... رکو۔" آنے والے نے چہرہ سیاہ ڈھاٹے میں چھپا رکھا تھا اور انداز میں تلخی تھی۔ اس نے ایک نظر بہل بان کے ہاتھ پہ ڈالی، جس میں ہار تھا اور دوسری خشمگیں نگاہ اپنے ساتھیوں پہ۔

"یہ اپنی مالکن کو واپس کر دو۔" وہ سامنے دیکھ کر سخت لہجے میں بولا تو مایا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تم مجھے کیا کیا واپس کرو گے بدر غازان؟ تمہارے اوپر میرے بہت سے قرض ہیں، بہت سی امانتیں ہیں۔ کس کس کو لوٹاؤ گے؟"

"میں عورتوں سے سر نہیں کھپاتا، تم جا سکتے ہو گاڑی بان!" وہ گھوڑے کا رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

رام ناتھ نے تذبذب سے مایا کو دیکھا، وہ استہزائیہ مسکراہٹ سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

"تم پہ میرے بہت سے قرض ہیں بدر، کاش کہ تم ان کو چکا سکو۔"

"آپ کو جانے دے رہے ہیں، یہی عنایت بہت ہے ہماری۔ ہم جانتے ہیں، آپ کدھر جا رہی ہیں۔ سنا ہے ڈی سی بہادر بھی استعفیٰ دے کر کب کے نکل چکے ہیں۔ اب آپ بھی ان کے پیچھے ہو لیجئے۔ چلو۔" وہ طنزیہ کہتا، اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا گھوڑا بھگا کر لے گیا اور وہ تڑپ کر ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

''چلو رام ناتھ، ہم بھی چلیں۔'' اس نے تھک کر سر نشست کی پشت سے لگا دیا۔ رام ناتھ اپنی باہری نشست پہ آ بیٹھا۔

''سنو رام ناتھ!''

''جی مالکن!'' وہ مؤدب بھی تھا اور قدرے افسردہ بھی۔

''میری ایک بات مانو گے؟''

''کہیے مالکن!'' اس نے گھوڑوں کی لگام کو جھٹکا دیا، بگھی سست روی سے چل پڑی۔

''اگر میں ہندوستان میں ہی مر جاؤں تو مجھے بیلی کے اسی پرانے قبرستان میں دفنانا، جہاں ایک بھوت پھرا کرتا تھا، کچھ پتا چلا وہ بھوت کون تھا؟''

''سایہ تھا وہ مالکن! ہوائی چیز تھا، ابھی تک قبرستان میں ہے۔''

''ہاں۔'' وہ دکھ سے ہنسی۔ ''وہ شاید قبرستان میں ہی رہ گیا ہے۔''

''آپ ایسی باتیں نہ کریں مالکن! آپ تو دو دن بعد ہندوستان سے جا رہی ہیں، پھر ادھر مرنے کی باتیں کیوں کرو ہو؟''

''دو دن میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں رام ناتھ! کچھ علم نہیں ہوتا کس گھڑی میں کیا بیت جائے، کیا تم میری بات مانو گے؟''

''میرے بس میں کچھ نہیں ہے مالکن! وہ مسلمانوں کا قبرستان ہے اور آپ عیسائی ہو۔ مسلمان ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

''کتنے ظالم ہو تم بیلی والے، کسی کی آخری خواہش کا احترام بھی نہیں کرتے۔ مگر جانے دو، تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو، مجھے قبرستان کے پھاٹک کے باہر دفنا دینا۔''

اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پا رہا تھا۔

بگھی اب سرعت سے کچی پکی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

* * *

وہ بالکونی میں منڈیر پر ہاتھ رکھے جھکا کھڑا نیچے حویلی کے دالان کو دیکھ رہا تھا۔ حویلی کی دیواریں، منڈیریں، چھت اور نیچے درخت، روشن قمقموں، بتیوں اور دیوں سے سجائے گئے تھے۔ اندھیری رات میں روشنیاں آسمان پہ بکھرے تاروں کی مانند لگ رہی تھیں۔

اس نے ایک لمحے کو اپنے کمرے میں حجلۂ عروسی میں بیٹھی زہرہ کے بارے میں سوچا، جو جانے کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی، پھر اسی طرح نیچے مہمانوں کی چہل پہل کو دیکھنے لگا۔

کچھ لوگ اندر جا اور آ رہے تھے۔ کچھ رشتے دار بچے بھاگتے پھر رہے تھے۔ ایسے ہی اس کے ذہن میں یادیں بھاگتی پھر رہی تھیں۔

ڈلہوزی کی ایک ڈوبتی شام جب درختوں کے بیچ شاخیں اِدھر اُدھر ہٹاتی، پتوں پہ پاؤں رکھتی، وہ سنہری بالوں والی لڑکی اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔

''یہ شاہی خاندانوں کا دستور ہوتا ہے کہ جس نے جس پہ ہاتھ رکھا وہ اسے دے دیا جاتا ہے۔''

''یہ لڑی میری تیرہویں سالگرہ پہ مجھے کوئین مدر نے دی تھی۔''

''تم ایک شہزادی کو ایک نو آبادی کے اس باغ کی قیمت گنوار ہے ہو؟''

''جھوٹ۔'' اس نے دکھ سے سر جھٹکا۔ ''سب جھوٹ، سب اداکاری تھی۔ وہ ہر پل، ہر وقت اداکاری کرتی رہی اور میں اس کے تھیٹر کا تماشائی بن کر اسے سراہتا رہا۔ وہ تو اول روز سے ہی اداکارہ تھی، میں کیوں بے وقوف بنتا رہا۔''

اسے اس سے نفرت نہیں ہوتی تھی، اسے اس پہ غصہ آتا تھا۔ یا شاید زیادہ غصہ اسے اپنے بے وقوف بننے پہ تھا، یا شاید اپنے اتنے لاعلم رہنے پہ۔ چوٹ اس کی انا پر پڑی تھی۔ جانے مایا کتنی قصوروار تھی، اس سب میں۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ نیچے کی گہما گہمی ماند پڑنے لگی اور سب اپنے اپنے کمروں میں دبک کر سونے لگے تو وہ سست روی سے چلتا اپنے کمرے کے دروازے تک آیا۔ ہولے سے اس نے دروازہ دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ باہر راہداری تاریک تھی، وہ اندھیرے میں کھڑا تھا، دروازہ کھلا تو روشن کمرے سے روشنی آنے لگی۔ یہاں تک کہ پورا دروازہ کھل گیا اور وہ روشنی میں نہا گیا۔

اس کا پلنگ تازہ سرخ گلاب کی لڑیوں سے سجایا گیا تھا۔ پلنگ کے عین وسط میں، گھونگھٹ چہرے پہ گرائے وہ بیٹھی تھی۔ سرخ گھونگھٹ کے کنارے پہ سنہری تاریں لگی تھیں اور وہ خاصا نیچے تک گرا تھا، اتنا کہ اس کی گردن بمشکل دکھائی دیتی تھی۔ گھٹنوں کے گرد اس نے بازوؤں کا حلقہ بنا رکھا تھا۔ آستین کہنی تک ختم ہو جاتی تھی اور آگے کلائی تک سونے کی چوڑیاں کنگن بھرے تھے۔

ہاتھوں کی پشت پہ مہندی کے بیل بوٹے بنے تھے۔ بدر کی نگاہ اس کے سپید پیروں پہ جھک گئی، وہاں بھی ایڑھیوں تک مہندی کے نقش دمک رہے تھے۔

وہ بہت حسین تھی، یقیناً وہ دونوں ہنسی خوشی ساتھ نباہ کرلیں گے، اس نے دل کو تسلی دی اور محبت کا کیا ہے، یہ تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا پلنگ کے قریب گیا، ہاتھ سے پھولوں کی لڑیاں ایک طرف کیں اوراس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیسی ہو؟'' اس نے گھونگھٹ الٹا تو وہ حسین بناؤ سنگھار سے آراستہ چہرہ سامنے آیا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہو؟'' وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

''میں اچھا ہوں زہرہ!'' اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ ''امید ہے تم پچھلی باتوں کو بھلا دو گی اور ہم نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' اس کا حنائی ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر وہ میکانکی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''اور ہاں'' یاد آنے پر اس نے شیروانی کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی۔

''تمہاری رونمائی کا تحفہ۔'' اور زہرہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے چونکی۔

''تحفہ؟'' اس کے لبوں سے پھسلا۔ ''میم صاب نے کچھ دیا تھا آپ کے لیے وہ......'' وہ یکدم چپ ہوگئی۔ شادی کی پہلی رات اور رونمائی کا تحفہ ملنے سے بھی قبل وہ ایک دم ساری جھجک اور حیا بھلا کر پرانے انداز میں بولنے پہ قدرے شرمندہ ہوئی۔

''کیا دیا تھا......؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''معلوم نہیں، سرخ پوٹلی تھی، نیچے کمرے میں رکھی ہے، لے آؤں؟''

''ہاں جاؤ۔'' وہ بے چین سا کھڑا ہو گیا۔

زہرہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر پلنگ سے پاؤں نیچے اتارے، جوتی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا، پھر ایسے ہی ننگے پاؤں چلتی کمرے سے راہداری میں آئی۔

پوری حویلی خاموشی اور نیم تاریکی میں ڈوبی تھی۔ وہ دونوں اطراف سے سرخ کامدار غرارہ ہاتھوں میں پکڑے تیزی سے ننگے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگی۔ بار بار زیور کی چھن چھن ہوتی اور چوڑیاں کھنکتیں۔

وہ نیچے اتر کر رہداری میں تقریباً دوڑتی ہوئی، ایک ہاتھ سے غرارہ پکڑے، دوسرے سے ڈھیلا ہوتا دوپٹہ سنبھالے اپنے کمرے میں آئی، بستر کے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی اور تیزی سے سنگھار میز کا تالہ کھولنے لگی۔

چند ثانیے بعد وہ بدر کے روشن کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔

"یہ دیا تھا۔" اس نے سرخ پوٹلی اس کی طرف بڑھائی، جس کا منہ سنہری ڈوری سے بندھا تھا۔

بدر نے تیزی سے پوٹلی تھامی اور سنہری ڈوری کی گرہ کھولی۔ سرخ کپڑا کھل کر ہتھیلی پہ پھیل گیا۔ اس کے اوپر ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

"یہ ہیرا ہے؟" زہرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وہ یک ٹک ہیرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا چمکدار تھا اور اس سے ایسی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھوٹتی تھی کہ آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔

"یہ کب دیا تھا اس نے؟" کچھ دیر بعد وہ بولا تو آواز کپکپا رہی تھی۔

"تین روز پہلے...... چاچی نے آپ کے سامنے آنے سے منع کیا تھا تو اسی لیے دے نہیں سکی، ساتھ یہ کاغذ بھی دیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں اپنے باپ سے ادھر ملنا ہے شاید کل رات...... یا پرسوں رات...... کسی جہاز پہ......"

اس نے مٹھی میں دبا کاغذ دینا چاہا تو بدر نے جھپٹ کر وہ کاغذ پکڑا اور کھول کر پڑھا۔ اس پہ ایک جہاز کا نام اور جگہ کا پتہ لکھا تھا۔ وہ تیزی سے لرزتی انگلیوں سے کاغذ تھامے پڑھ رہا تھا۔ ذہن میں دور ایک آواز گونج رہی تھی۔

"وہ مجھے مار دے گا بدر! اگر اسے ہیرا نہ ملا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔" اس نے بے اختیار مخملیں سرخ کپڑے پہ پڑے ہیرے کو دیکھا۔

"ماہ ملکہ...... نیلی راجپوتاں کی ملکہ...... وہ تو اس کے پاس تھی، پھر مایا کار اس کو کیا دے گی؟"

"تم مجھے کیا کیا واپس کرو گے بدر غازان؟"

اس نے تیزی سے پوٹلی کی گرہ پھر سے لگائی، اسے جیب میں ڈالا اور کاغذ اسی طرح مٹھی

میں دبائے باہر کی طرف لپکا۔

''میں جلد آ جاؤں گا، فکر نہ کرنا۔'' بس ایک فقرہ اس کے لیے چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا اور وہ پلنگ کے پائے کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

وہ مہارانی پھر سے دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔ اگر اسے علم ہوتا کہ بدر اس کا تحفہ دیکھ کر یوں دیوانہ وار باہر بھاگے گا تو وہ اسے کبھی وہ تحفہ نہ دیتی، کیوں کر دیا اس نے ایسا؟

وہ گھٹنوں پہ سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے معلوم تھا، اب اسے بہت سے دن اور رات انتظار کرنا ہوگا اور تب بھی شاید ہمیشہ کا سکون اسے نہ ملے، وہ جو سمجھتی تھی کہ شادی کر کے بدر اس کا ہو جائے گا اور وہ اسے باندھ لے گی، اس پہ آج ادراک ہوا تھا کہ زور زبردستی سے کسی کو اپنا کب بنایا جا سکتا ہے؟

اس کی بلند ہوتی ہچکیاں روشن کمرے میں لگی پھولوں کی سیج سے ٹکرا رہی تھی۔

* * *

اس کو اپنی منزل مقصود کی طرف جاتی جو پہلی ٹرین ملی تھی، وہ اس میں سوار ہو گیا تھا۔

ٹھنڈا یخ لوہے کا راڈ پکڑے وہ ایسے ہی گم صم سا کھڑا رہا، ہلا تک نہیں، نہ ہی بیٹھا۔ اس کا ذہن کہیں بہت دور کھویا ہوا تھا۔

''میرے بہت قرض ہیں تم پر...... تم کس کس کو چکاؤ گے؟''

کون سا اسٹیشن آیا' کون سا گزرا' اس نے کون سی ٹرین بدلی' کس بس میں سوار ہوا' اسے کتنے دھکے لگے' وہ کتنا بھاگا' اسے علم نہ تھا' بس وہ ایک آواز اس کے دل و دماغ پہ ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

''تمہارے پاس میری بہت سی امانتیں ہیں بدر غازان! تم کس کس کو واپس کرو گے۔''

اونچے درختوں کے بیچ ڈلہوزی کی اس پہاڑی کا منظر پھر سے روشن ہو گیا۔ اس کا پاؤں پکڑے' اپنے لبوں سے زہر چوستی وہ لڑکی' جس کے سنہری بال شانوں پہ بکھرے تھے۔

اس پہ اس کے بہت سے قرض تھے' انہیں وہ کیسے چکا پائے گا؟

اسے یاد آیا' جب وہ اس کی بالکونی میں سے نکل رہا تھا اور مایا نے اس کے سامنے آ کر اسے روکنا چاہا تھا تو کیسے اس نے سختی سے اسے پرے دھکیل دیا تھا۔ اسے یاد آیا' اس وقت وہ رو رہی تھی'

اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا اور وہ اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ وہ اسے بتانا چاہ رہی تھی' کہ وہ اداکارہ تھی' مگر اس کی محبت ناٹک نہیں تھی۔ وہ سچی اور کھری تھی۔

اور وہ بیلی کے جنگل میں درخت کے کٹے تنے پہ بیٹھی' چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک بلک کر روتی لڑکی' اسے اس وقت کیوں بھول گئی تھی۔ جب وہ اسے ہٹا کر اس کے کمرے کی بالکونی سے نکلا تھا اور وہ سوگواری سفید ساڑھی والی عورت بھی' جو عجلت میں تھانے میں داخل ہوئی تھی' جس کا سنہری ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا۔ جس نے آکر اسے ایک فریبی دوست کے چنگل سے نکالا تھا۔ وہ سب کچھ بھی کیوں اسے اس کی محبت کی تصدیق کے لئے ناکافی لگا تھا؟ میرین جان کارلس ؑرف مایا دتی کو اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے وہ ہیرا کیوں اس کی ہتھیلی پہ رکھنا پڑا تھا' جس سے ں کی زندگی کی ڈور بندھی تھی؟

صبح طلوع ہوئی' دوپہر ہوئی' شام اتری اور پھر رات بھی ڈھل گئی۔ اس کا سفر بس ختم ہونے کو تھا۔

وہ بار بار جیب تھپتھپا کر ''ماہ ملکہ'' کی موجودگی کا یقین کرتا۔ وہ جاتے جاتے بھی اس کو کچھ دے کر گئی تھی۔ وہ واقعتاً شہزادی تھی' بے نیاز اور سخی' مگر صرف وہ پتھر نہیں' مایا نے اسے اپنے تمام احسان اتارنے کا ایک موقع بھی دیا تھا۔

بس ایک دفعہ اسے مایا مل جائے' وہ ہیرا اسے لوٹا کر کارلس کو اس کی جان سے کھیلنے نہیں دے گا۔ بس ایک بار وہ اسے مل جائے۔

وہ بے چینی سے ڈھلتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

***

جس وقت زہرہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی مغموم سی اس کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھی' بیلی راجپوتاں سے بہت دور وہ سمندر کے پانی کو ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔

رات کے اس پہر سمندر کا پانی بالکل سیاہ تھا اور پورے چاند کی چاندنی سے پانی کی سطح چمک اٹھی تھی۔ لہریں پلٹ پلٹ کر اس اکیلے کھڑے ٹوٹے پھوٹے بحری جہاز سے ٹکراتی تھیں' جس کے عرشے پہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے وہ دور پانی کی آخری حد کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی' جس کا سیاہ پلو سمندر کی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سنہری

بال پیچھے کو اڑ رہے تھے۔ وہ لبوں پہ مدھم مسکان لیے کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس معلوم تھا اب تک اس کو مایا کا پیغام مل گیا ہو گا اور وہ یقیناً آ رہا ہو گا۔ وہ تحفہ واحد چیز تھی' جو اسے اس کی محبت کا یقین دلا سکتی تھی۔

''مایا!'' آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔

کارلس اس کی طرف آ رہا تھا۔

وہ خود کو اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔

''تم آ گئیں۔'' اس کا لہجہ سرد تھا' وہ اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہاں۔'' مایا نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

''ڈائمنڈ کہاں ہے؟'' کارلس نے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''مایا...... مجھے ڈائمنڈ دو۔''

اس نے قریب رکھی ایک سیاہ مخملیں پوٹلی اس کی ہتھیلی پہ رکھی' جس کا منہ سفید چمکیلی ڈوری سے بندھا تھا۔

کارلس نے پوٹلی کو مضبوطی سے تھاما اور ڈوری کھولی۔

اندر وہ بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

کارلس نے اسے اٹھایا' انگلی اور انگوٹھے کے درمیان رکھ کر اوپر کیا اور غور سے دیکھا۔

''اس ناند میں یہی تھا۔'' وہ بغور کارلس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔

''مجھ سے دھوکا مت کرو۔ میں قیمتی پتھروں کو دور سے پہچان جاتا ہوں۔ یہ نقلی ہے۔''

مایا کا رنگ فق ہو گیا۔

''پاپا...... یہ......''

''میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ مجھے ہیرا چاہیے مایا! ہیرا دی ڈائمنڈ!'' وہ دبی دبی آواز میں غرایا۔

''مجھے ناند میں سے یہی ملا تھا' تم دوبارہ دیکھو یہ شاید......''

''جسٹ اسٹاپ اٹ۔'' کارلس نے سبز برساتی کی جیب سے پستول نکالا اور اس کی ٹھنڈی

تال مایا کی پیشانی پہ رکھ دی۔

''اب بتاؤ ہیرا کہاں ہے؟''

* * *

اس نے دور بحری جہازوں اور کشتیوں کی قطار کو دیکھ کر ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی پہ ڈالی۔ سرخ مخملیں پوٹلی' جو خاصی وزنی تھی یا وہ اس کے دل پہ پڑا بوجھ تھا اور قطار میں کھڑے آخری جہاز کی طرف بھاگا۔

وہ آخری جہاز کسی حادثے کا شکار ہو کر آدھا ٹوٹ چکا تھا اور عرصے سے ادھر کھڑا تھا۔ اس کا عرشہ دن میں ویران ہوتا تھا اور رات میں عموماً جواری یا نشئی ادھر محفل جماتے تھے۔

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا' کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا' بس وہ مایا کو کارلس سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس سے نفرت کہاں کر سکتا تھا؟ اس پراسرار سی مہارانی کو وہ بھلا بھی نہ سکتا تھا۔

وہ جہازوں کے قریب ہی تھا' جب اس نے گولی چلنے کی آواز سنی' یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلیں۔

وہ پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ وہ آوازیں اس آخری تباہ شدہ جہاز سے ہی آ رہی تھیں

''نہیں' وہ اسے بچا لے گا' وہ اسے مرنے نہیں دے گا' وہ اسے کارلس سے بچا لے گا۔'' وہ یہی سوچتا' دیوانہ وار بھاگتا گیا۔

جہاز کی سیڑھیاں خستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ وہ تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا' بھاگتا ہوا راہ میں آئی رکاوٹیں عبور کرتا' جس وقت عرشے پہ پہنچا' اسی وقت ''تڑتڑتڑ'' کی آواز کے ساتھ بہت سے موتی اس کے قدموں سے ٹکراتے ادھر اُدھر بکھر گئے۔

اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ سفید موتی خون میں لتھڑے سرخ پڑ گئے تھے اور اِدھر اُدھر بکھرتے سرخ لکیریں بناتے جا رہے تھے۔ اسی پل کسی وزنی شے کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔

وہ بے اختیار آگے بڑھا۔

سامنے خون کا ایک تالاب پڑا تھا اور خون کے نشانات تھے' جیسے کسی لاش کو گھسیٹ کر ابھی ابھی پانی میں پھینکا گیا ہو۔

''لاش؟ مایا.....'' اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

وہ دوڑ کر عرشے کی دوسری طرف آیا اور اسی پل اسے لگا' کسی نے سمندر میں چھلانگ لگائی ہے۔ سبز برساتی اور بڑے سے ہیٹ کی ایک ہلکی سی جھلک وہ دیکھ سکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر جھک کر پانی کو دیکھ پاتا' پانی میں ڈبکی لینے کی آواز آئی اور سکوت چھا گیا۔

وہ دھیرے دھیرے شکست خوردہ قدموں سے چلتا واپس خون کے تالاب اور موتیوں تک آیا۔

موتی ابھی تک اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔

وہ تھکا ماندہ اِدھر گر گیا۔ خون اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پہ لگ گیا' پھر تھک کر سر گھٹنوں پہ رکھ دیا۔

''کبھی جو تم اس لڑی کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھو تو جان لینا کہ یا تو مایا نے دل ہار دیا' یا جان ہار دی۔''

وہ ٹھیک کہتی تھی۔

بیلی راجپوتاں کی ملکہ نے جان ہار دی تھی۔

اس نے جیب سے سرخ پوٹلی نکالی اور کھولے بغیر اسے پوری قوت سے دور پانی میں پھینک دیا۔

پوٹلی نے غوطہ کھایا اور پھر سمندر کے تاریک پانی میں گم ہو گئی۔ فساد کی وہ جڑ ہمیشہ کیلئے ڈوب چکی تھی۔

وہ ہمیشہ اسے پچھاڑ کر جاتی تھی' اب کی بار وہ جاتے جاتے اسے زندگی بھر کا ایک نہ ختم ہونے والا غم دے گئی تھی۔

ایک ایسا پچھتاوا' جس سے وہ کبھی جان نہ چھڑا پائے گا' کہ وہ ساری زندگی سوچتا رہے گا' کاش کہ وہ اسے بچا پاتا۔

* * *

بحری جہاز گھنٹہ بھر سے رُک چکا تھا۔ مسافر اپنا سامان اٹھائے' اپنے بچوں کو سنبھالتے' شور کے باعث ایک دوسرے سے بلند آواز میں بات کرتے سمندر کی حدود سے باہر آ رہے تھے۔

بہت سے مسافروں کے درمیان ایک مسافر نے بہت تھکے تھکے انداز میں اپنا بیگ زمین پہ رکھا تھا۔ اس نے سبز برساتی پہن رکھی تھی اور سر پہ بڑا سا ہیٹ تھا۔

وہیں سمندر کے کنارے اپنے بیگ کے ساتھ ہی بیٹھ کر اس نے سر نیچے جھکا لیا اور تھکاوٹ سے کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبایا۔ ہندوستان سے انگلستان تک کا بحری سفر خاصا تھکا دینے والا تھا۔

لوگوں کی چہل پہل جاری تھی' گہما گہمی اپنے عروج پہ تھی۔ اس نے چند لمحے خاموشی سے گردن اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا۔ پھر اپنے سر پہ رکھا وہ بڑا سا بانس کے تنکوں کا بنا ہیٹ اتارا' اسے زور سے سمندر کے پانی پہ اچھال دیا اور لمبے سنہری بال برساتی کے اندر سے نکال کر اور ان میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے لگی۔

دفعتاً اس کی انگلیوں کو بال خالی خالی لگے تو اس نے بالوں کی اس لٹ کو چھوا' جو کبھی موتیوں سے بہت وزنی ہوتی تھی۔

اب وہ لٹ خالی تھی۔

ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ اسے یاد تھا' اس نے ایک دفعہ بدر سے کہا تھا۔

''اگر جو کبھی تم اس لڑی کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھو تو جان لینا کہ یا تو مایا نے دل ہار دیا' یا جان ہار دی اور اگر مجھے کبھی کچھ ایسا مل گیا جو خوش قسمتی کے ہما کو ہمیشہ میرے سر پہ سایہ کیے رکھ سکے تو میں اسے خود ہی توڑ دوں گی۔''

اور جب اس رات اس نے اپنے سوتیلے باپ کو اپنے دفاع میں مارا تھا' جو نہ صرف اس کی ماں پر ظلم کا مرتکب اور اس کی محرومیوں کا ذمہ دار تھا' بلکہ شیکھر کا قاتل بھی تھا تو اس کی لاش کو اس برساتی اور ہیٹ سے ہلکی کر کے سمندر میں دھکیلنے کے بعد اس نے خود ہی وہ لڑی توڑ دی تھی کہ اس کے پاس خوش قسمتی کے ہما کو اپنے سر پہ برقرار رکھنے کے لئے کچھ اور بہت قیمتی اور خاص موجود تھا۔

مایا نے برساتی کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ ٹاٹ کی پوٹلی نکالی' جسے ربڑ لگا کر باندھا گیا تھا۔

اس نے ربڑ اُتارا اور پوٹلی کھولی۔ اندر وہ بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا' مگر اس کی جگمگاہٹ اس

کے ان دو نقلی Replicas کی طرح شوخ اور بے حد تیز نہیں تھی' جو اس نے بدر اور کارلس کو دیے تھے' جو بہت پہلے سے اس نے تیار کر کے رکھے تھے' بلکہ "ماہ ملکہ" کی چمک بہت ٹھنڈی' بہت باوقار تھی۔

اس نے مسکرا کر ہیرے کو دیکھا۔ اس ہیرے کے لیے اس نے بہت سے کھیل کھیلے تھے' مگر جس کے ساتھ کھیل نہیں کھیلا تھا' جب اس نے دھتکارا تو اس رات اپنی بالکونی میں روتے ہوئے اس نے عزم کیا تھا کہ بھلے وہ جس سے اس نے واقعتاً محبت کی تھی' اسے نہ اپنائے' مگر وہ اسے زندگی بھر کا وہ دکھ ضرور دے کر جائے گی' جو اس نے اسے دیا تھا اور اسے علم تھا کہ اس نے عرشے پہ بیٹھ کر وہ موتی ضرور چنے ہوں گے۔

"اے بیلی کے نیزہ باز لڑکے!" اس نے کرب سے مسکرا کر ہیرے کو دیکھا اور واپس احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ "اسے اپنی ساری کہانی سنائی تھی اور وہ سرخ پوٹلی اس تک بھیجنے سے پہلے بھی بہت دفعہ اسے بتایا تھا' بار بار بتایا تھا' مگر پھر بھی وہ سمجھ نہ سکا اور وہ پتھر دیکھتے ہی بھول گیا کہ میں لندن کے تھیٹر کی سب سے کامیاب اداکارہ ہوں۔"

وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنا بیگ اٹھائے ایک طرف کو چل دی۔

اس دن کے بعد سے کسی نے اسے لندن کے تھیٹر میں نہیں دیکھا تھا۔

* * *

مہر النساء

موموکا پورا نام مہر النساء تھا، مگر میں نے تمام عمر اسے مہر النساء کہہ کر نہیں پکارا۔ میں اسے موموکہتا تھا، صرف مومو۔ پھر بھی میں نے اپنی کہانی کا نام مہر النساء رکھ دیا ہے، کیونکہ یہ میری داستان نہیں ہے۔ یہ تو موموکی کہانی ہے اور مہر النساء کی بھی۔ مہر النساء یعنی عورت کی محبت کی، یہ عورت کی محبت کی کہانی ہے۔ مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئے گی، میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو موموکی کہانی سننا پڑے گی۔

میری اور موموکی زندگی ایسی ہی تھی، جیسے شمع اور پروانے کی ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی شمع کے گرد پروانے کو ایک دائرے میں گھومتے دیکھا ہے؟ بہت چاہنے کے باوجود بھی پروانہ اس مدار سے نکل نہیں پاتا، راستہ نہیں بدل پاتا اور جب شمع بجھ جاتی ہے تو وہ نڈھال سا ہو کر گر جاتا ہے۔ زیاں شمع کا ہوتا ہے یا پروانے کا، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔

مجھے تو یہ علم بھی نہیں کہ پروانہ ہم دونوں میں سے کون تھا؟ شاید میں تھا، یا پھر شاید مامو تھی۔

موموکو میں اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ مہر النساء ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ مومو بن گئی تھی اور پھر میں نے اسے مہر النساء کبھی پکارا ہی نہیں، بلکہ میں نے تو اسے کبھی بھی نہیں پکارا۔ اسی لیے اس کو مہر النساء کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ یہ طرز تخاطب، بہت اجنبی سا ہے، بلکہ اب تو مومو بھی اتنی ہی اجنبی ہے جتنا یہ نام۔

موموکے کان میں اذان میں نے دی تھی، اس کو پہلا بوسہ بھی میں نے دیا تھا۔ اس کو نرس کے کھردرے ہاتھوں کے شکنجے سے اپنے بازوؤں میں سب سے پہلے میں نے ہی اٹھایا تھا۔ میری

جگہ اس وقت حیدر کو ہونا چاہیے تھا، کیونکہ مومو اس کی بیٹی تھی۔ مگر حیدر کے بہت سے مسائل تھے۔ وہ ہفتہ پہلے ایک اکنامک فورم میں شرکت کرنے کے لیے کینیڈا گیا تھا، اسے مومو کی پیدائش سے پچھلے روز ہی آجانا تھا، مگر برف باری کے باعث فلائٹس ملتوی ہوگئیں اور وہ وہیں پھنس گیا۔ اپنی جگہ وہ بھی بہت تڑپا تھا، کیونکہ مومو اس کی اور سونیا کی پہلی اولاد تھی۔

حیدر کے کزن اور بہترین دوست ہونے کی حیثیت سے آنٹی نے مجھے فون کر کے بلوالیا تھا۔

''حسان! مجھے اس وقت حیدر کی ضرورت ہے۔ اور وہ نہیں ہے، مگر تم بھی میرے لیے حیدر کی ہی طرح ہو۔'' وہ پریشان تھیں، اسی لیے اپنا پہلا جاب انٹرویو بھلا کر میں دوڑا چلا آیا اور پھر تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

جب نرس نے حیدر کی نومولود کمبل میں لپٹی بیٹی میرے حوالے کی تو ایک مسرت بخش احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے جھک کر بچی کو پیار کیا اور پھر ہسپتال کے سفید اور گرے ماربل سے بنے کاریڈور کے دوسرے سرے پر کھڑی آنٹی کے پاس اسے لے آیا۔

''آنٹی یہ حیدر کی بیٹی ہے۔'' اس سوئی ہوئی بچی کو میں نے آنٹی کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے والہانہ انداز میں بچی کا ماتھا چوما۔ مگر یکدم سر اٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی خوشی سے تمتاتے چہرے پر تفکر کی لکیریں ابھری تھیں۔

''سونیا کیسی ہے حسان؟''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

میرا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آنٹی پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ میری پشت پر کسی نے کہا۔

''سونیا کے ہزبینڈ کون ہیں؟'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے سفید اوورآل میں ملبوس، سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھیں۔

''وہ یہاں نہیں ہیں، سونیا کیسی ہے؟'' میرے لہجے میں بے قراری تھی۔

''سوری، وہ بچ نہیں سکیں۔'' انہوں نے بتایا اور میں اپنی جگہ سن سا ہو کر کھڑا رہ گیا۔

آنٹی بے اختیار اپنی من چاہی بہو کے لیے رونے لگی تھیں۔ میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ ان

کی بانہوں میں سکون سے سوئی بچی پر ڈالی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ بچے سے اس کی ماں چھن جائے، اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کون کر سکتا تھا؟ میری ماں بھی تین برس کی عمر میں مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ موموکی ماں کو اللہ نے اس سے دور کر دیا تھا اور میری ماں کو ایک مرد نے، یعنی ان کے دوسرے شوہر نے۔ اس کے بعد مجھے کسی عورت کی محبت نہیں مل سکی تھی۔ میرے اندر اس بات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مومو کے اندر بھی پیدا ہو، مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

حیدر بمشکل جنازے پر پہنچ سکا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کی اور سونیا کی لو میرج تھی۔ یہ بات مجھے اور بھی دکھی کر گئی۔

حیدر کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ آنٹی تعزیت کے لیے آنے والوں کو بھگتا رہی تھیں۔ کسی اور کی مدد نہ حاصل ہونے کے باعث میں اکیلا باہر کے بہت سے کام نمٹا رہا تھا۔ ایسے میں کسی کو بھی اس ایک دن کی بچی کا خیال نہ آیا، جو پتہ نہیں کہاں تھی۔

اس وقت بھی میں اپنی نگرانی میں مائی حلیمہ سے کچن سے برتن نکلوا رہا تھا، جب دفعتاً ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ''یہ کون رو رہا ہے؟''

''کوئی مہمانوں کا بچہ ہوگا۔'' حلیمہ نے پلیٹیں نکالتے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔

میں یکدم بے چین سا ہو گیا۔ وہ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ حلیمہ کو کچن میں چھوڑ کر میں آواز کے تعاقب میں باہر آ گیا۔ رونے کی آواز پینٹری کے ساتھ بنے اسٹور روم سے آ رہی تھی۔ میں اسٹور روم کا نیم ہوا دروازہ پورا کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، سامنے سلور کی ایک پیٹی پر کمبل میں لپٹی حیدر کی روتی بیٹی مجھے دکھائی دی تھی۔

دکھ، حیرت اور غصے سے میرا برا حال تھا۔ میں نے بچی کو اٹھا کر تھپکا، مگر وہ روتی رہی۔ میں نے اس کو باہر جا کر آنٹی کے حوالے کیا اور نوکروں کو ایک یادگار ڈانٹ پلا کر بچی کی نگہداشت پر لگا دیا۔ پتہ نہیں، وہ کب سے بھوکی تھی۔

اس رات حیدر کو پہلی دفعہ اپنی بیٹی دکھائی گئی۔ حیدر نے کسی فلمی باپ کی طرح بیوی کی موت کا ذمہ دار بیٹی کو ٹھہرا کر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

سونیا کی ڈیتھ کے چھٹے دن جب میں حیدر کی طرف گیا تو آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

''حسان! حیدر کی بیٹی کا نام کیا رکھیں؟''

ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے بغیر سوچے سمجھے میرے لبوں سے ''مہرالنساء'' نکلا تھا۔

''مہرالنساء'' شاید آنٹی کو نام بیک ورڈ لگا تھا۔

''اس بچی کو محبت کی ضرورت ہے آنٹی، اور مہر کا تو مطلب ہی محبت ہوتا ہے۔'' میں یونہی کہتا چلا گیا۔

''ہوں ٹھیک ہے، یہ نام بالکل ٹھیک ہے۔ حیدر سے میں نے پوچھا تو وہ ''آپ کی مرضی'' کہہ کر لاتعلق ہو گیا'' پتہ نہیں اس نے اور سونیا نے اپنے بچے کے لیے کتنے نام سوچے ہوں گے۔'' وہ یکدم افسردہ نظر آنے لگیں۔

''حوصلہ کریں آنٹی!'' ایک دم بہت زیادہ تنہا ہو جانے والی آنٹی کو تسلی دینے لگا اور پھر نامحسوس طریقے سے میرا حیدر کے گھر آنٹی کی دلجوئی کے لیے آنا جانا بڑھتا گیا۔

وہ حیدر کے لیے بہت پریشان رہتی تھیں۔ حیدر نے خود کو ہر شے سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اب اس کے کام میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ سگریٹ پیتا بھی دکھائی دیتا، حالانکہ سونیا کی ڈیتھ سے پہلے وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

''مت کیا کرو اسموکنگ نقصان دے گی۔'' ایک دن جب وہ لان میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا تو میں نے اسے ٹوکا وہ چھبیس سال کا تھا۔ مجھ سے چار برس بڑا، مگر ہمارے بے تکلفی بلا کی تھی۔

''کبھی میں تمہیں منع کرتا تھا اور اب تم مجھے۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے حیدر! تم آنٹی اور مہر کو وقت نہیں دے رہے ہو۔ ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تم یونہی سگریٹوں کی طرح خود کو پھونکتے رہو گے تو نارمل لائف کی جانب آنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔''

میرے سمجھانے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن مجھے علم تھا، وہ میری بات نہیں مانے گا۔ مومو اور حیدر میری زندگی کی کہانی کے وہ کردار تھے، جنہیں کبھی میری بات نہیں ماننا تھی۔

میری زندگی میں ایک اور کردار میرے ابو تھے، جن کا دو برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ بہن بھائی تھے نہیں، میں اکیلا رہتا تھا۔ ان دنوں نوکری کی تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کے بارے میں میرے

پلان واضح تھے، ایک زبردست قسم کی جاب ڈھونڈ کر چار پانچ برس خود کو فنانشلی اسٹرانگ کرنا اور پھر کسی اچھی سے لڑکی سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہنا۔ زیادہ مسائل میرے ہوتے نہیں تھے، سو روز شام اپنے گھر سے دس منٹ کی واک پر موجود حیدر کے گھر جا کر آنٹی کے ساتھ ایک کپ چائے پینے کا وقت خود بخود نکل آتا تھا۔

اسی طرح کی ایک عام سی شام جب میں آنٹی کی طرف آیا تو وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھی، اپنے پوتی کے منہ میں چمچوں سے پانی ڈال رہی تھیں۔

''کیسے ہو حسان!'' مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مہربان تبسم بکھر گیا۔

''میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟''

''میں تو بس مہر کی جانب سے پریشان ہوں۔'' اپنی گود میں لیٹی مہر پر جھکی، وہ تشویش سے کہنے لگیں۔

''رات سے اتنا تیز بخار ہے، اب میری الٹی سیدھی طبی امداد سے شکر ہے، کچھ کم ہوا ہے، ورنہ اتنے چھوٹے بچے کی تو کوئی دوائی بھی نہیں ہوتی۔''

''ارے اتنی پیاری سی بچی کو کیوں بخار چڑھ گیا؟'' میں اٹھ کر مہر کے قریب آ گیا اور پیار سے اس کا گال چھوا۔ وہ اپنی دادی کو دیکھ رہی تھی۔

''مہر! اوئے گندی بچی، ادھر دیکھو۔'' میرے پکارنے پر بھی وہ دادی کو ہی دیکھتی رہی۔ اس نے پنک کلر کے فراک کے ساتھ ہم رنگ اونی جرابیں پہن رکھی تھیں۔

''مہر! ادھر دیکھو۔'' میں نے اسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''مہر گندی بچی! مومو!'' غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے مومو نکلا۔ اس نے ایک دم اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا۔

مومو دراصل اس ناول کی ہیروئن کا نام تھی جو میں پچھلی رات پڑھ رہا تھا۔ مہر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میرے لبوں سے وہ نکلا اور اس دن سے اس کا نک نیم بن گیا۔ پھر ہم نے کبھی اسے مہر نہیں پکارا۔

وہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس میں حیدر کی بہت شباہت تھی، خصوصاً اس کے اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ تو، ہو بہو حیدر کی طرح تھا، مگر بھوری آنکھیں اس نے سونیا کی چرائی تھیں۔

جب موموں نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو اس کا مشغلہ مٹی کھانا بن گیا۔ آنٹی اس کے لیے دنیا بھر کے بہترین کھلونے لاتی تھیں، مگر موموپھر بھی کسی بلی کی طرح رینگ کر لاؤنج سے باہر نکل جاتی اور لان میں کیاری سے مٹی نکال نکال کر کھاتی۔ مجھے جب بھی وہ مٹی کھاتی دکھائی دیتی، میں اسے ڈانٹ دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منع تو نہیں ہوئی، البتہ میری گاڑی پورچ میں داخل ہوتے ہی دیکھ کر وہ مٹی کھانا چھوڑ کر تیزی سے گھٹنوں پر چلتی ہوئی اندر روپوش ہو جاتی۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے صرف ڈانٹتا ہوں۔ اسی لیے جب اس شام میں حیدر کی طرف آیا اور وہ مجھے فراک میں ملبوس کیاری میں بیٹھی نظر آئی تو میں نے قدرے نرمی سے اسے پکارا
''موموا''

مٹی کھاتے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ یکدم رکے۔ اس نے گردن اٹھا کر قدرے فاصلے پر مجھے کھڑے دیکھا تو اس کی مڑی ہوئی پلکوں والی بھوری آنکھوں میں یکدم بے تحاشا خوف سمٹ آیا۔ مٹی چھوڑ کر تیزی سے لڑھکتی ہوئی وہ اندر کی جانب بھاگی تھی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ آنٹی اندر ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اس کو جالیا۔

''آنٹی، یہ مٹی کھا رہی تھی۔''

''ارے حسان آؤ بیٹا۔'' انہوں نے ایک نظر کارپٹ پر بیٹھی مومو پر ڈالی، جو اب ان کے صوفے کا بازو پکڑ کر کھڑی ہونے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔

''بس اب میں کہاں بھاگ سکتی ہوں اس کے پیچھے؟ ذرا ادھر ادھر ہوئی تو یہ باہر نکل جاتی ہے۔'' اس کا منہ دھلا کر لانے کے بعد آنٹی کہہ رہی تھیں۔

میں ہنس دیا، پھر حیدر کے متعلق استفسار کیا۔

''حیدر کے پاس گھر کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ اس کا تمام وقت اپنے آفس کے لیے ہے۔ گھر آتا ہے تو کمرے میں بیٹھ کر آفیشل ورک کرتا رہتا ہے۔ اس نے تو ان تمام مہینوں میں مومو کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔''

انہوں نے گود میں بیٹھی مومو کی جانب تاسف سے دیکھتے ہوئے، اس کے ماتھے پر آئے بھورے بال سنوارے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا حسان! میرے بعد میری موموکا کیا بنے گا۔ میری موموتو رل جائے گی۔'' ان کی نگاہوں اور لہجے میں اضطراب چھلک رہا تھا۔

اس وقت تو میں نے آنٹی کو تسلی دی، مگر اس رات مجھے آنٹی کی باتیں بہت یاد آئی تھیں۔

میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری ممی مجھے تین برس کی عمر میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے دوسرے شوہر مجھے نہیں رکھنا چاہتے تھے، سو میں ساری زندگی بابا کے ساتھ رہا۔ ماں کی محبت کی کمی نے میرے اندر جو خلش چھوڑی تھی، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلا بن گئی تھی اور اسی خلا، اسی خلش اور ذات کے ان ہی اندھیروں پر ہی تو میں یہ کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔ یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، مگر آپ کو ایسے سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ جب تک میری کہانی پوری سن نہیں لیں گے، آپ کو میری منطق، میری تھیوری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اپنی ماں کی جدائی کے بعد میری تھیوری یہ تھی کہ اس دینا کی ہر عورت بے وفا ہوتی ہے۔ عورتیں ہمیشہ آخر میں چھوڑ جاتی ہیں، بے وفائی کر کے تنہا کر جاتی ہیں۔ آپ کو میری بات بری لگے گی، مگر آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننا پڑے گی۔

* * *

''کدھر ہوتے ہو تم حسان؟ اب تو حیدر کی طرح تمہارے پاس بھی ماں کو دینے کے لیے چند منٹ بھی نہیں۔'' مجھے دیکھتے ہی آنٹی نے بے حد شاکی انداز میں کہا۔

''پورے چار مہینے بعد شکل دکھائی ہے اپنی!''

''سوری آنٹی میں کراچی تھا، وہاں پر مسائل ہی اتنے تھے کہ پھنس کر رہ گیا۔'' ان کے اپنائیت بھرے شکوؤں نے مجھے کافی شرمندہ کر دیا تھا۔

موموکافی بڑی ہو چکی تھی، چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی اور تو اور، اب وہ بولتی بھی تھی۔ البتہ مجھ سے ابھی تک ڈرتی تھی۔

اسے دیکھ کر میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھال دی، مگر وہ خاموشی سے اپنی بڑی، بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں آنٹی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے عرصے بعد مل رہا تھا، کچھ میں سنا رہا تھا تو کچھ وہ۔ بولتے بولتے میرا حلق خشک ہو گیا تو میں نے سوچا کہ ذرا بات مکمل کر کے پانی پی آؤں۔

''مانی!'' موموکی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے رک کر بے حد چونکتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا۔ موموا پنے ننھے منے ہاتھوں میں پانی کا گلاس تھامے کھڑی تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''مومو! میں نے پانی نہیں مانگا۔'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اسے میرے لیے پانی لانے کو کس نے کہا تھا۔

''آپ کو پاش (پیاس) لگی ہے؟'' وہ اپنی توتلی زبان میں پوچھ رہی تھی۔ اتنی سی بچی نے اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے پیاس لگی ہے اور وہ دوڑ کر میرے لیے پانی لے آئی تھی۔ میں بے حد شاکڈ تھا۔

''تھینک یو مومو!'' میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے تھام لیا۔

''میری مومو بہت کیئرنگ ہے۔'' آنٹی نے پیار سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ''جیسے ہی حیدر تھکا ہارا گھر آتا ہے، مومو فوراً اس کو پانی پلاتی ہے۔''

مجھ جیسے اپنے آپ سے واسطہ رکھنے والے بندے کو ایک بہت چھوٹی لڑکی کا یہ خیال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔

مومو کچھ اور بڑی ہوئی تو آنٹی کو اسے اسکول میں ڈالنے کی فکر ہوئی۔

''آنٹی! ابھی تو بمشکل ڈھائی سال کی ہوگی، ابھی اسے اسکول مت ڈالیں۔''

''حسان! میں چاہتی ہوں۔ مومو اپنی عمر سے ایک دو برس آگے اسٹڈیز کرلے۔ چلو ابھی اسکول میں نہیں ڈالتے، مگر اسے گھر میں نرسری اور پریپ پڑھا کر ڈیڑھ سال بعد ڈائریکٹ ون میں داخل کرائیں گے۔'' وہ پہلے سے پلان کر کے بیٹھی تھیں۔ ''تمہیں نہیں پتہ، میری مومو بہت سمجھدار ہے۔ اس کا ذہن اس کی عمر سے آگے ہے۔''

آنٹی کا مجھے قائل کرنے کے لیے کہا گیا وہ آخری فقرہ میرے ذہن کے پردوں سے چپک کر رہ گیا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ جو بات میرے ذہن میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی تھی، وہ کبھی نہیں نکلتی تھی۔

* * *

اس روز میں چند کتابیں خریدنے مارکیٹ گیا۔ مطالعہ میرا شوق، میرا جنون تھا۔ کتابوں کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے اعلیٰ ذوق اور کریزی رہا تھا۔ اس روز بھی چند اعلیٰ قسم کی کتابیں خرید کر

میں کاؤنٹر پر کھڑا پے منٹ کر رہا تھا، جب دائیں جانب رکھے ریک پر سجی چند کلرنگ بکس اور اردو انگریزی کے حروف تہجی کے قاعدوں نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی۔

پہلا خیال میرے ذہن میں مومو کا آیا تھا، چنانچہ میں نے چند کتابیں خرید لیں۔

شام کو حیدر کی طرف گیا تو جاتے ہی کتابوں والا شاپر مومو کو تھمایا۔ ''یہ تمہاری ہیں۔''

وہ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور شاپر سے بار بار تینوں بکس نکل کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے سے تھے اور کتابیں بڑی اور موٹی تھیں۔

''تھینک یو۔ پر ان کا کیا کروں؟'' اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے متانت سے پوچھا، اس کی بھوری آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

''ان کو پڑھو۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر معصومیت سے مجھے دیکھا۔

''تم ہی پڑھا دو نا، حسان!'' آنٹی جو کافی دیر سے ہماری ایکٹویٹی دیکھ رہی تھیں، بول اٹھیں۔''

''پڑھا دوں گا، اگر آپ کو میرا روز بروز کا آنا برا نہ لگے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو حسان؟'' وہ برا مان گئیں۔

''یہ تمہارا اپنا گھر ہے، غیروں کی طرح تکلف نہ کیا کرو اور اب تم روز آ کر اس کو پڑھاؤ گے، اس عمر میں مجھ سے یہ پڑھانے والا کام نہیں ہوتا۔'' وہ پھر مومو کی جانب پلٹیں۔

مومو دونوں ہتھیلیاں چہرے کے گرد رکھے، دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''اور مومو! اب یہ حسان انکل آج سے تمہارے سر ہیں ٹھیک ہے؟''

مومو نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یوں اس روز سے میں مومو کا ٹیچر بن گیا۔ اتنے چھوٹے بچے کو پڑھانے کے لیے بہت زیادہ قوت برداشت درکار ہوتی ہے، مگر اپنی عمر سے آگے سوچنے والی سمجھ دار مومو کے ساتھ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوا۔

ہاں وہ سوال بہت کیا کرتی تھی۔

''سر! ہم ہنستے کیوں ہیں؟''

''سر! آسمان بلیو کیوں ہوتا ہے؟ گرین کیوں نہیں ہوتا؟''

''سر! یہ پانی کا کوئی کلر کیوں نہیں ہوتا؟''

''سر! یہ دھاگا کیسے بنتا ہے؟''

اور میں اس کے سوالوں کا جواب ہمیشہ تفصیل سے دیا کرتا تھا۔

''مومو! تمہیں پاپا ٹائم دیتے ہیں؟'' اس روز وہ اسٹڈی روم میں میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی، اپنی کتاب کو ہمارے درمیان رکھی اونچی ٹیبل پر رکھے dotted letters پر پنسل پھیر رہی تھی، جب یونہی میں نے پوچھ لیا۔

''دادو کہتی ہیں پاپا کے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔'' وہ چہرہ اٹھائے اور رکے بغیر بولی۔

''تمہیں برا تو لگتا ہوگا؟'' میں اس کی محرومیوں کی شدت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔'' دادو، کہتی ہیں پاپا از اے بزی مین!'' وہ اتنی سی عمر میں سمجھوتا کر چکی تھی۔

پھر ایک روز جب میں اسے میتھ کے ہندسے سکھا رہا تھا، اس نے پنسل میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری ماما بہت اچھی تھیں؟''

''ہاں، وہ بہت اچھی تھیں۔''

''پھر وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟''

''بھئی، وہ مومو کو ہمارے پاس چھوڑ کر تو گئی ہیں۔'' میں نے اسے بہلانا چاہا، مگر وہ شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

''مگر آپ تو ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔''

میں بے اختیار ہنس پڑا۔'' اگر نہ ڈانٹوں تو تم میری چھوٹی سی پیاری سی فرینڈ بن سکتی ہو؟''

''جی سر!'' اس کی بھوری آنکھوں میں دیئے سے جل اٹھے تھے۔ اس روز سے وہ بہت حساس، سمجھدار، ذہین اور عام بچوں کی طرح ضد نہ کرنے والی مومو میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرتی تھی، یہاں تک کہ جب وہ ڈائریکٹ ون میں داخل ہونے کے بعد اسکول جانے لگی تو شام کو اپنے پورے دن کی روئیداد مجھے سناتی تھی۔

جہاں اس کی پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر تھی، وہاں اس کے اسکول فنکشنز اور پیرنٹ ٹیچر میٹنگز اٹینڈ کرنا بھی میرا فرض بن کر رہ گیا تھا۔

اس طرح وہ میرا خیال رکھتی تھی۔ جس لمحے میں گھر میں داخل ہوتا، وہ بھاگ کر مجھے پانی پلاتی۔، اگر آنٹی کے بصد اصرار میں شام کو کھانا ان کی طرف کھا لیتا تو موموہمیشہ میرے قریب بہت الرٹ سی بیٹھی ہوتی تھی۔ جونہی میں آخری نوالہ لیتا، وہ فوراً اٹھ کر ٹشو کا ڈبہ میرے سامنے کر دیتی۔ مجھے کبھی بھی موموکو کسی بھی چیز کے لیے پکارنے کی عادت ہی نہ پڑی تھی۔ اسی لیے میں ساری عمر سیکھ ہی نہیں سکا کہ اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کو پکارنا ہے۔

''حسان صاحب! بہتر تھا کہ مہر کے فادر آتے۔'' موموکی کلاس تھری کی انچارج (نام مجھے یادنہیں) نے مجھے پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

''وہ ملائیشیا گئے ہوئے ہیں۔''

''کیا وہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں گئے ہوئے نہیں ہوتے؟ خیر، یہ دیکھیں مہر النساء نے کلاس روم کا گل دان توڑ ڈالا ہے۔''

''اس سے غلطی سے ٹوٹا ہوگا، ورنہ وہ خاصی سمجھدار ہے، پھر بھی آپ فائن بتائیں۔'' میں نے جیب میں بٹوے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

''میں نے آپ کو جرمانہ بھرنے کے لیے نہیں بلایا۔''

ناک پر رکھی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے ان کا انداز قطعی اور دوٹوک تھا۔

''مومو نے گل دان توڑ دیا، یہ قابل معافی بات تھی، مگر اس نے بجائے مجھے بتانے کے، ٹوٹے گل دان کی کرچیاں کپ بورڈ میں چھپا دیں۔ وہ تو بعد میں، میں نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتادیا۔''

میں لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔

''مجھے غصہ گل دان پر نہیں، بلکہ اس کا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے پہ چڑھا ہے، وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔''

''میں اسے سمجھاؤں گا میڈم!''

اس شام کو موموکو اپنے سامنے اسٹڈی روم میں بٹھا کر میں کافی دیر لب بھینچے، سنجیدہ نگاہوں

سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"کیا ہوا سر؟" میری نگاہوں کی سنجیدگی سے قدرے خائف ہو کر اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"مومو تم نے واز توڑا ہے؟"

بھوری آنکھوں میں یکبارگی خوف سمٹ آیا۔

"آپ کو کس نے بتایا سر؟"

"مجھے میری بات کا جواب دو۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"مومو۔" میں نے لہجہ قدرے دھیما کر دیا۔

"غلطی سے ٹوٹا تھا۔" اس کی باریک اور معصوم آواز ابھری۔

"پھر تم نے اسے چھپا کیوں دیا؟" اس نے ماتھے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "میڈم ڈانٹتیں اس لیے!"

"اگر تم میڈیم کو سچ بتا دیتیں تو وہ نہ ڈانتیں۔"

"سچ بولنے پر ڈانٹ نہیں پڑتی؟"

"بالکل بھی نہیں!" میں زور دے کر بولا۔

اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"غلط بالکل غلط۔ اس روز حلیمہ کی بیٹی سے گملا ٹوٹ گیا تھا، دادو نے پوچھا تو اس نے بتا دیا، دادو نے اسے بہت ڈانٹا۔ اس نے بھی تو سچ بولا تھا نا؟" وہ میری ٹانگ جتنی لڑکی مجھ سے بحث کر رہی تھی۔

اس کے انداز سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"اور میں نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔ میڈم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے نہیں توڑا۔"

"تم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور یہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔"

"اور آپ بھی تو ہر پیرنٹ ٹیچر میٹنگ پر میڈم کو یہ کہتے ہیں کہ پاپا ملائیشیا گئے ہوئے ہیں، پاپا سنگاپور گئے ہوئے ہیں، یہ بھی تو جھوٹ ہوتا ہے نا؟"

اس کا جملہ بہت غیر متوقع تھا۔

''مومو! پاپا بزی ہوتے ہیں۔'' میں نے بات کا رخ بدل کر اس بچی کو مزید صاف گوئی سے روکنا چاہا۔

''پتہ ہے۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ مجھے لگا وہ چھوٹی سی لڑکی مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟ اسے کیسے مناؤں؟ مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، جانے سے پہلے حلیمہ اسے روز چائے کا ایک کپ پکڑاتی تھی، وہ مجھے لاکر دیتی تھی، مگر میں جانتا تھا۔ اس روز مومو نہیں آئے گی، اسی لیے جانے لگا۔

''سر چائے!'' جانے کس کونے سے نمودار ہوکر اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا، مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

شاید مومو ناراض نہیں تھی۔

یا پھر شاید اسے مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں اسے مناؤں گا۔

* * *

مومو آٹھ برس کی ہوئی تو میں نے اسے رنگین صفحوں والی غالباً سنڈریلا کی اسٹوری بک لا دی۔ اگلی شام جب میں حسب معمول اسے پڑھانے آیا تو اس نے مجھے میتھس کے ٹیبلز سنانے کے بجائے سنڈریلا کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔

''سر...... سنڈریلا کے باپ نے دوسری شادی کیوں کر لی تھی؟'' اس کا معصوم ذہن جو سوالات بناتا تھا، وہ ان کے جوابات مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

اس روز اس نے بالوں کی فرنچ بریڈ بنا رکھی تھی، جب کہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ رنگ تو مجھے یاد نہیں، اب اس بڑھاپے میں، میں ستر کی دہائی میں ہونے والی باتیں باریکیوں کے ساتھ تو یاد نہیں رکھ سکتا نا، بہر حال وہ بچپن میں عموماً اسکرٹس پہنا کرتی تھی جو اس پر بے حد اچھی لگتی تھی۔

''سر! مجھے اور بھی بکس لا دیں۔'' اس نے فرمائش کی، میں نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

پھر آہستہ آہستہ میں مومو کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف لانے لگا۔ میرے گفٹس ہمیشہ

کوئی اسٹوری بک یا کلرنگ بک ہوتے تھے۔

پھر ایک دن آنٹی نے مجھے ٹوک دیا۔ ''حسان وہ اتنی سی ہے، اس کو اتنی کتابیں مت پڑھاؤ۔''

مگر میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ ''رہنے دیں آنٹی! میں تو دیکھ بھال کر اچھی کتابیں ہی لاتا ہوں، جو اسے شعور دیں۔'' تو آنٹی خاموش ہو گئیں۔

اس روز بھی اس کے لیے بک خریدنے میں اسٹور پر گیا تو مجھے اشفاق احمد کی ''ایک محبت سو افسانے'' وہاں نظر آئی، میں نے وہ خرید لی اور اس میں سے دو ایسے افسانے جو ہر لحاظ سے مومو کی عمر کے لحاظ سے معیوب اور غیر موزوں نہ تھے، مارک کر دیئے۔

''یہ دو پڑھ لینا۔'' شام کو اسے کتاب دیتے ہوئے میں نے تاکید کی۔

اس نے عدم دلچسپی سے کتاب اٹھائی، الٹ پلٹ کر دیکھا اور قدرے اداسی سے واپس رکھ دیا۔

''آپ کوئی اور بک لے آتے سر۔'' اسے شاید اتنی گاڑھی اردو والی کتاب میں دلچسپی نہ تھی۔

''شاید پسند نہیں آئی تمہیں۔ مگر پڑھ کر دیکھ لو۔''

''یہ بات نہیں ہے سر!'' اس نے سر جھٹکا، پھر عادتاً میز پر کہنی رکھتے ہوئے بولی ''دراصل میں یہ پڑھ چکی ہوں۔''

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''تم......تم یہ پڑھ چکی ہو؟ کہاں سے لی؟''

''پاپا کی لائبریری سے۔'' وہ بڑے فخر سے مسکرائی۔

''مومو! تم مجھ سے پوچھ کر بکس پڑھا کرو۔''

اس کے لبوں سے مسکراہٹ یکدم معدوم ہو گئی، وہ کہنی میز سے ہٹا کر قدرے مؤدب سی ہو کر بیٹھ گئی۔

''جی سر!''

وہ ڈر گئی تھی، اس لیے نرم لہجے میں اس نے کہا۔

''وہ اس لیے کہ تمہیں ان کا بیک گراؤنڈ وغیرہ سمجھا سکوں۔''

اس کے چہرے پر مجھے قدرے اطمینان دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا، اب وہ مجھ پر اعتبار کرنا

سیکھ لے گی، مگر یہ میری بھول تھی۔ ہاں، یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہی کہ ہم میں سے کسی کو دوسرے پر اعتبار نہ تھا، مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ کو مومو کی پوری داستان سننا پڑے گی۔

* * *

مومو میرے سامنے بیٹھی سائنس کا ہوم ورک کر رہی تھی، میں اخبار پڑھتے ہوئے گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ یکدم مجھے کچھ یاد آیا۔

''مومو!'' میں نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ جو کاپی پر جھکی ہوئی تھی، ہاتھ روک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''جی سر؟''

''تمہارا ٹیسٹ ہو گیا سائنس کا؟''

''جی سر!''

''کتنے مارکس آئے؟''

وہ پل بھر کو خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''وہ تو ٹیچر نے واپس ہی نہیں کیا۔''

میں اکتیس سال کا مرد اور وہ نو سال کی بچی، مجھے صاف پتہ چل گیا، وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

''کھڑی ہو جاؤ!'' ایک دم میں دوست سے ٹیچر بنتے ہوئے درشتی سے بولا۔ وہ ہکا بکا کھڑی ہو گئی۔

''اپنا بیگ کھول کر مجھے دکھاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔ وہ مرے مرے ہاتھوں سے بیگ کھولنے لگی۔ وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ کھول رہی تھی۔ میں نے بیگ اس سے لے کر کھول دیا۔ سامنے سائنس کا ٹیسٹ پڑا تھا۔ میں نے ایک کاٹ دار نگاہ اس پر ڈال کر ٹیسٹ اٹھایا، پھر نمبر پڑھ کر ٹیسٹ اس کے سامنے پھینکا۔

''یہ اس پر 10 میں سے 4 نمبر پڑھ کر مجھے بتاؤ کہ تم نے Nutrition والا سوال کیوں نہیں یاد کیا تھا اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تم نے ٹیسٹ چھپایا کیوں؟'' اس کی یہ غلطی کر کے چھپا دینے کی عادت مجھے خوب تاؤ دلا رہی تھی۔

اس نے سر جھکا دیا۔ ''میں ڈرامہ دیکھنے لگی تھی اور چھپایا اس لیے کہ آپ ڈانتے۔''

''میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ غلطی کر کے اس پر پردے مت ڈالا کرو، مگر تم ہو کہ......'' غصے سے میں اٹھا، میز سے چابی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

مجھے مومو پر شدید غصہ تھا۔

اگلے دو دن میں اسے پڑھانے نہیں گیا، تیسرے روز مجھے ایک عجیب سی فکر مندی ہوئی۔ مجھے اس کو ڈانٹنا نہیں، بلکہ آرام سے سمجھانا چاہیے تھا۔ وہ اتنی اکیلی ہے اور میں......اسی شام میں حیدر کی طرف چلا گیا۔

مومو حسب معمول اسٹڈی میں نہیں تھی، مجھے وہ سر گھٹنوں میں دیئے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی۔ میں چند سیڑھیاں چڑھ کر اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔

''ہیلو چھوٹی لڑکی!''

اس نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی بھوری آنکھوں میں سرخی تھی اور گالوں پر آنسوؤں کے نشانات مجھے یکدم بے چینی سی ہوئی۔

''کیا ہوا ہے مومو؟ تم رو رہی ہو؟'' اس نے نفی میں سر ہلا کر آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑیں۔

''بتاؤ مجھے، کیا ہوا ہے؟'' میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر ایک دفعہ پھر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''مومو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیا میری کسی بات پر ناراض ہو؟'' میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔

''نہیں سر!'' اس کے انکار پر مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ میرا خیال تھا، وہ میرے ڈانٹنے پر رو رہی تھی۔

''پھر؟'' میں نے جانچتی نگاہ سے اسے دیکھا۔

نچلا لب کاٹتے ہوئے وہ اپنے پاؤں کو دیکھنے لگی۔

''مومو!'' میں نے پھر اسے پکارا۔

''سر......ضیا نے......ضیا نے بہت برا کیا ہے۔'' اس کی آواز تھراتی ہوئی تھی۔

''ضیا کون؟ کیا کر دیا اس نے؟'' میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ''جنرل ضیا اور کون سر؟'' اس

نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ضیا نے کل بھٹو کو پھانسی دے دی ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ! موموتم......!'' مجھے اس وقت اس پر شدید غصہ آیا تھا۔''یہ بات تھی جس پر تم نے مجھے اتنا پریشان کیا ہے؟''

''آپ کو افسوس نہیں ہوا سر؟'' اس کے انداز میں حیرت تھی۔

''مومو! یہ پالیٹیکس ہے، تم اتنی سی عمر میں ان سیاست دانوں کو نہیں سمجھ سکتیں اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں بھٹو اتنا پسند تھا۔'' میرا عملی طور پر سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تھا، مگر چونکہ ابو کٹر مسلم لیگی تھے تو ظاہر ہے، میری ہمدردیاں ضیاء کے ساتھ تھیں۔ ایسے میں مومو کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔

''سر مجھے پالیٹکس کا پتہ نہیں، مگر بھٹو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔'' وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا...... یہ تمہاری عمر ہے سیاست میں دلچسپی لینے کی؟ خبردار جو میں نے تمہیں آئندہ اخبار پڑھتے دیکھا۔ اتنا پریشان کیا تھا مجھے اب اٹھو ذرا۔''

''مگر سر......'' میں اس کی ایک بھی سنے بغیر اسے باہر لے آیا۔

''ارے حسان! دیکھو ذرا اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ صبح سے کمرے میں بند ہے۔'' مجھے دیکھ کر آنٹی کو مومو کی اداسی کا خیال آیا۔

''یہ میرے ساتھ کھڑی ہیں محترمہ! کچھ نہیں ہوا، بس ذرا سا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ ابھی ٹھیک کر کے لاتا ہوں۔'' میں مومو کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔

''کدھر سر؟''

''کہیں جا کر تمہیں آئس کریم کھلاتے ہیں، تاکہ تم پر سے یہ سوگ اترے۔'' مجھے ابھی تک غصہ چڑھا ہوا تھا۔

''سر!'' اس نے تاسف سے مجھے دیکھا۔'' آپ کو پتا ہے میں آئسکریم نہیں کھاتی۔''

''اوہ؟'' وہ جتنا میری باتیں یاد رکھتی تھی، میں اتنا ہی بھول جاتا تھا۔ مومو کو میٹھے کے نام پر ہر شے سے الرجی تھی۔

وہ میری زندگی میں آنے والی واحد لڑکی تھی، جو چاکلیٹ کو Too Sweet اور آئس کریم کو

Too Cold کہہ کر رد کر دیتی تھی۔

''چلو چل کر کڑ وی سی کافی پیتے ہیں، وہ تو تم شوق سے پیو گی نا؟'' میرے جلے بھنے انداز پر وہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

* * *

میں نے جوں ہی چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ بھرا، میرے سامنے والے صوفے سے مومو اٹھی اور اندر چلی گئی۔

''حسان شادی کرلو۔'' آنٹی نے اپنا مگ ختم کر کے میز پر رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''اچھا!'' قدرے ہنس کر میں نے چائے کا کپ سائیڈ پر رکھا۔

''ٹالو مت۔ میری نظر میں ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔'' ان کی آواز میں ماؤں کی سی فکر مندی تھی۔

''اچھا کون؟'' میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لبوں تلے رکھی اور لائٹر سے اسے سلگایا۔ اسی پل موموہاتھ میں ایش ٹرے لیے لاؤنج میں داخل ہوئی اور اسے میرے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنی نشست سنبھال لی۔ اسے علم تھا کہ میں چائے کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہوں۔

''عفت آپا کی بیٹی نائمہ۔ اسی سال اس نے ماسٹرز کیا ہے، صورت شکل بھی اچھی ہے اور......'' پھر نائمہ بی بی کی جملہ خصوصیات پر طویل لیکچر دے کر قدرے بے چینی سے انہوں نے استفسار کیا۔

''اب بتاؤ چلاؤں رشتے کی بات؟''

''ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' میں مسکرا دیا۔ نائمہ کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ وہ میری اور حیدر کی سیکنڈ کزن تھی۔ بلاشبہ وہ ایک آئیڈیل لڑکی تھی۔

''کس کے رشتے کی بات دادو؟'' رشتے کا لفظ سن کر مومو نے نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

''تمہارے سر کے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔''

''سر کے۔'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''سر شادی کریں گے؟''

''کیوں؟ کیا شادی کا حق صرف تمہارے ابا کو ہے؟'' یونہی مذاق میرے منہ سے نکل گیا، اگلے ہی پل مومو کے چہرے پر پھیلنے والی ویرانی دیکھ کر بے حد پچھتایا۔

''میرا مطلب تھا.....'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''ماں یاد آ گئی ہوگی۔'' اسے جاتا دیکھ کر آنٹی نے تاسف سے سر ہلا دیا۔

میں ایک دم افسردہ سا ہو گیا، شاید میں نے مومو کو بھی اداس کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کا سوچا، مگر مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔ سو میں بیٹھا رہا۔

چند ثانیے بعد وہ خود ہی واپس آ گئی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں چھپی اداسی کو میں ماں کی موت کا ہرا ہوتا زخم جان کر خاموش رہا۔

نائمہ اور میرا رشتہ اگلے دو ماہ کے دوران طے ہو گیا۔ میں برسر روزگار، ویل سیٹلڈ آدمی تھا۔ اتنا ہینڈسم نہیں تھا، مگر فنانشلی مضبوط تھا اور وہ بھی پڑھی لکھی، خوبصورت اور قابل لڑکی تھی۔ بھلا کس کو اعتراض ہوتا تھا، سب کچھ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ مگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ مومو تھی۔

* * *

اس روز میں نائمہ کو لے کر حیدر کی طرف چلا گیا، میں نائمہ کو مومو سے ملوانا چاہتا تھا۔ مومو دروازے پر ہی ہمیں مل گئی۔

''یہ مومو ہے نا؟'' اسے دیکھ کر نائمہ مسکرائی۔ مومو نے نظریں اٹھا کر اسٹائلش اور طرح دار سی نائمہ کو دیکھا اور پھر میری جانب متوجہ ہوئی۔

''سر! کل میرا انگلش کا ٹیسٹ ہے۔ مجھے تیاری تو کرا دیں پلیز۔'' اس کا انداز عجیب سا تھا۔

''یار! ابھی تو ہم آئے ہیں، اندر تو آنے دو۔'' ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر آگے بڑھا۔ وہ سائیڈ پر ہو گئی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے چند لمحے بعد ہی مومو وہاں آ گئی۔ آنٹی اتفاق سے گھر پہ نہیں تھیں۔ ہم بتا کر نہیں آئے تھے، غلطی سراسر ہماری تھی۔ اب مومو ہی ہماری میزبان تھی۔

''تو یہ ہے مہرالنساء! حسان صاحب کی چھوٹی سی فرینڈ جس نے نسیم حجازی سے لے کر کرشن چندر تک سب کو پڑھ لیا ہے۔'' نائمہ کے انداز میں ستائش تھی۔

مومو نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا، مگر بولی کچھ نہیں۔ اس نے پنک کلر کی شلوار قمیص

پہن رکھی تھی اور لمبے بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ شلوار قمیص میں وہ قدرے مختلف لگتی تھی۔ مگر فی الحال یہ اس کا رویہ تھا، جو مجھے مختلف لگا تھا۔

''ہاں یہی مومو ہے۔ ابھی بے تکلف نہیں ہے نا تم سے، اس لیے بول نہیں رہی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تا کہ نائمہ زیادہ محسوس نہ کرے۔

پھر نائمہ نے اس سے مزید باتیں کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ہوں، ہاں میں جواب دیتی یا خاموش رہتی۔

میں اس کے روکھے رویے کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔

''سر! میرا ٹیسٹ!'' ہم واپس جانے لگے تو اس نے مجھے یاد دلایا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں رک جاؤں اور نائمہ چلی جائے۔

''ہاں میں فارغ ہوا تو شام میں آؤں گا۔''

ہولے سے اس کا گال تھتھپا کر اس کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی نظر انداز کر کے میں آ گیا۔

سسرال میں لنچ تھا، وہاں ایسا پھنسا کہ رات کو دیر سے فارغ ہوا۔ بے اختیار مومو کی طرف نہ جا سکنے کا افسوس ہوا مگر یہ اطمینان تھا کہ اس نے ٹیسٹ خود تیار کر لیا ہوگا۔

یہ چند روز بعد کا قصہ ہے، میں مومو کو اس کے اسٹڈی روم میں انگلش ٹینسز کرا رہا تھا، جب اچانک وہ بولی ''سر!''

''جی؟''

''سر! یہ جو نائمہ آنٹی ہیں نا، یہ...... '' وہ رک گئی۔

''ہاں بولو یہ کیا؟'' میں پین رکھ کر پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آخر میں اس کی نائمہ سے پرخاش کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

''کل ہم ان کے گھر گئے تو میں نے خود سنا سر! وہ اپنے نوکر کو گالی دے کر بلا رہی تھیں۔''

''مومو!'' میں نے اسے گھورا۔

''جھوٹ سب سے بولنے شروع کر دیئے ہیں تم نے؟'' وہ ایک دم ٹپٹا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ نائمہ کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا، وہ خاصی مہذب، شائستہ اور دھیمے لب و لہجہ میں

بات کرنے والی لڑکی بھلا گالی کیسے دے سکتی تھی۔ مجھے مومو پر غصہ آیا تھا۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں، تمہاری نائمہ آنٹی کو۔ یوں کسی کی برائی نہیں کرتے۔ اب ایسی بات نہ کرنا۔'' لہجے کو ہموار رکھ کر بھی میں نے اسے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔ وہ لب کاٹتے ہوئے اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتے رہی۔

صفائی میں ایک لفظ نہ بولی۔

''تمہیں نائمہ آنٹی بری لگتی ہیں مومو؟'' میں نے اب کی بار قدرے نرمی سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''جی...... بہت زیادہ۔'' پھر وہ کاپی پر جھک کر اپنا کام کرنے لگی۔

وہ چھوٹی بچی جسے کسی وجہ سے نائمہ بری لگتی تھی، اس کی ذات سے سچی جھوٹی باتیں منسلک کر کے مجھے بتا رہی تھی۔ بچے عموماً ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ ایسی بڑی بات نہ تھی

مومو میری بہت پیاری دوست اور نائمہ میری ہونے والی بیوی تھی۔ میں دونوں کے درمیان تلخی نہیں چاہتا تھا، اس لیے جب اس روز عفت آنٹی کے یہاں کسی کام سے میں ان کی طرف جانے لگا تو کچھ سوچ کر گاڑی حیدر کے گھر کی جانب جانے والے رستے پر ڈال دی۔ حیدر کی کالونی کی سڑک پر داخل ہوتے ہی مجھے مومو دکھائی دی۔ وہ میری گاڑی سے قدرے آگے سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔ اس نے بلیو Beggy جینز اور سفید آدھے بازوؤں والی کھلی سی ٹی شرٹ کے اوپر بالوں کی لمبی سی فرنچ بریڈ بنا رکھی تھی، میں اس کی پشت پر تھا۔ گاڑی قدرے آگے لے جا کر اس کے ساتھ لے آیا۔ گاڑی دیکھ کر اس نے سائیکل سائیڈ پر کرنا چاہا۔ پھر دفعتاً ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ پڑی تو دوپہر کے ٹائم مجھے وہاں دیکھ کر چونکی۔

''سر! آپ ادھر؟''

''تم اتنی دوپہر میں باہر کیوں پھر رہی ہو؟'' میں نے اپنی جانب کا شیشہ کھول دیا۔ وہ سائیکل روک کر اتر گئی۔

''میں بس رائیڈنگ کر رہی تھی۔ آپ بتائیں، آپ اتنی دوپہر میں کیوں پھر رہے ہیں؟'' وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔

''میں تمہیں پک کرنے آیا ہوں، چلو بیٹھو اندر۔'' میں نے فرنٹ سیٹ کا لاک کھول دیا۔

''اور یہ سائیکل؟''

''اسے بھاگ کر گھر چھوڑ آؤ۔ تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔'' میں نے مصنوعی تحکم سے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا مجھے کافی پلانے لے جا رہے ہیں؟'' کچھ دیر بعد جب وہ سائیکل گھر چھوڑ کر میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو پوچھنے لگی۔

''ارے نہیں، ہم تمہاری نائمہ آنٹی کے گھر جا رہے ہیں۔ عفت آنٹی کو کچھ چیزیں دینا تھیں۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔'' میری وضاحت پر وہ سر ہلا کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

عفت آنٹی کے گھر کی ڈور بیل خراب تھی۔ چونکہ دروازہ کھلا تھا، ہم اندر داخل ہو گئے۔

''تم پہلے آئی ہو ادھر؟''

''جی کئی دفعہ۔'' اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ میں نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ میرے بائیں طرف روش پر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کا سر میرے بائیں بازو کی کہنی تک پہنچ رہا تھا۔

مرکزی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ گولڈن کلر کے خوب صورت ہینڈل پر رکھ کر اسے گھمایا ہی تھا کہ دروازے کی درز سے اندر سے آنے والی بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بشیراں! بشیراں!'' وہ نائمہ تھی اور چلا رہی تھی۔ ''کدھر مر جاتی ہو؟ نشہ کر کے سوتی ہو؟ ادھر آؤ، یہ برتن تمہارا باپ اٹھائے گا؟''

میرے قدم جہاں تھا وہیں تھم گئے۔ میں سن سا ہو کر رہ گیا۔ موموکا ہاتھ ابھی تک ہینڈل پہ تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور بے نیازی سے بولی۔

''See i told you!''۔ اس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ ''مگر آپ کو مومو ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہے۔'' اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ پورا کھولتے ہوئے زور سے ناک کیا۔ ''نائمہ آنٹی! مے وی کم اِن؟'' آج اس کا لہجہ کھردرا یا روکھا نہیں، بلکہ فاتحانہ اور سرخ روئی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ میں خود کو کمپوز کر کے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

نائمہ جو لاؤنج میں صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی، ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے آپ لوگ، آیئے نا۔'' لباس کی شکنیں درست کر کے اس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا۔

''دراصل بیل خراب تھی، اس لیے ہم بلا جھجک اندر آ گئے۔ آنٹی کہاں ہیں؟ ان کی چیزیں دینا تھیں۔'' میں نے کھڑے کھڑے وضاحت کی، جب کہ مومو بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ممی تو سو رہی ہیں، ٹھہریں میں اٹھاتی ہوں۔'' وہ اپنی مصنوعی شائستگی سے کہتے ہوئے اندر جانے لگی، مگر میں نے فوراً روک دیا۔

''نہیں انہیں مت اٹھائیں۔ بس بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔ چلو مومو!'' میں نے مومو کو پکارا، جو بڑی خوشی خوشی نائمہ کے لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔

''آپ لوگ بیٹھیں تو سہی۔'' اس نے صوفے پر رکھے کشن درست کیے۔

''نہیں تھینکس نائمہ! ہم چلتے ہیں۔ مومو کی ٹیوشن کا وقت ہونے والا ہے، چلو مومو!'' میں نے صوفے پر استحقاق سے بیٹھی مومو کو گھورا۔

''کوئی بات نہیں سر! کل کوئی ٹیسٹ نہیں ہے۔ آج چھٹی ہو جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے اطمینان سے مدبرانہ انداز میں کہا۔

''بہت شوق ہے تمہیں چھٹی کا، چلو اٹھو۔'' بوکھلائی گھبرائی نائمہ کو خدا حافظ کہہ کر میں مومو کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ واپسی پر تمام راستہ ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میں نے گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے روکی تو اس نے اترنے کے لیے لاک کھولا۔

''مومو!'' میری آواز پر وہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی۔ ''جی سر؟''

''جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، تب تم نے کیوں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟'' میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے اپنی مڑی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔

''سر! دادو کہتی ہیں جو لوگ سچے ہوتے ہیں انہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سر! خلیل جبران کہتا تھا، اس نے کہا میں نے مان لیا، اس نے زور دیا، مجھے شک گزرا، اس نے قسم کھائی، میں نے کہا، یہ تو جھوٹ بولتا ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''پھر بھی سر! آپ کو میں ہمیشہ

جھوٹی ہی لگتی ہوں۔"

"مگر مومو......"

"میں جاؤں سر؟"

میں نے ایک گہری سانس اندر کو کھینچی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جاؤ۔"

"خدا حافظ سر!" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

※ ※ ※

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے، جب عفت آنٹی نے سرسری طور پر مجھ سے حسن کی آمد کا تذکرہ کیا۔

حسن نائمہ کا ماموں زاد تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا جین آسٹن کا کوئی ہیرو ہوتا ہے۔ بے تحاشا دولت مند، بہت خوبصورت اور شاندار پرسنالٹی رکھنے والا۔ حسن امریکہ میں سیٹلڈ تھا۔ اس کا اور اس کے والد کا وہاں کین فوڈ کا وسیع و عریض بزنس تھا۔ وہ دونوں سال دو سال بعد پاکستان کا چکر لگا ہی لیتے تھے، مگر اس دفعہ کچھ خاص وجہ تھی۔

آنٹی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا، مگر بہر حال میں کوئی بچہ تو تھا نہیں۔ تینتیس سالہ میچور مرد تھا۔ اتنا تو بہر حال جان گیا تھا کہ حسن کے والد احمد مراد نے نائمہ کا رشتہ، میرا اور نائمہ کا رشتے طے ہو جانے کے چند روز بعد مانگا تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے لاعلم تھے کہ میرا رشتہ نائمہ کے والدین قبول کر چکے ہیں چونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی تھی، اس لئے نائمہ کے گھر والوں نے ہمارا رشتہ اوپن نہیں کیا تھا۔ اس کے ماموں کو ان کے اصرار پر اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے سمیت پاکستان پہنچ گئے۔ میں نے ان دنوں نائمہ کے گھر جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔

اور پھر جب میں اس روز موموکو پڑھانے گیا تو آنٹی مجھے قدرے بجھی بجھی لگیں۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا بتاؤں حسان! اتنے چاہ سے تمہارا رشتہ کرایا تھا، پہلے تو وہ لوگ راضی تھے، مگر اب کھنچے کھنچے لگ رہے ہیں۔ عفت آپا کو کل فون کیا تو منگنی کی بات پر دہ کہنے لگیں، پھر دیکھا جائے گا، ابھی تو رشتہ بھی پینڈ نگ میں ہے۔ لو بھلا پہلے خود وہاں کی تھی اور اب پینڈ نگ ہو گیا۔''

''جانے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ اسی

اثناء میں حیدر داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں کوٹ تھا۔

''کیسے ہو حسان؟'' وہ تھکی تھکی آواز میں پوچھتا میرے مقابل بیٹھ گیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، آنٹی البتہ پریشان ہیں۔'' اس نے ماں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ آنٹی نے الف سے یے تک تمام قصہ کہہ سنایا۔

''ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں، وہ نائمہ کا کزن نہیں ہے، کیا نام ہے اس کا؟'' حیدر نے آنکھیں میچ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

''حسن'' میرے لبوں سے پھسلا۔

''ہاں حسن، یہ اس کی دولت کی چمک ہے۔ مجھے نہیں لگتا، اب عفت آنٹی حسان کے رشتے والی بات یاد بھی رکھیں گی۔''

''لو یہ کوئی کاروبار ہے؟ حیدر میاں جہاں وعدے کر کے توڑ دیئے جائیں! آپا نے ہمیں زبان دی تھی۔ اگر بھانجا اتنا ہی پیارا تھا تو پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ اس وقت تو بہت خوشی خوشی میرے حسان کا رشتہ قبول کیا تھا۔'' وہ بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

حیدر نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ''ممی بہت بھولی ہیں۔''

''پاپا جوس۔'' مومو کسی بوتل کے جن کی طرح تازہ اورنج جوس کا گلاس تھامے حیدر کے قریب نمودار ہوئی۔

''تھینک یو بیٹا!'' حیدر نے گلاس لے لیا۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ خوش دلی، شفقت، اپنائیت سب تھا، اس میں، بس محبت نہیں تھی، یا پھر وہ اتنی میکانکی زندگی گزارنے لگا تھا کہ محبت ہوتی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

میں نے مومو کا چہرہ دیکھا، وہاں کوئی رنج، کوئی افسوس نہیں تھا۔ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

***

حیدر اور آنٹی کی باتوں کے باوجود میں نے حسن مراد کی آمد کو نظر انداز کیا تھا، مگر پھر نائمہ کا میرے آفس فون آیا۔

مجھ وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔20 جولائی 1981ء دن گیارہ بج کر پچیس منٹ۔ وہ وقت میرے دماغ پر ثبت ہو کر رہ گیا۔

میں چاہوں بھی تو نائمہ کی وہ کال نہیں بھلا سکتا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا، لیکن ابھی آپ کو سمجھ نہیں آئے گا۔ آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

''حسان!'' اس نے بہت شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔'' آپ بہت اچھے ہیں اور کوئی بھی لڑکی آپ کے ساتھ پر فخر کر سکتی ہے، لیکن میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ میں بچپن میں بہت سی چیزوں کے لیے ترسی تھی، جن میں ایک آسائشات کی فراوانی بھی تھی۔ گو اب ہمارے حالات بہت اچھے ہیں، مگر میں بچپن کے وہ چند سال کبھی نہیں بھول سکتی، جب ابو کی نوکری چھوٹی تھی اور ہم نے اپنا گھر بیچ ڈالا تھا۔'' اس نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی سانس کے اخراج کی آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔

''حسان! میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی ڈیزائن وئیر اور قیمتی جیولری صرف شاپس میں سجی دیکھ سکیں اور پھر ان سے فقط اپنے خواب سجا پائیں۔ میں نے خواب سجائے تھے، میں ساری زندگی صرف خوابوں پر گزارا نہیں کرنا چاہتی۔ یونانی کہاوت ہے خوش قسمتی کی دیوی آپ کے دروازے پر صرف ایک دفعہ دستک دیتی ہے۔ میرے دروازے پر وہ دیوی دستک دے رہی ہے۔ پلیز مجھے زندگی سے اپنے لیے کچھ حاصل کر لینے دیں......''

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی، مگر میں نے فون رکھ دیا، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

نائمہ سے مجھے کوئی افسانوی قسم کا دھواں دھار سا عشق نہیں تھا، وہ تو ایسی تھی، جیسے راہ چلتے بہت سے لوگ مل کر بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ تو اسی دن میرے لیے بہت عام ہو گئی تھی، جب میں نے اس کی'' شائستگی'' سنی تھی۔ وہ تو کبھی بھی خاص نہیں تھی۔

میرے لیے صرف ایک شے خاص تھی۔ وفا اور صرف وفا۔ میری ماں مجھے بچپن میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک عورت کی اس بے وفائی نے میرے اندر جو خلش رکھ چھوڑی تھی، وہ میں کسی دوسری عورت کی وفا سے پر کرنا چاہتا تھا مگر۔

20 جولائی کی اس گرم دوپہر کو مجھے علم ہوا تھا کہ عورت تو بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی میری ماں مریم نثار کی دوبارہ گھر بسانے کی خواہش کی صورت میں اور کبھی نائمہ سعید کی زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا کی صورت میں، بے وفائی رنگ بدلتی ہے مگر میں اسے ہر روپ میں پہچانتا تھا۔

جانتا ہوں آپ لوگوں میں سے بہت سوں کو میری بات سخت ناگوار گزرے گی، مگر میں نے کہا نا آپ میری تھیوری، میری منطق، میری دلیل ابھی نہیں سمجھ سکتے۔

میں پھر کہوں گا کہ آپ کو میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

* * *

نائمہ سے منگنی میں نے اس شام توڑ دی، آنٹی نے خاموشی سے میری بات سنی اور اسی وقت عفت آنٹی کو فون کر کے سب کچھ توڑ ڈالا۔

نائمہ کی شادی اسی سال سردیوں میں ہوگئی۔ وہ چند ہفتوں بعد امریکہ شفٹ ہوگئی اور جن دنوں موموth8 میں تھی، نائمہ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں کی پیدائش ہوئی۔ نائمہ خواب و خیال، حال یا مستقبل میں کہیں بھی نہیں تھی، مگر اس کی عطا کردہ خلش کسی درخت سے چمٹی امربیل کی طرح ساری زندگی میرے ساتھ رہی۔

جس روز موموکا8th کلاس کا رزلٹ آنے والا تھا، اس نے مجھے آفس فون کیا۔

''سر! آپ نے اخبار دیکھا؟'' اس کی آواز میں اتنی خوشی اور جوش تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''سر میں نے فیڈرل بورڈ میں ٹاپ کیا ہے، اخبار دیکھیں نا!'' میں سارے کام چھوڑ کر اپنے نک چڑھے باس کی پرواہ کیے بغیر حیدر کے گھر چلا آیا۔

وہ جولان میں اخبار گود میں رکھے بیٹھی تھی، میری گاڑی گھر کی حدود میں داخل ہوتے دیکھ کر بھاگتی ہوئی، میرے پاس آئی۔ ''سر! آپ آگئے؟''

اس کی سنہری رنگت شدت جذبات سے گلنار ہو رہی تھی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ وہ ہنس رہی تھی۔

اس لمحے اپنی گاڑی سے لان تک چلتے ہوئے بارہ سالہ مومو کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ ''خوشی'' ایک مجسم صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔

''سر...... یہ اخبار دیکھیں نا، میں نے ٹاپ کیا ہے۔'' اس نے اخبار آگے کرتے ہوئے وہ سطر مجھے دکھائی جہاں ''مہرالنساء حیدر'' جگمگا رہا تھا۔

اس کی پرجوش کیفیت پر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا رزلٹ دیکھنے کے لیے اخبار نہیں، اس کا شفق رنگ چہرہ ہی کافی تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے مومو!'' اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا نام پڑھتے ہوئے میں نے خوشی سے مخمور لہجے میں کہا۔ اس لمحے مجھے مومو کا ٹیچر ہونے کی حیثیت سے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔

''مہرالنساء، آئی ایم سو پراؤڈ آف یو!'' میں نے اس ننھی پری کا گال تھپتھپایا۔ ''اینڈ آئی لو یو سو مچ!'' اس کی مسکراہٹ ایک لمحے کو وہیں تھم گئی، وہ ایک دم تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

"You do sir"۔ اس کے لہجے میں بے حد خوشگوار حیرت تھی۔

''آف کورس!'' میں مسکرایا۔ ''ہماری مومو ہے ہی اتنی اچھی، اس سے سب ہی پیار کرتے ہیں۔''

وہ ایک دم بہت کھل کر ہنسی جتنی خوشی اسے میرے اس جملے پر ہوئی تھی، اتنی تو شاید اپنے رزلٹ پر بھی نہیں ہوئی تھی۔

''ٹھہرو میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔'' میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر رکھا، سرخ گلابوں کا بوکے اور بند پیکٹ اٹھایا، جو میں نے راستے میں سے ہی لیا تھا۔

''یہ تمہارا گفٹ، میں جلدی میں یہی لا سکا ہوں۔''

''اوہ سر!'' فرط جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے دونوں چیزیں تھام لیں، پھول بہت تھے سر!'' اس کے انداز میں تشکر تھا۔

''پھول بہت نہیں تھے، یہ تو مرجھا جائیں گے، مگر یہ گفٹ تو تمہارے پاس ہمیشہ رہے گا۔'' میری مادہ پرست سوچ کی پرواز یہیں تک تھی۔

''مرجھانے سے کیا ہوتا ہے سر؟ ان کی خوشبو، ان کا اثر اور سب سے بڑھ کر ان کی تیج نہیں

ختم ہوتا۔" سرخ گلابوں کے بکے کو چہرے کے قریب لے جا کر اس نے آنکھیں موند کر اسے سونگھا۔

"اچھا کھولو تو سہی۔ بتاؤ تو سہی تمہیں کیسا لگا ہے۔" میں نے اس کی بات پر غور نہیں کیا، میں نے کبھی بھی موموکی بات پر غور نہیں کیا تھا۔

وہ پھول گاڑی کی چھت پر رکھ کر وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے احتیاط سے ریپر کھولنے لگی۔ میں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر اس کی ایکسائٹمنٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"واؤ!" لائٹ پنک کلر کی ڈائل والی خوبصورت گھڑی اس کو بہت پسند آئی تھی۔ اس نے جھٹ اس کو کلائی پر پہنا۔

"یہ اسٹریپ بند کر دیں سر!" اس نے معصومانہ انداز میں کلائی میری جانب بڑھائی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پنک کلر کا اسٹریپ بند کر دیا۔

"کتنی اچھی ہے نا، تھینک یو سر!" مختلف زاویوں سے گھڑی کو اپنی دودھیا کلائی پر سجا دیکھنے کے بعد اس نے بہت تشکر سے کہا تھا۔

"ارے یہ تو کچھ نہیں ہے۔ کارنامہ تو تم نے انجام دیا ہے۔ اچھا اب اندر آنے دو۔ کب سے ہم پورچ میں کھڑے ہیں اور حیدر کہاں ہے؟" اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

"پاپا اپنے بیڈروم میں۔"

ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اس سے حیدر کی جانب سے ملنے والے تحفے کے متعلق پوچھوں مگر پھر بھی مجھے خیال آیا کہ حیدر کے پاس اسے دینے کے لیے ایک نرم مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

* * *

"آپ بیٹھیں، میں ذرا نوڈلز لے آؤں۔" مجھے اسٹڈی روم میں بٹھا کر وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکنا چاہا۔

"یہ کھانا پینا بعد میں ہوتا رہے گا، ابھی تو بیٹھو۔"

"نہیں سر! پھر وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ دوبارہ گرم کی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے۔" وہ کہہ کر چلی گئی اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

جب سے مومو نے چودھویں سن میں قدم رکھا تھا، اسے کوکنگ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بقول آنٹی کے، وہ حیدر یا ان کے لیے نہیں، صرف میرے لیے کبھی چائنز تو کبھی دیسی مرغن کھانے بناتی تھی۔ شاید اس کا یہ شوق اس دن کے بعد پیدا ہوتا تھا، جب میں نے اسے باتوں باتوں میں کہا تھا۔

''مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے۔''

وہ نوڈلز لینے گئی تو میں قدرے فراغت سے اسٹڈی روم کا جائزہ لینے لگا۔

میری اور مومو کی کرسی کے درمیان بچھی میز پر رکھے مومو کے اسکول بیگ کی زپ کھلی ہوئی تھی، جس میں سے ایک رنگ برنگی سی کتاب جھانک رہی تھی۔ میں نے قدرے متجسس سا ہو کر وہ کتاب، جو دراصل ایک کلرفل سی ڈائری تھی، نکال لی۔ مومو ڈائری نہیں لکھتی تھی، میں نے پہلا صفحہ کھولا۔

وہاں "Amna Ikram's Scrap Book" لکھا تھا۔

وہ اس کی دوست آمنہ اکرام کی اسکریپ بک تھی۔ جو اس نے یقیناً مومو کو فل کرنے کے لیے دی ہوگی۔ چونکہ وہ ایک قطعاً غیر پرائیویٹ شے تھے، اس لیے میں اس کے صفحے الٹ پلٹ کر پڑھنے لگا۔

ایک صفحے پر آ کر میں ٹھٹک کر رکا، صفحے کے اوپر نیلے مارکر سے Your First Crush لکھا تھا۔ نیچے آدھا صفحہ فل تھا، جس میں ہر سطر میں لڑکیوں نے اپنے نام کے سامنے اپنے Crushes لکھ رہے تھے۔ میں نے صفحے کے وسط میں آخری لکھی ہوئی سطر پڑھی۔ "Mehrun Nisa My first Crush was zulfiqar ali Bhutto"۔ میں نے اسکریپ بک بند کر کے اسے میز پر واپس رکھ دیا، چند برس پہلے سوچی گئی ایک خام خیالی آہستہ آہستہ میرے شک میں بدلتی جا رہی تھی، آہٹ پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا، مومو ہاتھ میں بھاپ اڑاتے نوڈلز کے پیالوں سے سجی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔

میں نے قدرے بے توجہی سے نوڈلز کھایا۔

''آپ کو اچھی نہیں لگی؟'' مومو اور دوسرے کی عدم دلچسپی محسوس نہ کرے، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا چہرہ پل بھر میں اتر گیا۔

''نہیں یہ بہت اچھے ہیں مگر مجھے تم سے بات کرنی تھی۔'' میں نے پیالہ میز پر رکھا دیا۔

''کیا بات ہے سر؟'' اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''مومو، میں نے یہ اسکریپ بک پڑھی ہے، یو ڈونٹ مائنڈ اِٹ رائٹ؟''

''ناٹ ایٹ آل سر!''

''تم نے لکھا تمہارا فرسٹ کرش ذوالفقار علی بھٹو تھا، رائٹ؟'' سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''جی سر!'' وہ اب کچھ الجھی تھی۔

''مومو تمہاری عمر کیا ہے؟''

''چودہ سال۔''

''اور تمہارا خیال ہے تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں؟''

''سر، یہ صرف ایک مذاق تھا، فرینڈز کے درمیان ایک ہلکا پھلکا سا مذاق۔''

''یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کے بجائے اپنی عمر کے مطابق فیشن، کپڑوں، جیولری اور مہندی کے ڈیزائنوں میں دلچسپی لیا کرو، اپنی عمر سے آگے بھاگو گی تو تھک جاؤ گی، مومو!'' وہ سر جھٹک کر کتابیں کھولنے لگی۔ یہ اس کا خفگی کا اظہار تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر ٹھنڈے ہوتے نوڈلز کے پیالوں کو دیکھا، جن کی تعریف میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھی نہیں کی تھی۔

***

''مومو جانتی ہو، تمہارے ہاتھوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

اس روز اس کی لمبی، پتلی، آرٹسٹک انگلیوں کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دی۔

''جی...... یہی کہ میں پینٹر یا سرجن بنوں گی۔''

''میڈیکل میں تو تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے...... آرٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟''

اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، پھر پین لبوں میں دبا کر کچھ سوچ کر بولی۔ ''میں اکثر اسکیچز بناتی رہتی ہوں، دکھاؤں آپ کو؟''

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مومو پہلی دفعہ کوئی بات میرے علم میں لائے بغیر کرتی رہی تھی۔ ورنہ وہ تو ہر کام مجھے بتا کر کرتی تھی۔

''اور تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔'' میں نے خفگی سے شکوہ کیا۔

''وہ بہت اچھے نہیں ہیں۔'' وہ جھینپ گئی۔

میں نے میز پر رکھا اخبار منہ کے آگے کر لیا۔ اس نے اخبار کھینچ لیا۔

''میں کوئی مائیکل اینجلو نہیں بن گئی، جو آپ کو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے صرف دو چار تصویریں بنائی ہیں، وہ بھی ماشاءاللہ اتنی بھیانک ہیں کہ آپ مروت میں بھی تعریف نہیں کریں گے۔ اس لیے زیادہ خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ نے خفگی دکھائی تو پھر ٹھیک ہے!'' وہ بڑے بے نیاز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''میں بھی نہیں دکھاؤں گی۔''

اس کے اسٹائل پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ''اچھا جاؤ، لے کر آؤ۔'' وہ بے نیازی ختم کر کے فوراً اندر بھاگی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہوئی تو ہاتھ میں ایک کاپی تھی۔

''یہ...... اتنے اچھے نہیں ہیں۔'' اس نے قدرے تذبذب سے کاپی میری جانب بڑھائی۔

وہ جنہیں چار تصویریں کہہ رہی تھی، وہ تقریباً 20 کے قریب تھیں اور بہت اچھی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ وہ اینجلو ٹائپ کا آرٹ نہیں تھا، مگر اس کی عمر کے لحاظ سے اس نے کافی اچھا بنا لیا تھا۔

اس کی پینٹنگز دیکھ کر مجھے بے اختیار کچھ یاد آیا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی ہیں مومو! بہت زیادہ، تم کوئی آرٹ اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟''

میں نے اسے مشورہ دیا، مگر اس کا ایسا ارادہ نہیں تھا۔

''سر! ابھی میرا میٹرک تو ختم ہو جائے۔ یہ پینٹنگ وغیرہ تو ساری عمر ہوتی رہے گی۔'' اس نے بات ہی ختم کر دی۔

میں اس کے اندر کے مصور کو باہر نکالنا چاہتا تھا، اس لیے میرے اصرار پر اس نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر اسکیچز بنانے شروع کر دیے۔ میں نے اسے کئی دفعہ کہا کہ وہ میرا اسکیچ بنائے، مگر وہ ٹال جاتی۔

***

اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام میں اس کی طرف معمول سے قدرے پہلے آ

گیا۔ پیپرز میں، میں اسے ٹیوشن نہیں پڑھاتا تھا، اس لیے اب کافی دنوں بعد آج آیا تھا کہ دیکھ لوں، اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

ویسے مجھے علم تھا کہ اس کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج بھی ماضی پر نگاہ ڈالوں تو سوچتا ہوں کہ روزانہ شام کی وہ ایک گھنٹے کی ٹیوشن تو محض ایک فارمیلٹی تھی۔ ورنہ وہ زمانہ ٹیوشنز کا ہرگز نہ تھا۔ مجھے اور موموکو روز شام میں ایک ساتھ بیٹھنے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ اب ہم بھولے سے بھی ٹیوشن ختم کرنے کا نہیں سوچتے تھے۔

اوہ میں بھی بات کرتے کرتے کدھر نکل جاتا ہوں، بوڑھا ہو گیا ہوں نا، بڑھاپا انسان کو قدرے سنکی کر دیتا ہے۔ اب تو یادداشت بھی نہیں رہی۔ اس لیے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔

خیر، میں آپ کو مہرالنساء کی کہانی سنا رہا تھا اور شاید اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام کا تذکرہ کر رہا تھا۔

''سر......! آپ اتنے دنوں بعد!'' وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں بھئی تیاری ہوگئی پریکٹیکل کی؟'' میں بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔'' کاپی کمپلیٹ ہے؟ میڈم کے سائن کرا لئے ہیں؟''

''جی سر! سب کچھ کمپلیٹ ہے۔ آپ یہ سیب لیں نا!'' سیبوں کی پلیٹ میری جانب کھسکا کر وہ فریج کی طرف بڑھی۔

''میں نے تو پیپرز سے بھی پہلے سائن کرا لیے تھے۔'' فریج میں سے انگوروں کا لفافہ نکالتے ہوئے وہ بتانے لگی۔

''ویٹس گڈ!'' میں نے سیب کی قاش منہ میں رکھی۔

تمام انگور اس نے ٹوکری میں ڈال کر سنک کے آگے رکھے اور پھر اچھی طرح دھو کر اور پانی نتھار کر میرے سامنے پر رکھ دیئے۔ اس کو علم تھا کہ میں سیب سے زیادہ انگور شوق سے کھاتا ہوں۔

''لیں نا، سر!'' اس نے ایک صاف پلیٹ بھی میرے سامنے رکھی۔

''لیتا ہوں۔ تم ذرا ایک دفعہ مجھے پریکٹیکل نوٹ بک دکھا دو، میں اپنی تسلی کر لوں!'' میں انگوروں کے گچھے سے انگور توڑنے لگا۔

''وہ تو سر۔'' اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے مجھے دیکھا۔

''وہ صدف نے مجھ سے مانگ لی تھی، اس کو کچھ ڈائیگرامز بنانی تھیں۔''

''مومو!'' میں نے بے یقینی سے مومو کو دیکھا۔ ''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ تم نے کاپی صدف کو کیوں دے دی؟ کوئی پیپر سے پچھلے دن بھی کاپی دیا کرتا ہے؟'' مجھے اس کی نرم دلی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ''کل اگر وہ کاپی نہ لائی اور تمہارا کوئی سخت قسم کا ایگزامینر آ گیا تو وہ تمہیں فیل کر دے گا۔''

''وہ لے آئے گی سر! اس بے چاری نے چند ڈائیگرامز بنانی تھیں۔''

''سارا سال کیوں نہ بنائیں اس نے ڈائیگرامز؟''

''اس کی کوئی مجبوری ہوگی سر!'' وہ مطمئن تھی۔

''اور اگر وہ نہ لائی تو؟ تم کیا کرو گی پھر؟'' مجھے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔

مومو نے ایک لمحے کو خاموشی سے میرا چہرہ دیکھا، پھر بولی۔

''سر! جب اس نے کہا کہ وہ لے آئے گی تو وہ لے آئے گی۔ دنیا اتنی بھی بے اعتبار نہیں ہوئی، آپ یوں خوامخواہ ہر کسی پر شک نہ کیا کریں۔''

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ ''شک؟ میں بھلا کب شک کرتا ہوں؟''

''سر آپ اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، آپ کو ہر بندے پر شک ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکا دے گا، حتیٰ کہ مجھ پر بھی۔'' وہ بہت آرام سے انگور کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اسی لیے کہہ رہی ہوں، یوں شک نہ کریں وہ لے آئے گی۔''

مومو کی بات درست نکلی، اس کی کلاس فیلو صدف واقعی اگلے دن کاپی لے آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی، غیر اہم بات تھی، مگر اس چھوٹی سی غیر اہم بات نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ مجھے اس دنیا میں...... کسی پر اعتبار نہیں، حتیٰ کہ مومو پر بھی نہیں۔

* * *

اس روز تو معجزہ ہی ہو گیا۔

صبح چھ بجے کے قریب، جب میں اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر موجود پارک میں پتھریلی روش پر جاگنگ کر رہا تھا، مجھے سامنے سے مومو آتی دکھائی دی۔

"ہیلو سر" میرے مخالف سمت سے آتی، بلیو جینز اور شرٹ میں ملبوس مومو نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بھاگ کر میرے اور اپنے درمیان موجود فاصلہ طے کیا، پھر میرے پاس پہنچ کر رخ اس طرف کرلیا، جس طرف میں بھاگ رہا تھا۔

"وعلیکم ہیلو لٹل گرل!" میں اسے اپنے بائیں جانب بھاگتے دیکھ کر بے اختیار مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم جاگنگ کرنے لگی ہو۔"

میری دائیں جانب گھاس پر چند لڑکے بیٹھے ایکسرسائز کر رہے تھے۔ چند خواتین بھی معمول کے مطابق واک کر رہی تھیں، پارک میں روزانہ کی طرح رونق تھی، مگر مجھے صحیح معنوں میں رونق آج لگی تھی، کیا مجھے وجہ بتانے کی ضرورت ہے؟

"صبح جلدی اٹھنا بہت مشکل کام ہے سر! مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے جاری رکھ پاؤں گی۔" وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہی ہانپ گئی تھی۔

"آپ کو اکیلے بھاگنا ہے تو شوق سے بھاگیں، ورنہ مجھے جوائن کرلیں، وہ ایک بنچ کی جانب بڑھتے ہوئے بولی تو میں بھی اس کے پیچھے آگیا۔

"تم میری روٹین خراب کر رہی ہو لڑکی! اتنی ینگ ہو اور ایک چکر بھی نہیں لگایا اور میں تم سے عمر میں اتنا بڑا ہوں، پھر بھی روز یہاں کے آٹھ چکر لگاتا ہوں۔"

"ارے سر! بندے کا دل جوان ہونا چاہیے، عمر سے کیا ہوتا ہے۔" اس کے انداز میں لاپروائی تھی، پھر تنفس بحال کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "گھر جا رہی ہوں، کالج بھی جانا ہے۔"

وہ ان دنوں فرسٹ ائیر میں تھی۔

"یوں کرو، میرے گھر چلو اور کافی پیو۔" کافی اور کتابوں کے معاملے میں میرا اور مومو کا ذوق ایک سا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے!" واپسی پر ہم بھاگنے کے بجائے چل رہے تھے۔ اب وہ میرے دائیں جانب تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو دیکھا۔ وہ مجھ سے کتنی چھوٹی، کتنی نازک سی تھی۔ اس کا سر میرے کندھے سے بھی نیچے آتا تھا۔

"ایک بات پوچھوں سر؟" قریب لگے ایک درخت کی ٹہنی سے پتا توڑ کر دونوں ہاتھوں میں لیے، وہ اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔

''اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ کہیں آپ مائنڈ نہ کر جائیں۔'' اس نے ایک گہری سانس بھری۔

''پوچھو۔''

''آپ کو نائمہ آنٹی یاد ہیں؟''

میں نے نظر اٹھا کر حیرت سے اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھا۔ وہ پتے کے ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں روش پر پھینک رہی تھی۔

''ہاں تھوڑی بہت!''

''سر! آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ آپ نے منگنی کیوں توڑی تھی؟''

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں پتے پر تھیں، جواب تک آدھا رہ گیا تھا۔

''میں بہت امیر نہیں ہوں موموا اور میری ہمراہی میں اس کی بہت سی خواہشات تشنہ رہ جاتیں۔ اس کے پاس مجھ سے بہتر چوائس تھی۔''

''یعنی اب آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟'' وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں اور ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔ وہ اب میرڈ ہے۔''

کل داود نے مجھے بتایا کہ ان کے ہزبینڈ نے ان کے بچے چھین کر ان کو طلاق دے دی ہے۔''

''واٹ؟'' میں نے رک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''مگر کیوں؟''

''وہ ان کے کریکٹر پر شک کرتا تھا۔'' مومو سر جھکائے بتا رہی تھی، میرے تھمے قدم چلے تو وہ بھی ساتھ چل دی۔ ''وہ اب واپس آ گئی ہیں، اب آپ......؟''

''وہ چیپٹر کلوز ہو چکا مومو! وہ ایک بے وفا عورت تھی اور ہے، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بے وفائی نہیں۔'' میری بات پر اس نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ''او کے سر'' کہہ دیا۔

پارک سے نکل کر مومو نے اپنے سائیکل کو ان لاک کیا، پھر دونوں ہاتھ اس کے ہینڈلز پر رکھ کر اسے ساتھ چلاتے ہوئے پیدل میرے ہمراہ میرے گھر کی جانب چل پڑی۔

''آپ کی اس گھر کے ساتھ کوئی پرانی دشمنی چل رہی ہے کیا؟'' میرے لونگ روم میں

کھڑے ہوکر کافی دیر تک اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے حد معصومیت سے پوچھا تھا۔

لونگ روم کے صوفوں کا کپڑا میلا ہو رہا تھا، سینٹر ٹیبل پر رات کے کھانے کے برتن جوں کے توں رکھے تھے، لونگ روم سے ملحقہ اوپن کچن کے کاؤنٹر پر تولیہ بھی پڑا تھا۔ میں نے قدرے شرمندگی سے اسے دیکھا۔

''سوری چھوٹی لڑکی! اگر میں ایسے ہی رہتا ہوں۔''

وہ لونگ روم میں رکھے برتن اٹھا کر کچن میں بنے سنک میں رکھنے لگی۔

''میں ذرا چینج کر آؤں، تم بیٹھو۔'' اس کو وہیں چھوڑ کر میں آفس کے لیے تیار ہونے چلا گیا، تھوڑی دیر بعد نہا دھو کر تولیے سے بال رگڑتے ہوئے نکلا تو یکدم اپنے بیڈ روم کی دہلیز پر رک گیا۔

لونگ روم کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ تمام چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں، ان ڈور پلانٹس کو پانی دے کر ان کی جگہیں تبدیل کر دی گئی تھیں، میلے برتن اب چمکتے دمکتے اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لونگ روم میں آیا۔ مجھے مومو دائیں جانب کچن میں چولہے کے آگے کھڑی دکھائی دی تھی۔ آہٹ پر وہ مڑی۔ ''آ گئے آپ؟ چلیں ناشتہ کر لیں۔''

اس نے چولہا بند کر کے فرائنگ پین سے تلے ہوئے انڈے پلیٹ میں نکالے، دوسری پلیٹ میں توس رکھے اور کافی کے دو بھاپ اڑاتے مگوں کے ساتھ سلیقے سے ٹرے میں سجا کر لونگ روم میں لے آئی۔

''یہ زیادہ شوگر والی آپ کی اور یہ کم شوگر والی میری۔'' مجھے میرا کپ تھما کر وہ مزے سے بولی۔

''اتنی سی دیر میں تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟'' میری حیرت پر وہ مسکرائی اور شانے اچکا دیے۔ ''بس کر لیا۔''

اس روز پتا نہیں کتنے عرصے بعد میں نے ذائقے دار ناشتہ کیا تھا، جو مزہ اور ذائقہ مومو کے تلے ہوئے انڈے میں تھا، وہ مجھے پوری دنیا میں سیون اسٹار ہوٹلز سے لے کر ڈرائیور ہوٹلز تک کہیں نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد اکثر ہی وہ جاگنگ کے بعد میرے ساتھ گھر آ جاتی اور نہ صرف یہ کہ میرے لیے ناشتہ بناتی بلکہ کبھی کبھی تو پورے ہفتے کے کپڑے بھی استری کر جاتی۔ پہلا کپڑے میں استری

کرتا تھا، برتن خود دھوتا تھا، نوکر کبھی رکھے نہیں کہ ان پر بھروسہ نہ تھا۔ صفائی البتہ ہفتے میں تین دن مسز کمال کی نوکرانی آ کر کر جاتی تھی۔ ورنہ تو میں کھانا بھی (بدمزہ ہی سہی) خود ہی بناتا تھا۔ لیکن پھر مومو نے میرا ہر کام نامحسوس انداز میں اپنے ذمے لے لیا تو وہ تو میرے پودوں تک کا خیال رکھتی تھی۔

اور پھر ایک دفعہ تو وہ ہفتے بھر کے لیے کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے کراچی چلی گئی۔ اس پورے ہفتے میں، موموپر بے حد انحصار کرنے کے بعد میں تو بالکل مفلوج ہو چکا تھا، کافی عرصے تک کچن سے دور رہنے کے باعث میں تو انڈے تلنا بھی بھول چکا تھا۔ میرے جوتے، موزے ٹائی، سب کچھ موموں رکھنے لگی تھی۔

اس ایک ہفتے میں مومو مجھے بہت یاد آئی تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ اب وہ آئے گی تو اس سے کہہ دوں گا کہ میرے کام نہ کیا کرے، تاکہ میں اس کی غیر موجودگی میں مفلوج ہو کر نہ رہ جاؤں، مگر جب وہ ہنستی مسکراتی لڑکی واپس آئی تو میں نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل ڈالا۔ اگر وہ میرا کام کر رہی دیتی تھی تو اس میں میرا فائدہ اور اس کی خوشی تھی۔ میں نے اسے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ آخر میں بھی اسے ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ میرے اندر کے خود غرض انسان نے مجھے اس سے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔

***

''موموتو کچن میں حیدر کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔ تم بیٹھو، میں موموکو بلاتی ہوں۔''

مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر آنٹی جو حیدر کے کمرے سے نکل رہی تھیں، شفقت سے مسکراتے ہوئے کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

میں حیدر کے متعلق پریشان سا ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تکیوں کے سہارے، آنکھیں موندے، بستر پر نیم دراز تھا۔ دستک پر آنکھیں کھول دیں، مجھے دیکھ کر نقاہت سے مسکرایا۔

''آؤ حسان!''

''کیا حال بنایا ہے حیدر!'' میں تاسف سے اس کے پژمردہ اور کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ارے کچھ نہیں، معمولی سا بخار ہے، مگر میری والدہ محترمہ اور......'' اسی پل میں ہاتھ میں ٹرے لیے موموا اندر داخل ہوئی تھی۔

اسی کو دیکھ کر حیدر کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ بکھر گئی۔'' اور مس مہرالنساء نے ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔''

''السلام علیکم سر!'' اس نے میز پر ٹرے رکھی اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر پیالے اور چمچے سیٹ کرنے لگی۔'' ہوا کسی نے نہیں بنایا پاپا! آپ بیمار ہیں اور مومو بیماروں کے ساتھ ایسے ہی کرتی ہے!''

وہ بڑے من مانے انداز میں کہہ رہی تھی، اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ آج اس نے کڑھائی والی پوری آستین کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی اور کندھوں پر لمبا سادوپٹہ پھیلایا ہوا تھا۔ آج وہ مجھے بڑی بڑی اور پہلے کی نسبت مختلف لگی تھی۔

''میری بیٹی بہت کیئرنگ ہے، جہاں جائے گی، محبتیں اور خلوص بانٹے گی۔'' حیدر فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میں نے شرارت سے مسکرا کر مومو کو دیکھا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شرمائی یا گھبرائی نہیں، بلکہ پورے اعتماد سے مسکرائی تھی۔

''ہماری مومو ہر معاملے میں بہترین ہے۔'' میں نے بھی حیدر کی تائید کی۔

مومو نے ایک پیالہ حیدر کو تھمایا، جس نے سیدھے ہو کر ٹیک لگائی اور دوسرا پیالہ اس نے میری سائیڈ والی ٹیبل پر رکھا۔

میں نے ایک چمچہ سوپ کا لیا، اس میں سالٹ کم تھے۔ غالباً وہ حیدر کے غذائی اعتبار سے بنایا گیا سوپ تھا۔ میں نے خاموشی سے دوسرا چمچہ لے لیا، حالانکہ میں تیز قسم کی چلی ساس ڈالنے کا عادی تھا۔

''یہ چلی ساس، سر!'' مومو نے چلی ساس کی بوتل چند لمحوں بعد مجھے لا کر دی اور پھر خود ہی چند قطرے ڈال کر بوتل ٹرے میں رکھ دی، میں اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ہر بات کا بغیر کہے علم ہو جاتا تھا۔

ہم دونوں کو سوپ سرو کر کے وہ حیدر کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔'' پاپا! ایک مشورہ دوں؟

آپ شادی کرلیں۔"

"موموا" حیدر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"پاپا کرلیں نا شادی، میری فرینڈ کی بڑی بہن ہے، سارہ اتنی کیوٹ اور سوئیٹ ہے نا وہ، اس کو ہر کام آتا ہے۔آپ کے لیے پرفیکٹ ہے۔" وہ بڑے جوش سے بتارہی تھی۔

"عمر کیا ہے؟" حیدر نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سوپ کا پیالہ سائیڈ پر رکھا۔

"نائنٹین کی ہے؟" مومو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

جواب میں حیدر نے اسے گھور کر دیکھا۔" مس مہرالنساء، بیمار میں ہوں اور دماغ آپ کا چل گیا ہے؟"

"کیا ہوا پاپا؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"مہرالنساء بی بی!" میں نے اسے مخاطب کیا۔حیدر اور مجھے جب بھی اسے چھیڑنا ہوتا، ہم اسے مہرالنساء کہہ کر پکارتے تھے۔

"آپ ایک غلط بات کر رہی ہیں۔ وہ لڑکی انیس سال کی ہے اور آپ کے والد ماجد چالیسویں سن کو کراس کر چکے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے سر! بندے کا ذہن ملنا چاہیے۔"

"بہت کچھ ہوتا ہے مومو! عمر سے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔" حیدر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
"میں ایک شادی کر چکا ہوں، میری ایک جوان بیٹی ہے، اگر ان لوگوں کو دولت کا لالچ نہ ہو تو، وہ کیوں اس کی شادی مجھ سے کریں گے؟"

"پر آپ اتنے ینگ لگتے ہیں اور آپ اتنے ہینڈسم بھی ہیں....." وہ بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

"ینگ لگنے اور ہینڈسم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔عمروں کے فرق کبھی نہیں مٹتے مومو!" میں نے حیدر کی تائید کی۔

"ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چالیس برس کی عمر میں بہت کم عمر حضرت عائشہؓ سے شادی کی تھی اور وہ ایک مثالی شادی تھی۔" اس کی بات پر میں لاجواب سا ہو گیا۔

"وہ اور بات تھی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں، میری بات یاد رکھنا مومو! جو چیزیں غیر فطری

ہوتی ہیں، وہ ایک دن ختم ہو کر اپنی سابقہ پوزیشن پر آ جاتی ہیں۔"
حیدر کا لہجہ دوٹوک تھا۔ موموں نے مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا، مگر میں نے شانے اچکا دیئے۔ وہ مایوس سی ہو کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

* * *

میں اتوار کے روز موموں کو ٹیوشن پڑھانے نہیں جاتا تھا، مگر اس اتوار آنٹی نے بصد اصرار مجھے چائے پر انوائٹ کیا تھا، وہ مجھے کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔
میں پانچ بجے کے قریب وہاں چلا گیا۔
ڈرائنگ روم میں حیدر اور آنٹی کے علاوہ ایک خوش شکل مرد کے ہمراہ ایک خوبصورت سی ستائیس اٹھائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔
"یہ میرا کزن ہے حسان! ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہے۔" حیدر نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ "اور یہ حسان! یہ میرا دوست اور بزنس پارٹنر بابر ریاض ہیں اور یہ ان کی بہن مس تانیہ ریاض ہیں۔ پروفیشن کے اعتبار سے آرکیٹیکٹ ہیں اور ہمارے اگلے پروجیکٹ میں ان کی خاطر خواہ مدد ہمارے ساتھ ہوں گی۔"
میں نے ایک رسمی مسکراہٹ اس کی جانب اچھال دی، مجھے ان سے ملاقات کا کچھ کچھ مقصد سمجھ میں آ رہا تھا اور یقیناً آپ کو بھی آ رہا ہوگا۔
وہ لوگ جتنی دیر بیٹھے رہے، میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ جس صوفے پر حیدر بیٹھا تھا، اس کے پیچھے دیوار کی جگہ قد آدم فرنچ ونڈو تھی، جس نے پوری دیوار کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشے کے اس پار مجھے لان دکھائی دے رہا تھا، موموں وہاں کھڑی حلیمہ کو کوئی کام کہہ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پیاری سی پنک کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹہ نسبتاً چھوٹا تھا اور گلے میں جھول رہا تھا۔ قمیص کے آستین بھی بہت چھوٹی تھی، جو اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔
مہمانوں کے سامنے وہ چائے اور دیگر لوازمات سرد کرتے وقت ہی آئی، مجھے دیکھ کر اسے تحیرت ہوئی۔ اس نے غالباً مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ فوراً اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی براؤنیز کی ایک پلیٹ کے ساتھ ہوئی۔
"میں نے بنا کر رکھی تھیں، آپ کے لیے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ورنہ

پہلے لے آتی۔'' ٹرالی میں میرے سامنے براؤنیز کی پلیٹ رکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا، میں زیرلب مسکرایا۔

آنٹی میرے قریب ہی بیٹھی تھیں، براؤنیز کی پلیٹ دیکھ کر انہوں نے موموکو گھورا، وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ آنٹی نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔

''کب سے کہہ رہی ہوں حلیمہ سے، براؤنیز بھی ساتھ لے آئے، مگر وہ کہہ رہی تھی موموبی بی نے براؤنیز کو ہاتھ بھی لگانے سے منع کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا، تمہارے لیے رکھی تھیں۔ مجھ سے پہلے پوچھ لیتی میری لاڈو، تمہارے سرکو تو صبح ہی میں انوائیٹ کر چکی تھی۔''

اس نے براؤنیز صرف میرے لیے بنائی تھیں، کیونکہ میں وہ بہت شوق سے کھاتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''تھینک یو لٹل گرل۔'' یہ پہلی بار تھا، جب میں نے موموکو تھینک یو بولا تھا، ورنہ ہمیشہ اس کی ہر خدمت کو میں فارگرانٹڈ لیتا تھا۔

میرے شکریے پر وہ مسکرائی۔

وہ لوگ چلے گئے تو حیدر بھی اٹھ گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا، حلیمہ برتن اٹھانے لگی۔ مومو قدرے تسائل سے میرے اور آنٹی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

حلیمہ چلی گئی تو آنٹی نے مجھے مخاطب کیا ''تمہیں تانیہ کیسی لگی؟''

''ہوں......اچھی تھی۔'' میں نے گویا انجان بن کر کہا۔

''تانیہ اور بابر حال ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے ہیں۔ بابر کالج کے زمانے سے حیدر کا دوست ہے۔ اس کے رشتہ داروں میں تانیہ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں۔ بلکہ سچ کہوں تو اس کے رشتے دار خاصے لالچی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے حیدر سے تانیہ کے رشتے کے لیے کہا تھا۔ میرے اور حیدر کے ذہن میں صرف تمہارا نام آیا تھا۔ بولو، تم کیا کہتے ہو؟''

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ''سوچ کر بتاؤں گا، ویسے لوگ اچھے ہیں۔''

''اچھے کیا بہت اچھے ہیں، کینیڈا میں ان کا گھر سبین کے گھر کے بہت قریب تھا۔'' آنٹی نے اپنی بھانجی سبین کا نام لیا، جو پچھلے کئی سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھی۔

سبین بتاتی ہے۔'' تانیہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ ایشیائی کھانوں کی ماہر ہے اور

بہت کلچرڈ ہے۔ وہ تو رشتے کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی، کہتی تھی، میرا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ میں تانیہ کو اس کے لیے مانگ لیتی۔ بیٹے بھی میرے چھوٹے ہیں۔ آپ حسان کے لیے لے لیں اسے۔''

میں بے اختیار مسکرایا۔ سبین سے میرا براہ راست کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ حیدر کی کزن تھی، پھر بھی ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

''کیسی ہے سبین؟''

''بالکل ٹھیک ہے، ماشاءاللہ دو بچے ہیں اس کے۔ ابھی حال ہی میں اس کے شوہر نے بہت بڑا گھر لیا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے، آپ اور مومو میرے پاس آ جائیں، میرا اتنے بڑے گھر میں دل نہیں لگتا۔''

''ارے نہیں آنٹی! مومو کو کینیڈا مت لے کر جائیں، میں بالکل مفلوج ہو کر رہ جاؤں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے مومو کو دیکھا، جو ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ میری بات پر مسکرائی نہیں، بس بہت خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔

''میں ذرا کچن کو دیکھوں۔'' آنٹی کسی کام کو یاد کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مومو کو دیکھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ الجھن ہوئی۔

''مومو!''

''تو آپ دادو کو سوچ کر بتائیں گے اور...... آپ کو وہ لوگ اچھے لگے ہیں!'' وہ ایک دم بہت کاٹ دار لہجے میں بولی، اس کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔

''تانیہ اور بابر کی بات کر رہی ہو؟'' مجھے اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔

''تو آپ دادو کو سوچ کر بتائیں گے۔'' وہ اسی دوٹوک انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے مومو؟'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''تو آپ شادی کر رہے ہیں؟'' اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی۔

''ہاں کرنی تو ہے نا! تو کر رہا ہوں، مگر تمہیں کیوں غصہ آ رہا ہے؟'' میں اس کے رویے کی

وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ زخمی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ''سر! سر! آپ کو وہ لڑکی نظر آ گئی، جس کو آپ جانتے تک نہیں اور......'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ ''اور ساڑھے پندرہ برس سے مومو کہیں نظر نہیں آئی، آپ کو؟ آج آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر رہے ہیں؟''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''مومو!'' میں اتنی زور سے گرجا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔

''تمہارا...... تمہارا دماغ درست ہے؟ تمہیں پتہ ہے تم نے کیا بات کی ہے؟'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے پتہ ہے، میں نے صرف یہی کہا ہے کہ آپ مجھے چھوڑ کر اس تانیہ ریاض سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بہتر ہے؟'' اس کا لہجہ شاکی تھا۔

وہ اتنی آسانی سے وہ بات کر رہی تھی، جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

''شٹ اپ مومو! جسٹ شٹ دی ہیل اپ!'' میں نے بے اختیار دروازے کو دیکھا۔ ''اگر کسی نے تمہاری بکواس سن لی تو میں......؟ میرے خدا میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور تم...... اوہ گاڈ!'' بے یقینی، دکھ، صدمہ، استعجاب کے مارے میرے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔

''ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟ آپ مجھے ساڑھے پندرہ سالوں سے جانتے ہیں۔ میرے کان میں اذان آپ نے دی تھی سر؟ آپ تو مجھ سے واقف ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا، آئی لو یو مومو! اور اب؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر گرنے لگے تھے۔ ''اور اب کیا میں اتنی بری ہوں کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟''

''بات برے اور اچھے کی نہیں ہے مومو! میں بھلا کیسے تم سے شادی کر سکتا ہوں؟ گاڈ!'' مجھے وہ فقرہ کہتے ہوئے بھی برا لگ رہا تھا۔ ''ہمارے درمیان ایک ٹیچر اور اسٹوڈنٹ سے بڑھ کر کوئی ریلیشن نہیں اور مجھے تم سے بہت محبت ہے، مگر ایک چھوٹی سی دوست کی طرح لیکن تم، تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی، بغیر کچھ سوچے سمجھے۔ اگر حیدر کو علم ہو گیا تو...... تم جانتی ہو، میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔''

وہ ایک دم کھڑی ہو کر میرے سامنے آئی۔ ''باپ کی جگہ؟'' اس نے غصے سے کہا تھا۔ ''کیا

کہا آپ نے؟ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں؟ ان ساڑھے پندرہ برسوں میں کب آپ نے مجھے بیٹا کہا؟ کب مجھے "مائی چائلڈ" کہہ کر مخاطب کیا؟ کب کہا کہ میں تمہارا باپ ہوں؟ آپ میرے باپ ہیں، نہ باپ کی طرح ہیں۔ باپ صرف ایک ہوتا ہے، جو میرا آل ریڈی ہے۔"

"استاد بھی باپ ہوتا ہے موموا!" میں ڈپٹ کر بولا، مگر وہ اسی نڈر آواز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی۔ "بہت سے ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس آپس میں شادی کر لیتے ہیں تو دنیا کیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے؟ نہیں نا! یہ منہ بولے رشتے کچھ نہیں ہوتے اور ہمارے درمیان تو کوئی منہ بولا رشتہ ہے بھی نہیں۔"

"تم......!" شدید صدمے اور بے یقینی کی حالت میں، میں مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ "تم پاگل ہوگئی ہو۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ تمہاری عمر ہے، شادی کی بات کرنے کی؟ افسانوں اور ناولوں نے تمہارے ذہن میں فتور ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔ تم تو سولہ برس کی بھی نہیں ہوئیں اور میں تم سے بائیس سال بڑا ہوں۔"

"عمر سے کچھ نہیں ہوتا، سر!" اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"بہت کچھ ہوتا ہے، تم الیکٹرا کمپلیکس کا شکار ہو۔"

"الیکٹرا کمپلیکس؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک چھوٹی سی نفسیاتی بیماری جو کچھ لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک لڑکی کا، اس کی ماں سے حسد کا نام ہے۔"

"ماں سے...... حسد؟" اس نے خائف سی ہو کر مجھے دیکھا، یک دم مجھے احساس ہوا، مومو نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

"دراصل جو لڑکیاں ذہنی طور پر جلد میچور ہو جاتی ہیں، ان کے اندر ففٹی پلس مردوں کے لیے ایک پسندیدگی ڈیولپ ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی عمر کے مردوں میں بیک وقت محبوب اور باپ دونوں کی تلاش کرتی ہیں۔ ایسی لڑکی کی شادی اگر اس کی عمر کے لڑکے سے کر دی جائے تو وہ ذہنی سطح نہ ملنے کے باعث ناکام ہو جاتی ہے۔

الیکٹرا کمپلیکس ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ جب وہ لڑکی تیس پینتیس برس کی عمر کو پہنچتی ہے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے۔ تم نے

ضرور آنٹیوں ٹائپ خواتین کو ینگ سے سیکرٹری رکھ کر، ان کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہوگا تو یہی الیکٹرا کمپلیکس ہوتا ہے۔"

وہ ہکا بکا سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"تو آپ، آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے؟"

"پھر وہی شادی!" میں چکرا کر رہ گیا۔ "میں مر کر بھی تم سے شادی نہیں کر سکتا، میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں یا اللہ! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" دکھ کے مارے مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"میں تو سمجھتی تھی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اس کی لانبی پلکیں ایک دفعہ پھر بھیگ گئیں۔ "جیسے میں آپ سے کرتی ہوں۔"

"بچوں والی باتیں مت کرو۔ موموا جس کو تم محبت سمجھ رہی ہو، وہ صرف ایک وقتی اور جذباتی اٹریکشن ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو تمہیں اس فضول اور احمقانہ خیال پر ہنسی آئے گی۔" میرا لہجہ غصیلا اور بے حد دکھا تھا۔

"آپ میری محبت کو فضول اور احمقانہ کہہ رہے ہیں۔" اس نے دکھ سے میرا چہرہ دیکھا۔

"یہ محبت نہیں ہے موموا یہ جذباتی اٹریکشن ہے۔ تمہیں بڑی عمر کا مرد اچھا لگتا ہے، کیونکہ تمہیں باپ کی محبت نہیں ملی۔ سارا قصور ہی حیدر کا ہے۔ اس نے تمہیں کبھی محبت دی ہی نہیں۔ اس لیے تم اپنے باپ کی عمر کے ہر آدمی میں اپنا باپ تلاش کرتی ہو...... جانتی ہو میں روز تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟ کیونکہ میں دیکھتا تھا حیدر تمہیں اگنور کرتا ہے۔ میں چاہتا تھا، تمہاری ذات میں کہیں کوئی کمی، کوئی خلش نہ رہ جائے۔ اس لیے میں تمہیں توجہ دیتا تھا، مگر تم نے کتنا الٹ مطلب لیا، میری محبت کا، موموا تم نادان ہو اور تم بے وقوف ہو۔"

"ہاں میں ہوں، میں نادان ہوں، میں بے وقوف ہوں، مگر میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے...... آپ سے سر! لیکن...... لیکن آپ کے خیال میں میں نفسیاتی مریض ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سر کو تھامے صوفے پر گر سی گئی۔

"آپ کو میں ذہنی بیماریوں کا شکار لگتی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں

ہے۔" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔" آپ کو میں ہمیشہ غلط اور جھوٹی لگتی ہوں۔" اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

" مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں میں نے ساڑھے پندرہ برس تم پر ضائع کیے۔" میری بات پر وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

" تم ایسی نکلو گی، کاش مجھے علم ہوتا۔ آئی ہیٹ یو موموؔ۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے میز سے چابی اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ غصے، دکھ اور اضطراب سے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر حیدر کو اس کی باتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہوگا یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ایک استاد بن کر، ایک رہبر اور راہنما بن کر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ اور وہ اس قسم کے خیالات پال لے گی، میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پورچ کے قریب پہنچ کر ایک لحظہ کو رک کر میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کو دیکھا۔ قد آور کھڑکی کے شیشے کے اس پار مجھے موموصوفے پر بیٹھی واضح دکھائی دے رہی تھی، ڈرائنگ روم کی چھت سے لٹکتے فانوس کی زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی۔

اس کا دوپٹہ کندھے سے لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ زرد روشنی میں اس کے دودھیا بازو زرد لگ رہے تھے۔ اتنی دور سے بھی مجھے اس کا قدرے جھکا ہوا، آنسوؤں سے تر چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس چہرے پر اتنا دکھ اور کرب تھا، میرا دل چاہا۔ میں رک جاؤں اور واپس جا کر اسے سمجھاؤں۔ اس روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کو چپ کراؤں۔ اس کو پہلی بار میں نے اس بری طرح روتے دیکھا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں کسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عزت نفس اور انا کھونے کے بعد اس نے مجھے بھی کھو دیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھی، اس کے آنسوؤں میں مجھے اس کی ٹوٹتی بکھرتی ذات کی کرچیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے میں نے بہت رلایا تھا، بہت دکھی کر دیا تھا، مگر اس نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ مانگ لیا تھا۔ اس نے ناممکن بات کر دی تھی۔

میں اس کو چپ کرانا چاہتا تھا، اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا مگر...... میں نے رخ موڑ لیا، میں اسے روتا چھوڑ کر چلا آیا۔

اس رات میں سو نہیں سکا۔ تمام رات بے چینی و اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلتے گزری۔ مجھے صوفے پر بیٹھی بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی یاد آ رہی تھی اور مجھے پتہ تھا وہ بھی پوری رات نہیں سوئی ہو گی۔ صرف مومو کو میرے دل کی بات نہیں پتہ چل جاتی تھی، مجھے بھی کبھی کبھی اس کے دل کا حال پتہ چل جاتا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ کر لیا۔ فرار کا فیصلہ، پتہ نہیں یہ کس سے فرار تھا؟ خود اپنے آپ سے یا مومو سے؟ میں نے اپنا بیگ تیار کیا، آفس سے چھٹی لی اور آفس کے ایک ملازم سلطان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

میں کتنے دنوں کے لیے آیا تھا، مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ بس اتنا پتہ تھا کہ میں پیچھے کوئی بھی کونٹیکٹ نمبر چھوڑے بغیر بھاگ رہا تھا۔

کراچی سے میں نادرن ایریاز چلا گیا، کتنے ہی ہفتے میں پہاڑوں اور چشموں کو چھانتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے تیسرے، میں نے وہ تمام خوب صورت مقامات دیکھ لیے جو اپنی خوبصورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھے۔ سڑکیں خراب اور سہولیات ناپید تھیں، پھر بھی میں نگر نگر گھومتا رہا۔

چار ماہ گزر گئے، میں گھر واپس نہیں گیا، نہ ہی وہاں فون کر کے حالات پتا کیے۔

پھر پانچواں مہینہ شروع ہونے سے قبل میں تھک ہار کر واپس اسلام آباد چلا آیا۔

٭٭٭

واپس آیا تو گھر بہت اجڑا اجڑا سا لگا۔ سلطان صفائی کر تو دیتا تھا، مگر اوپر اوپر سے، دل سے نہیں۔ دل سے اور دل لگا کر تو میری چیزوں کا خیال صرف مومو رکھتی تھی۔

"سامان نکال لاؤ۔" گاڑی کی چابی سے ڈگی کھول کر سلطان کو ہدایت دیتے ہوئے میں اندر آ گیا۔

لونگ روم میں رکھے ان ڈور پلانٹس مرجھا سے گئے تھے۔

میں نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا۔ میں بہت تھک چکا تھا، آخر کتنا بھاگ سکتا تھا مومو سے؟ بھاگنے سے بہتر تھا، میں اس کے پاس جاؤں اور اسے سمجھاؤں، یا پھر یوں ظاہر کروں، جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چند دنوں میں اپنی اس نادانی کو بھول جائے گی اور ہماری زندگی ویسی ہی ہو جائے گی، رویوں کی بے ساختگی تو واپس نہیں آ سکتی تھی، مگر بہرحال، میں یہ فیصلہ کر کے ہی لوٹا تھا۔

"بڑے دن لگا دیئے آپ نے صاحب!" سلطان میرا بڑا والا بیگ اٹھا کر اندر آ گیا۔

"کوئی آیا گیا؟" میں فریج کی جانب بڑھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہاں جی۔ وہ انہوں نے۔" اس نے جیسے دماغ پر زور دیا۔ "بھلا سا نام تھا، پتہ نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ مگر انہوں نے جی آپ کے جانے کے دو ماہ بعد تک روز شام صبح ادھر کے چکر لگائے تھے، پتہ نہیں جی کیا مسئلہ تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی پریشانی تھی، میں نے انہیں ہر بار بتایا کہ صاحب کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے، پھر بھی وہ......"

"کوئی پیغام دیا تھا اس نے؟" میں نے اکتا کر اس کی بات کاٹی۔

"ہاں...... دو ماہ پہلے، جب انہوں نے آخری بار چکر لگایا تھا تو ایک کاغذ دیا تھا، لیکن ایک

زبانی پیغام بھی بہت بار دیا تھا کہ آپ کا فون آئے تو بتا دوں، مگر جی آپ کا فون ہی نہیں آیا، اس لیے......"

"کیا یہ پیغام دیا تھا؟" میں نے پانی کی بوتل لبوں سے ہٹاتے ہوئے قدرے بے چینی سے استفسار کیا۔ پتہ نہیں مومو نے میرے لئے کیا پیغام چھوڑا تھا۔

"وہ جی انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔ 'میں نے بابر صاحب کو اپنی بیٹی کی وجہ سے انکار کر دیا ہے۔' اتنی بار انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رہ ہی گیا۔"

میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"کون؟ حیدر...... حیدر آیا تھا؟ صبح شام ادھر حیدر آتا رہا تھا؟" میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جی...... یہی نام تھا ان کا۔"

میرے قدموں سے آہستہ آہستہ زمین سرک رہی تھی۔

"کوئی...... کوئی لڑکی نہیں آئی؟"

"نہ جی لڑکی تو کوئی نہیں آئی۔ وہی حیدر صاحب آئے تھے، ایک خط دے گئے تھے، پھر اس کے بعد نہیں آئے۔"

دو منٹ بعد وہ خط لے آیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھولا۔ وہ حیدر کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔

"حسان! دو ماہ پہلے مومو میرے پاس آئی تھی، جس روز میں نے تمہیں بابر سے ملوایا تھا، اس رات وہ میرے پاس آئی تھی اور جانتے ہو، وہ رو رہی تھی، حسان! میری بیٹی رو رہی تھی، میری مہر النساء رو رہی تھی۔

جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا؟ اس نے کہا۔" آپ تانیہ آنٹی کو انکار کر دیں، میں نے ہمیشہ خود کو سر کے ساتھ دیکھا ہے، مجھے سر سے الگ مت کریں۔" اور اس نے یہ بھی کہا۔" آپ بہت برے ہیں پاپا، آپ اپنی مومو سے اس کی سب سے قیمتی شے چھین رہے ہیں۔"

وہ رو رہی تھی حسان! اس نے روتے بلکتے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ میں اپنی مومو کو کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ میں اسے انکار ہی نہیں کر سکا، مجھے میری مومو بہت پیاری ہے۔

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔

حسان! میری بیٹی پاگل نہیں ہے۔ تمہارے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ جب اس نے 8th کلاس میں پوزیشن لی تھی تو میں نے اسی روز اسے گولڈ کے ٹاپس دیئے تھے۔ وہ خوش ہوئی تھی، مگر اس نے وہ ٹاپس کبھی نہیں پہنے۔ پھر دوپہر میں تم آئے اور تم نے اسے گھڑی دی، وہ اتنی خوش ہوئی، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے اپنی پوری کلاس میں اپنا شاندار رزلٹ کارڈ نہیں، بلکہ وہ گھڑی دکھائی، اور وہ گلاب کے پھول جو تم نے اسے دیئے تھے، وہ آج بھی اس کی کتابوں میں محفوظ پڑے ہیں اور تم کہتے ہو، میری مومو پاگل ہے؟

وہ کہتی ہے سر کہتے ہیں، تمہیں حیدر پیار نہیں کرتا۔

حسان! میں تو اسے ہمیشہ سے پیار کرتا ہوں۔ تم کتنا جانتے ہو، میرے اور مومو کے ریلیشن کے بارے میں۔ تم روز صرف ایک گھنٹہ ہمارے گھر آتے ہو، صرف ایک گھنٹہ۔ اسی لئے تمہیں علم نہیں ہے کہ میں اور مومو روز رات بارہ ایک بجے تک بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کو گڈ نائٹ کہہ کر میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ مومو جانتی تھی، تم یہ سمجھتے ہو۔ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف تھا کہ تم اس کو محبت اور توجہ بھی اسی لیے دیتے ہو، اسی لیے اس نے کبھی تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مومو اندر سے بہت بزدل لڑکی ہے، وہ بہت سے لوگوں کو بہت ساری باتیں اس ڈر سے نہیں بتاتی کہ کہیں وہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دیں، ورنہ میں نے تو سونیا سے بھی زیادہ محبت مومو سے کی ہے اور جانتے ہو، اس رات وہ رو رہی تھی۔ میری سونیا، میری مہرالنساء رو رہی تھی۔

میں باپ ہوں، میری مجبوری کو سمجھو میں نے اسے سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو اس کے سر سے الگ نہیں کروں گا۔ میں روز تمہارے گھر کے چکر لگاتا ہوں، مگر تم بھاگ رہے ہو۔ تم مومو اور حیدر سے بھاگ رہے ہو۔ اگر تم نے فرار ختم نہ کیا تو مومو کچھ بہت غلط کر ڈالے گی اور میں اسے روک بھی نہیں سکوں گا۔

واپس آجاؤ حسان میں مومو کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

میں نے اس خط کو اتنی دفعہ پڑھا کہ اس کے الفاظ میرے ذہن پر حیدر نقش ہو کر رہ گئے۔ مجھے لگا مومو میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کی کہنیاں اس کی گود میں رکھے کشن پر ہیں۔

اس کے آرٹسٹک ہاتھوں کی خوب صورت انگلیاں اس کی بالوں میں پھنسی ہیں۔اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر فانوس کی زرد روشنی پڑ رہی ہے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

میں ایک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔اگر حیدر اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا تو حسان بھی اسے روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت موموسے کی تھی،مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔میرے نزدیک یہ ایک غیر فطری بات تھی۔

'میں اسے منالوں گا، میں حیدر کو بھی سمجھالوں گا' یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا، مجھے لگا، شاید وہ ابھی تک اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی رو رہی ہو۔

اسی وقت گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے، بہت سی امیدیں اور خدشات لے کر میں موموکے گھر گیا تھا۔اس کے گیٹ کے باہر ایک جھٹکے سے میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل کر بے یقینی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھا۔

وہاں تالا کیوں لگا تھا؟

میں نے بے اختیار بیل بجائی اور پھر بجاتا چلا گیا،مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے،حیدر، مومو، آنٹی سب کدھر چلے گئے تھے؟

جب گھنٹی پر کسی نے دروازہ نہ کھولا تو مین نے گیٹ کو ہاتھوں سے بجانا شروع کر دیا۔

''مومو.....مومو!'' میں اسے آوازیں دے رہا تھا،مگر وہ نہ آئی۔گیٹ پیٹنے کی آواز سن کر ساتھ والے گھر سے مسز ہاشمی کی بڑی بہو نکل آئیں۔ان کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ سا ہوا۔

''حیدر اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ علم ہے آپ کو؟ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں، یہ سب کدھر چلے گئے ہیں؟''

''حیدر صاحب کی تو ڈ-تھ ہو گئی ہے۔''

میں کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹا تھا،کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

''کک.....کیا کہا آپ نے؟ حیدر کی ڈ-تھ؟'' مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔وہ یقیناً کوئی بھیانک خواب تھا، بھلا حیدر کیسے مر سکتا تھا؟

''دو مہینے پہلے انہیں دل کی تکلیف ہوئی تھی، ایمبولینس انہیں ہسپتال لے کر جا رہی تھی کہ راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا، وہ موقع پر ہی ایکسپائر ہو گئے تھے۔'' وہ تاسف سے بتا رہی تھیں۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دوست، میرا کزن، میرا حیدر جو مجھ سے اپنی بیٹی کی خوشیاں مانگنے ہر روز میرے گھر آتا تھا، جو کہتا تھا میں موموکو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، وہ حیدر اب نہیں رہا تھا، وہ مر گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اور ان کی بیٹی اور والدہ؟'' کتنی ہی دیر بعد میں بولا تو مجھے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی تھی۔

''وہ تو چلے گئے۔''

''چلے گئے؟ کدھر چلے گئے؟'' مجھے لگ رہا تھا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔

''ان کی والدہ کی کوئی بھانجی آئی تھیں۔ کینیڈا سے، وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر کینیڈا چلی گئیں۔ ابھی کل ہی گئے ہیں وہ لوگ......''

''وہ واپس...... واپس کب آئیں گے؟'' کسی امید کے تحت میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''واپس تو نہیں آئیں گے، وہ تو ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔''

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب پلٹ آیا۔ میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ، میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے...... سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔

میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور میں بے خبر رہا، میں اتنا سنگدل تو نہیں تھا اور موموہ چلی گئی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ میں کیسے رہوں گا موموکے بغیر؟

محبت تو میں نے اس سے بہت کی تھی، مگر میں احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ہم پر ہنسیں، ہمارا مذاق اڑائیں، میں ڈرتا تھا، میں بزدل تھا، موموکو میں نے اس وقت کہا تھا کہ ''میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر میں نے ایسا تصور کیا تھا، میرے دل میں بھی چور تھا۔ اگر چور نہ ہوتا تو میں بھاگتا کیوں؟''

اور حیدر...... اس نے جان دے دی؟ اسے دل کی تکلیف کب سے شروع ہوئی تھی؟ اس رات سے جب اس نے اپنی بیٹی کو روتے دیکھا تھا یا پھر اس روز سے جب وہ میری جانب سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا؟

موموٹھیک تھی، میں غلط تھا، وہ صحیح کہتی تھی کہ میں اس سے ویسی ہی محبت کرتا تھا، جیسی وہ مجھ سے کرتی تھی، مگر میں عدم تحفظ کا شکار تھا، بزدل اور خود غرض اور سب لوگوں کی طرح۔

اور موmo، جو اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود مجھ سے زیادہ بہادر تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور جا چکی تھی۔

* * *

موmo گئی تو اپنے ساتھ زندگی کی رنگینیاں، روشنیاں اور تتلیاں بھی لے گئی۔ میری ذات، میرا وجود؟ میری زندگی، سب کچھ بہت بے کیف اور بے رونق سا ہو کر رہ گیا تھا۔

روز شام چھ بجے میں اپنی گاڑی عادتاً موmo کے گیٹ کے سامنے لے جا کر ہارن بجاتا، پھر اچانک مجھے یاد آتا کہ اب اندر سے کوئی چھوٹی سی لڑکی نکل کر یہ نہیں کہے گی کہ "سر! آج میرا ٹیسٹ ہے یا جلدی آئیں سر! میں نے آپ کے لیے چکن شاشلک بنایا ہے، دیر کریں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا اور پھر آپ نہیں کھائیں گے۔" کیونکہ وہ لڑکی تو جا چکی تھی۔

میں بوجھل دل لیے واپس آ جاتا، مگر اگلی شام پھر اس کے گھر چلا جاتا۔ پھر یہ بھول ہر شام ہونے لگی۔ ساڑھے پندرہ برس کی عادتیں اتنی آسانی سے تو نہیں جاتیں۔

جیسے ہر بندہ اپنے گھر واپس لوٹتا ہے، اسی طرح ہر شام میں اس کے گھر جاتا تھا۔ کتنے ہی مہینے بیت گئے اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی وہاں سے جا چکی ہے۔ جب یہ یقین آ گیا تو میں وہ بھول جان بوجھ کر دہرانے لگا۔

دو برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا میں نے امیدیں نے لو اس کے گھر کے دروازے پر جانا چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں ناشتہ کرنا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے موmo کی یاد دلاتا تھا۔

میں نے رات کا کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے صرف موmo کے ہاتھ کا پسند تھا، میں نے لونگ روم میں ان ڈور پلانٹس رکھنے بھی چھوڑ دیئے۔ میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ بس اس بھوری آنکھوں والی نازک سی لڑکی سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکا۔ یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔

پھر میں نے اپنی بے رونق، پھیکی زندگی میں رنگ بھرنا چاہے۔ وہ رنگ جو موmo کو پسند تھے، جن کو وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے کینوس سے بکھیرنا چاہتی تھی، ہاں وہی رنگ میں نے اپنی زندگی میں بھرنا چاہے۔

پینٹنگ میرا بچپن کا شوق تھا۔ جب میں اسکول میں تھا تو جاپانی ایمبیسی کے زیر انعقاد ایک پینٹنگ کمپٹیشن میں میری بنائی گئی ایک تصویر کو پہلا انعام اور مجھے بطور اعزاز آٹھ سو ڈالرز دیئے

گئے تھے۔ وہ ڈالرز میری ٹیچر نے خود رکھ لیے تھے اور وہ پینٹنگ مجھے کبھی واپس نہیں ملی ،کیونکہ وہ میری پرنسپل کی بیٹی کو بہت پسند آگئی تھی۔ سو پرنسپل صاحبہ نے وہ اسے گفٹ کر دی۔

کوئی انسان یونہی دنیا سے بے اعتبار، بدگمان اور شکی مزاج نہیں بن جاتا۔ یہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، جو ہم پر بہت گہرا نفسیاتی اثر چھوڑتی ہیں۔

میں اس واقعے سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اپنا برش توڑ دیا، ایزل اور کینوس جلا ڈالے اور رنگ پھینک دیئے۔ یوں میں نے وقتی طور پر اپنے اندر کے آرٹسٹ کو مار ڈالا۔

مگر رنگوں اور تتلیوں کا دیس مجھے واپس اپنی جانب بلاتا رہا تھا۔

اور پھر جب اس روز جب میں نے مومو کی مصوری دیکھی تو مجھے ایک انجانا سا سکون ملا تھا۔ اسی لیے تو میں اسے پینٹر بننے کے لیے کہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو باہر نکال ہی لائے گی، وہ کینیڈا جا کر آرٹ ہی پڑھے گی۔ مومو کی انگلیاں یہ بات کہتی تھیں اور میرا دل یہ بات کہتا تھا۔

مومو کے جانے کے تیسرے برس میں نے ایک آرٹ اکیڈمی شام چھ سے سات جوائن کر لی۔ جو وقت میں پہلے مومو کو دیتا تھا، اب مومو کے رنگوں کو دے رہا تھا۔

کبھی کبھار کینوس پر رنگ بکھیرتے ہوئے میں اپنے برش کو انگلیوں کے درمیان تھام کر سوچتا تھا کہ شاید مومو بھی اس کمپنی اور ساخت کا برش استعمال کرتی ہو، شاید وہ بھی رنگ کرتے وقت گردن کو یونہی ترچھا کرتی ہو، شاید اس کے ہاتھوں پر بھی میری طرح Pastal کلرز لگ جاتے ہوں، مگر اس کے ہاتھ تو بے حد خوب صورت تھے اور میرے ہاتھ، میری شکل وصورت کی طرح عام سے ہی تھے۔

دو سالوں تک مختلف اکیڈمیوں میں آرٹ پڑھنے اور سیکھنے کے بعد میں نے ملٹی نیشنل فرم کی وہ جاب چھوڑ دی، جس کی خواہش لاکھوں نوجوان کرتے تھے، مگر مجھے کوئی خواہش نہیں تھی یا پھر اب رہی نہیں تھی۔

جاب چھوڑنے کے بعد میں نے اپنے بینک بیلنس اور کچھ سیونگز کو ملا کر ایک جگہ کمرہ حاصل کر کے اپنی آرٹ اکیڈمی کھول لی۔

میری پینٹنگز اور میری اکیڈمی اب میرے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھیں، میں

خوش نہیں تھا، مگر مطمئن اور پرسکون ضرور تھا۔

میری آرٹ اکیڈمی کے دوسرے بیچ میں ایک بارہ سالہ لڑکی بھی سیکھنے آئی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے پتہ نہیں کیوں مومو یاد آ جاتی تھی۔ اس کا نام ماریہ تھا، اس کے ہاتھ اور انگلیوں کی ساخت بالکل موموجیسی تھی اور اس کی بھوری آنکھیں، مڑی ہوئی پلکیں اور لمبی سی فرنچ بریڈ بالکل موموکی طرح تھیں۔ چہرے کے نقوش، رنگت، قد، وہ ہر لحاظ سے موموسے مختلف تھی، مگر پھر بھی دونوں میں بہت مماثلت تھی۔

ماریہ باتیں بھی موموکی طرح کرتی تھی۔ دوسروں کی ہمدردی میں پگھل جانا، کسی کے غم کو اپنا سمجھ لینا اور خود کو فوراً قربانی کے لیے پیش کر دینا۔ وہ موموسے بہت ملتی تھی۔

جب اس نے اسکیچ بنانا سیکھا تو پہلا اسکیچ ایک پولیٹیکل لیڈر کا بنایا، اس کا وہ اسکیچ ہاتھ میں پکڑے مجھے موموبری طرح یاد آئی تھی۔

وہ بھی تو ایسی ہی تھی، لیڈرز اور سیاست دانوں کو پسند کرنے والی اور ایسی لڑکیوں کو میں بے وقوف کہا کرتا تھا۔ جانے وہ کیوں اسکیچ دیکھتے ہی میرے لبوں سے موموںکلا تھا۔

''جی سر!'' ماریہ، جو میرے سامنے کھڑی تھی، قدرے حیرت بھری تابعداری سے بولی۔

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرایا۔

''کچھ نہیں۔''

''سر! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا نک نیم موموہے؟'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا، مگر پھر میں سنبھل کر مسکرا دیا۔ ''تمہاری شکل پر لکھا ہے ماریہ؟''

''میری شکل پر؟'' وہ میری بات پر حیران ہوتی ہوئی اپنی جگہ پر بیٹھی۔

اس روز کلاس کے بعد جب میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا، ماریہ میرے پاس چلی آئی۔

''سر ایک بات مانیں گے؟''

''ہاں بولو بیٹا!'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اس نے بلو جینز کے اوپر آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، بال ہمیشہ کی طرح فرنچ چوٹی میں مقید تھے، یہ حلیہ تو کسی اور کا بھی ہوتا تھا، میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''سر آپ میرا پورٹریٹ بنائیں گے؟''

''شیور، کیوں نہیں۔'' اس کے ہچکچاتے انداز پر میں مسکرایا۔'' کل اکیڈمی ٹائم کے بعد ایک گھنٹہ ایکسٹرا بیٹھ جانا۔''

''کتنی سٹنگز ہوں گی سر؟'' وہ مجھے بالکل مومو کی طرح سر کہتے ہوئے R کو Silent کرتی تھی۔

''دو یا تین، مگر میں گارنٹی نہیں دیتا کہ وہ بہت اچھی ہو گی۔''

''ارے نہیں سر!'' آپ تو بہت اچھی پینٹنگز بناتے ہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔ اس طرح مجھے ارے نہیں سر کون کہا کرتا تھا، میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلی شام، اس کو اسٹول پر اپنے سامنے بٹھا کر میں نے جب اس کا پورٹریٹ بنانا شروع کیا تو آغاز آنکھوں سے کیا، اس کی آنکھیں بناتے بناتے میرے ذہن کے پردوں پر وہ منظر لہرایا، جب مومو میرے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے، نائمہ کے لاؤنج میں آرام سے بیٹھی تھی اور اٹھنے کے موڈ میں نہ تھی۔

ایک سٹنگ میں پورٹریٹ مکمل کرنے کے بعد میں یہ جانتے ہوئے بھی پرسکون تھا کہ میں نے ماریہ کا نہیں، مومو کا پورٹریٹ بنا دیا تھا۔

''بن گئی سر؟'' ایک گھنٹے سے اسٹول پر ماڈل بن کر بیٹھی ماریہ چل کر میرے پاس آئی۔ میری تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

''کیسی بنی ہے؟''

''بہت اچھی ہے، سر! مگر اس میں، میں کہاں ہوں؟'' اس کے انداز پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

''تمہاری کل بنا دوں گا، یہ کسی اور کی ہے۔''

''کس کی ہے؟'' اپنی مایوسی بھلائے وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ میں نے برش کے کنارے کو لبوں تلے دبائے کچھ دیر کو سوچا۔

''مومو کی ہے۔''

''مومو کون؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''ہے ایک لڑکی۔'' میں اداس سا ہو گیا۔'' مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔''

''کدھر؟'' وہ بھی اداسی سے پوچھنے لگی۔

''کینیڈا۔''

''کیوں سر؟'' وہ میرے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''میں نے اسے ناراض کر دیا تھا۔'' میں سر جھکائے بتانے لگا۔

''تو آپ منالیں نا۔''

میں نے سر اٹھا کر مغموم انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ''مجھے اس کو منانا نہیں آتا۔''

''کیوں سر؟''

''میں نے اسے کبھی منایا ہی نہیں۔''

''تو اب منالیں نا۔''

''کیسے؟'' میں نے ابرو اٹھائے۔

''کہہ دیں آئی ایم سوری۔ سو سمپل!'' اس نے آرام سے کہہ دیا۔

''ہر بات آئی ایم سوری سے حل نہیں ہو جایا کرتی ماریہ!''

''سر! مجھے پوری کلاس مومو کہتی ہے آپ ماریہ کیوں کہتے ہیں؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''میری صرف ایک ہی مومو تھی۔ بہت اچھی فرینڈ تھی، وہ میری۔ تمہاری کوئی فرینڈ ہے ماریہ؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

اس نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میری کوئی فرینڈ بنتی ہی نہیں ہے۔''

''ارے وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر چلی گئی۔

مومو بھی ایسے ہی اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ میں کبھی مومو کے پیچھے نہیں گیا تو ماریہ کے پیچھے کیسے جاتا؟

اگلی شام مجھے ماریہ بہت چپ چپ لگی تھی۔ چھٹی کے وقت جب سب بچے جانے لگے تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''ادھر آؤ۔''

وہ جواپنا پنک کلر کا بیگ لے کر باہر کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی، میری بات پر سر جھکائے میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''بیٹھو ادھر!'' وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

''ماریہ! تمہاری می کب فوت ہوئی تھیں؟'' اس کے آنے سے پہلے میں نے فاطمہ سے، جو ماریہ کے گھر کے قریب رہتی تھی، اس کے متعلق پوچھا تھا۔

وہ چند لمحے میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''جب میں دو سال کی تھی تب!''

''اور تمہارے فادر؟ وہ تمہارا خیال کرتے ہیں؟'' مجھے پتا نہیں کیوں حیدر یاد آیا تھا۔

''وہ مجھ سے زیادہ سارہ مما میں انٹرسٹڈ ہیں، سارہ مما میری خالہ ہیں، وہ کئی سالوں سے میرے بہانے پاپا سے ملنے ہمارے گھر آتی رہتی ہیں۔ وہ پاپا سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ میں چھوٹی بچی ہوں اور کچھ نہیں سمجھتی۔'' چھوٹی عمر میں بڑے بڑے غم مہرالنساء اور ماریہ کو بہت جلدی سنجیدہ اور میچور کر دیتے ہیں۔

''اور پاپا ان سے شادی کرلیں گے؟''

''جی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔

''تمہیں اچھی نہیں لگتیں سارہ مما؟'' میں اس کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔''

''ارے نہیں ماریہ! گھر سے کیوں نکال دیں گی؟ تمہارے پاپا کا گھر ہے اور بھلا گھر سے کدھر نکالیں گی؟'' اس نے یقیناً سنڈریلا ٹائپ کی بہت ساری کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔

''آپ کو نہیں پتہ، ہے ایک جگہ۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔

گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو ماریہ اپنا بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر چند ہفتوں بعد ماریہ نے مجھے بتایا۔ ''سر! پاپا نے سارہ مما سے شادی کرلی ہے۔'' وہ ان دنوں بہت ڈری سہمی سی رہنے لگی تھی۔ میں نے اسے امید دلائی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، تب اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔

''سر آپ میرے گھر آئیں۔''

اور میں نے ہامی بھر لی۔ ''ہاں ماریہ! میں آؤں گا تمہارے گھر اور تمہارے پاپا سے بات کروں گا کہ وہ سارہ مما سے زیادہ تمہیں امپورٹنس دیا کریں۔''

وہ خوش ہو گئی۔

ہامی تو میں نے بھر لی، مگر پھر ان دنوں کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔

میں نے چار روز اکیڈمی کی چھٹی کر دی۔ چار بے حد مصروف دن گزارنے کے بعد، جب میں اکیڈمی آیا تو میری پوری کلاس موجود تھی، ماسوائے اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی کے، وہ کرسی خالی تھی۔

یہ ماریہ کی پورے سال کی پہلی چھٹی تھی، اس لیے میں نظر انداز کر گیا، لیکن جب وہ اگلا پورا ہفتہ نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی۔

''یہ ماریہ کیوں نہیں آ رہی؟'' میں نے قدرے بلند آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کلاس سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں سر!''

''پتا نہیں سر!'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔

''سر آئی تھینک! اس کی اسٹیپ مدر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔'' فاطمہ، ماریہ کے گھر کے ساتھ رہتی تھی، اسی لیے اس کے حالات سے اس حد تک واقف تھی۔

''گھر سے کدھر نکال دیا ہے؟ اسٹیپ مدر ہی ہے، کوئی جادوگرنی تو نہیں جو گھر سے باہر نکال دے۔'' میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

''سر! ہو سکتا ہے، آنٹی نے اسے ہسپتال بھیج دیا ہو۔'' فاطمہ دوبارہ بولی۔

''ہسپتال؟ کیوں؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آپ کو پتہ نہیں سر؟'' بہت سے اسٹوڈنٹس اکٹھے بولے تھے۔

''کیا نہیں پتہ؟'' میں یکدم پریشان سا ہو گیا۔

''سر! ماریہ کو تھائی رائیڈ گلینڈ کا کینسر ہے۔''

''واٹ؟'' میں بے حد شاکڈ ہو کر فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

ماریہ کہتی تھی، اسے کوئی دوست نہیں بناتا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیمار تھی۔ زندگی سے لڑ رہی تھی، کینسر کوئی چھوت کا مرض نہیں تھا، مگر یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ بیمار اور معذور انسانوں کو تنہا کر دیا جاتا ہے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جو مجھے موموکی یاد دلاتی تھی، وہ بھی اسی المیے کا شکار تھی۔

''کب ہوا اسے کینسر؟'' میں فکرمندی سے پوچھنے لگا۔

''کافی عرصے سے ہے۔ اب تو آخری اسٹیج ہے، چند ماہ پہلے ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کے پاس چھ ماہ سے ایک برس تک کا وقت ہے۔'' فاطمہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں سر ہلا کر بے دھیانی سے اسٹوڈنٹس کی اسائمنٹس دیکھنے لگا۔ دل میں مجھے بار بار ماریہ کا خیال آرہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کدھر ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ اگر اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال بھیج دیا ہو تو، وہاں اس کے ساتھ کوئی ہوگا؟ یا وہ تنہا کمرے میں اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے پاس اس کے برش کلرز اور کینوس بھی ہوں گے یا نہیں اور اس کا وہ پنک کلر کا بیگ جو وہ ہمیشہ اپنے پاس اٹھائے رکھتی تھی، پتہ نہیں وہ بیگ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ساتھ لے جانے دیا ہوگا یا نہیں۔

بہت سے سوال تھے، جن کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ میرا دل اردگرد سے سخت اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے بچوں کی جلدی چھٹی کر دی اور خود اپنے داخلہ رجسٹر سے ماریہ کے والد کی ID کارڈ کی فوٹو کاپی سے اس کا ایڈریس لے کر اس کے گھر چلا گیا۔

اس کی بے حد خوبصورت، مگر سرد مہر سوتیلی ماں نے انتہائی کھردرے اور روکھے انداز میں مجھے اتنا ہی بتایا۔

''کل صبح آپریشن ہے، موموکا۔ سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہے۔''

میں نے کمرہ نمبر پوچھ کر استفسار کیا۔ ''اس کے پاس کوئی ہے، یا وہ اکیلی ہے؟''

''حسان صاحب! ہم یہاں فارغ نہیں بیٹھے کہ موموکی پائینتی سے لگ کر اس کا دل بہلائیں۔ سو کام ہوتے ہیں، فرصت کسے ہے یہاں؟ جب ٹائم ملتا ہے تو چلے جاتے ہیں۔'' انداز میں لاتعلقی اور بے نیازی تھی۔ وہ واقعی سنو وائٹ والی سوتیلی ماں تھی۔

میں ماریہ سے ملنے اسلام آباد سے پنڈی سی ایم ایچ چلا گیا۔ سارہ نے جان بوجھ کر اسے

پنڈی میں داخل کروایا تھا تا کہ اس کا باپ اس سے ملنے روز روز نہ جا سکے۔

میں نے تازہ سرخ گلابوں کا ایک بوکے خریدا اور ہسپتال آ گیا۔ ایسا ہی ایک بوکے میں نے موموکو بھی دیا تھا اور حیدر کہتا تھا، مومو نے وہ...... پھول کتابوں میں سکھا کر رکھے ہوئے تھے۔

موموکو ذہن سے جھٹک کر میں ماریہ کے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

دروازہ ہلکا سا بجا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا وارڈ تھا، درمیان میں پردوں سے پارٹیشن کیا ہوا تھا، ایک طرف ماریہ کا بیڈ تھا، دوسری جانب کا بیڈ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''مومو۔''

ماریہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی، وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نگاہیں گھما کر میری جانب دیکھا۔ ایک دم اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت نما خوشی ابھری تھی۔

''سر آپ ادھر؟'' اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، میں نے اشارے سے روکا۔

''یہ جو اس چھوٹی سی گڑیا نے بغیر بتائے اتنی ڈھیر ساری چھٹیاں کی ہیں نا۔ اس کے لیے اب اس کے سر ڈانٹنے آئے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر پھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

''تھینک یو سر!'' اس نے انہیں سونگھا۔ وہ بہت خوش اور فریش نظر آنے لگی تھی۔ ورنہ جس پل میں داخل ہوا تھا، وہ مجھے بہت پژمردہ لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے، چہرہ سوکھ چکا تھا، گال اندر کو چلے گئے تھے اور رنگت یرقان کے مریضوں کی طرح زرد تھی۔

''مجھے ریڈ روز بہت اچھے لگتے ہیں سر! کیونکہ ان کا میسج بہت اچھا ہوتا ہے۔ ہے نا سر؟'' وہ سر اٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

میرے ذہن کی رو کہیں دور بھٹک گئی، ایسی ہی بات مومو نے بھی کی تھی، میں نے سر جھٹکا۔

''کیسی ہو، مومو؟'' میں اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہوں سر! کل میرا آپریشن ہے۔'' وہ اداس ہو گئی۔

''اداس مت ہوا کرو مومو! تم مجھے بہت عزیز ہو۔'' میں نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے دونوں

ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے دبایا۔

"سر! سارہ مما نے مجھے شروع سے بتا رکھا تھا کہ مجھے کینسر ہے۔ آپ کو پتہ ہے، ڈاکٹرز بچوں کو یہ بات نہیں بتاتے۔" وہ معصومیت بھرے انداز میں سارہ مما کی شکایت لگا رہی تھی۔

"پتہ ہے کیوں؟"

میں نے بھی اسی معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیونکہ جب بچوں کو پتہ چل جاتا ہے ناتو وہ خوف زدہ ہو کر بہت جلدی مر جاتے ہیں۔"

"ماریہ!" میں ایک دم تڑپ اٹھا تھا۔ ہسپتال میں رہ کر وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

"کل تمہارا آپریشن ہے، جس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی، پھر ہم خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" کچھ دیر بعد اسے تسلی دے کر میں اٹھنے لگا تھا۔

اس نے مایوسی سے مجھے دیکھا۔ "آپ جا رہے ہیں، سر؟"

"ہاں، میں کل آؤں گا ماریہ۔" مجھے ہسپتال سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ جتنا وقت میں ماریہ کے ہمراہ گزارتا، مجھے مومو یاد آتی رہتی۔

"آپ نہ جائیں سر!"

"او کے نہیں جاتا!" پتہ نہیں کیوں میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کل میرا آپریشن ہے۔ کیا میں زندہ رہوں گی، سر؟" وہ ڈری سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں کے گرد رکھے۔ "بس بیٹا، ایک چھوٹا سا، معمولی سا آپریشن ہے۔ میرے ایک بھانجے کے ایسے چھ آپریشن ہوئے تھے اور اب وہ چنگا بھلا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی، حالانکہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں تھی۔

اس کی بھوری آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔

"یہ بس چھوٹا سا آپریشن ہے، اس کے بعد تمہیں اس اسپتال اور ان کڑوی کڑوی دواؤں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی، تم بالکل ٹھیک ہو کر گھر چلی جاؤ گی۔"

اس کے سرہانے بیٹھا، میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

"کب ہے آپریشن؟" پھر میں نے پوچھا۔

"صبح چھ بجے۔" اس کا خوف اب کم ہو رہا تھا۔

''بس اب تھوڑا سا ٹائم رہ گیا ہے۔'' میں نے رات کے ساڑھے نو بجاتی سوئی کو دیکھا۔

''سر!'' تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے پکارا۔ ''میں پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھہرو میں، تمہیں کاغذ اور پین لا دیتا ہوں۔'' میں اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں بس مجھے میرا بیگ اٹھا دیں۔'' اس نے اپنے پنک بیگ کی جانب اشارہ کیا، جو میز پر پڑا تھا۔ صد شکر اس کا وہ بیگ اس کے پاس تھا۔

میں نے بیگ اٹھا کر اسے دے دیا۔

اس نے آہستہ سے زپ کھولی، پھر آہستہ آہستہ اندر سے برش، واٹر پینٹس باہر نکالنے لگی۔ ایک کاغذ کو کلپ بورڈ میں لگا کر اس نے پنسل تھام لی۔

''مومو! کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم آرام کرو؟ کل تمہارا آپریشن ہے۔''

میں نے کسی خدشے کے پیش نظر کہا تھا۔

''پلیز سر!'' اس نے اتنی ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا، یہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی، اس لڑکی کی بے بس آنکھیں تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔

''اچھا بنا لو، مگر کیا بناؤ گی؟'' اس نے پنسل کا سر لبوں میں پکڑ کر ایک لمحے کو سوچا، پھر مسکرائی۔ ''موموا!''

''اپنی شکل بناؤ گی؟''

''ارے نہیں سر!'' وہ دھیرے سے ہنسی، اس کی سوکھی، زرد چہرے کی ہڈیاں ہنستے ہوئے نمایاں ہو جاتی تھیں۔

''میں نہیں آپ کی موموں''

''میری موموں؟'' مجھے حیرت ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بہ دقت تمام تصویر بنانے لگی۔

میری مہر النساء ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے، فاتحانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسے مجھے تب دیکھا تھا، جب نائمہ نے میرے سامنے بدزبانی کی تھی۔

''آپ کی موموں بہت اچھی ہے سر! آپ اپنی موموں کو منالیں پلیز۔'' تصویر بناتے بناتے وہ بولی تھی، میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کافی دیر بعد ماریہ نے تصویر مکمل کر لی۔

''کیسی ہے سر؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''بہت اچھی۔'' میں نے سفید کاغذ کو ہاتھ میں لیے اس پر بنا اسکیچ دیکھا۔ وہ نوے فیصد مومو سے مشابہت رکھتا تھا۔

''اب کلرز کرو گی، اس میں؟''

''نہیں میں تھک گئی ہوں۔'' اس نے تھکاوٹ سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔

میں آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگا، جب وہ نیند کی آغوش میں جانے لگی تو اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''میں زندہ رہوں گی نا سر؟''

''میری مومو کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہہ دیا، مگر میرے اندر بہت خوف تھا۔

ساری رات میں اس کے پاس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ چھوٹی سی بچی میرے کندھے پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔

وہ نیند میں تھی، جب ڈاکٹرز اسے لینے آئے، میں اب ایک اٹینڈنٹ بن گیا تھا۔ انہوں نے اسے نیند میں ہی انستھیسیا دیا تھا، حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ اسے جگا دیتے اور میں چند ایک باتیں ماریہ سے کر لیتا، میں نے مومو کا اسکیچ جو مومو نے بنایا تھا، اپنی جیب میں ڈال لیا۔

مسلسل تین گھنٹے ماریہ کا آپریشن ہوتا رہا، تین گھنٹے میں ہسپتال کے سرد، ویران کاریڈور میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ میرے قریب سے آرمی یونیفارم میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹرز گزرتے رہے تو کوئی میری پریشان صورت دیکھ کر تسلی کے دو لفظ بول دیتا تو کوئی ترحم بھری نگاہ ڈال کر چلا جاتا۔

بالآخر میں تھک کر ماربل سے بنے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ سردی کا کوئی احساس مجھے نہیں ہو رہا تھا، میرا رواں رواں ماریہ کے لیے دعا گو تھا۔

تین گھنٹے کا وہ طویل انتظار، بمشکل کٹ ہی گیا اور آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ کرنل ڈاکٹر عابد بیگ باہر نکلے۔

''آپ بچی کے والد ہیں؟'' انہوں نے چہرے پر سے ماسک اور ہاتھوں سے گلوز اتارتے ہوئے مخاطب کیا۔

''نہیں، مگر میں اس کا انکل ہوں۔ کیسی ہے وہ؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''دیکھیے، اس کا تھائی رائیڈ گلینڈ ریموو کرنا تھا، تھائی رائیڈ گلینڈ کے پیچھے ایک Nerve

ہوتی ہے اور......''

''مجھے بتائیں ماریہ کیسی ہے؟'' میں نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔

انہوں نے گہری سانس بھری۔'' وہ جو خاص رگ ہوتی ہے نا، وہ ان کی آپریشن کے دوران کٹ گئی ہے۔ آئی ایم سوری، ماریہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ دراصل اس رگ کو کٹنے سے بچانا بہت مشکل تھا۔''

وہ کیا کچھ کہہ رہے تھے؟ میں سن نہیں پا رہا تھا، مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہت کچھ میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔

میری کلاس روم میں کھڑکی کے ساتھ رکھی وہ کرسی خالی تھی۔ وہ کرسی ماریہ کا انتظار کر رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا، ماریہ مرگئی؟ ماریہ کی ڈیتھ ہوگئی؟ بالکل ایسے ہی ڈاکٹر ہاشمی کی بہو نے کہا تھا، حیدر کی ڈیتھ ہوگئی، حیدر مرگیا! بس اس ایک لفظ کا ناتا تھا زندگی اور موت کے درمیان؟ وہ مرگئی؟ وہ مرگیا؟

کیوں قدرت اتنی ظالم ہوتی ہے؟ ماریہ کو کیوں مار ڈالا؟ کیا مانگا تھا، اس لڑکی نے زندگی سے سوائے اپنے رنگوں، خوشبوؤں اور تتلیوں کے؟ وہ کیوں مرگئی؟

میرے سامنے اسٹریچر پر اس کی میت سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ میں نے لرزتی انگلیوں سے چادر کا سرا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سفید، ساکت چہرہ۔

کتنی امید دلائی تھی میں نے اسے، کتنے جھوٹ بولے تھے، میں نے اس سے، کتنی بار کہا تھا۔'' تم بچ جاؤ گی مومو! تمہیں کچھ نہیں ہوگا، اور وہ مجھ پر یقین کر کے کتنے سکون سے آپریشن تھیٹر چلی گئی تھی؟ کئی برس ہوئے، ایک مومو مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اور آج، ایک دوسری مومو مجھ سے دور جا چکی تھی۔ کیوں مجھے سب چھوڑ کر جاتے ہیں؟

میں ہمیشہ آخر میں تنہا کیوں رہ جاتا ہوں؟

* * *

ماریہ کے چلے جانے کے بعد میں نے کسی کو اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ کرسی خالی رہی۔ مجھ سے میرے اسٹوڈنٹس نے کبھی میرے اس عمل کی وجہ دریافت نہیں کی۔ ایک Batch ختم ہوتا تو دوسرا آ جاتا۔ مدھم سرگوشیوں میں پرانے طلبہ نئے

آنے والوں کو آگاہ کرتے تھے۔ "یہ مومو کی سیٹ ہے۔ وہ کینسر سے مرگئی تھی۔ یہ اس کی جگہ ہے، یہاں کسی نے نہیں بیٹھنا۔ سر کو دکھ ہوگا" اور نئے طلبہ سمجھ کر سر ہلا دیتے۔

ماریہ کی موت کے تین برس بعد جب میں نے کلاس کا فرنیچر بدلوایا تو وہ کرسی وہاں سے نہیں اٹھوائی۔ کھڑکی کے ساتھ وہ ویسی ہی پڑی رہی۔

اس دوران میں نے ایم فل کر کے آرٹ کے شعبے ہی کو پی ایچ ڈی کے لیے منتخب کیا، جب پی ایچ ڈی مکمل ہوا تو میں نے یونیورسٹی میں بطور، آرٹ ڈائریکٹر کے جوائن کر لیا۔

میری اکیڈمی اب بھی جاری تھی اور کھڑکی کے ساتھ والی کرسی اب بھی خالی تھی، مومو اور مومو کی کرسی میری اکیڈمی میں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

* * *

سیاہ مگ میں دو کپ کے برابر کافی پھینٹ کر میں نے آزردگی سے اسے دیکھا تھا۔ ان تمام پچھلے برسوں میں، میں روز صبح دو کپ کافی پھینٹتا تھا۔ اپنے کپ میں دودھ اور چینی ڈال کر پیتا، جب کہ دوسرے کپ میں پھینٹی ہوئی کافی رہنے دیتا...... شاید کہ وہ پلٹ آئے، مگر ہر دن کے اختتام پر جب مومو کہیں نہ ہوتی، تو میں بے حد مایوسی سے اس کی کافی سنک میں بہا دیتا تھا۔

آج میں نے کافی اس کے کپ میں ڈالنے سے پہلے ہی بہا دی، اب کیوں اور کس کا انتظار کروں۔ گیارہ برس کسی کو بھولنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، وہ کیوں واپس آئے گی؟ کیا رکھا ہے، اس کے لئے یہاں؟

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آئندہ اس کی کافی نہیں بناؤں گا۔ وہ اب نہیں آئے گی، وہ کبھی نہیں آئے گی۔

"شاید دودھ والا ہو۔" میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل کر دیکھنا چاہا، مگر ایک لمحے کو تو زمین نے میرے قدم جکڑ لیے۔

میرے سامنے، میرے گھر کے باہر، میرے دروازے پر مومو کھڑی تھی۔ مومو...... میری مومو...... میری مہر النساء میں نے پلکیں زور سے جھپک کر اسے دیکھا، وہ کوئی الوژن نہیں تھا، وہ میری مہر النساء ہی تھی۔

ہلکے آسمانی قمیص شلوار پہنے۔ کندھے پر ہم رنگ دوپٹہ ڈالے، وہ مومو ہی تھی۔

اس کا چہرہ پہلے سے قدرے میچور لگ رہا تھا۔ بال اب ویسے لمبے نہیں تھے، بلکہ کندھوں سے بھی قدرے اوپر تھے۔

اس نے بھورے بالوں میں blonde اسٹریکنگ کرائی ہوئی تھی اور ان کو کیچر میں ایسے باندھ رکھا تھا کہ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔

دروازہ کھلنے پر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''مومو۔'' اس لمحے مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ میری مومو، میری مہر النساء واپس آ گئی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''وعلیکم السلام۔'' خوشی کے مارے مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''آؤ......اندر آؤ۔'' میں نے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اندر آ گئی، اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کوئی تہہ شدہ کپڑا اٹھا رکھا تھا، میں نے دھیان نہیں دیا۔

''آؤ بیٹھو۔'' میں نے لونگ روم میں رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ طائرانہ انداز سے اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی نہایت نزاکت سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں جلدی جلدی اس کے لیے کافی پھینٹنے لگا، اگر میں چند لمحے پہلے اس کے حصے کی کافی نہ گراتا تو کم از کم اسے دکھا کر مرعوب و متاثر کر سکتا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی، اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میرا لونگ روم پہلے کی نسبت بے حد صاف ستھرا ہوتا تھا۔

دفعتاً اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی، گولڈ لیف کی ڈبیہ پر پڑی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''یہ چھوڑی نہیں ابھی تک؟''

کافی پھینٹتے ہوئے میں مسکرایا۔

''بہت کچھ چھوڑ دیا ہے مومو! مگر اس کو نہیں چھوڑا۔''

اس نے سر ہلا دیا، مگر وہ شاید میرے لہجے پر غور کر رہی تھی۔

اس کے کپ میں دودھ ڈال کر میں نے دونوں کپس ٹرے میں رکھے۔ ساتھ شوگر پاٹ رکھا

اور سینٹر ٹیبل پر لا کر ٹرے رکھ دی۔ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر شوگر پاٹ اٹھالیا اور ایک چمچہ میرے کپ میں ڈال کر آدھا اپنے میں ڈالا۔

''تمہیں، تمہیں یاد تھا مومو؟'' میرے من میں نغمے سے گونج اٹھے تھے۔

''میں کچھ بھولی ہی کب ہوں؟'' اپنے کپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے وہ پلکوں کی باڑ جھکا کر بولی۔

میں نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ وہ بنائی میں نے تھی، مگر اس میں چینی مومو نے مکس کی تھی، ایک دم سے بہت ذائقہ آ گیا تھا اس میں۔

''کیسے ہیں آپ سر؟'' چند گھونٹ بھر کر اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر گئی تھیں۔''

اس نے گہری سانس بھری اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

''آپ کی وائف کہاں ہیں؟ سو رہی ہیں؟ میں جلدی آ گئی نا؟''

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میں نے شادی نہیں کی مومو!''

کافی کا کپ لبوں کی طرف لے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ یکدم ساکت سے ہو گئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر بے حد شاکڈ سی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

''جی؟''

''میں نے شادی نہیں کی'' میں نے سر جھٹک کر دہرایا۔

پھر دفعتاً اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ''کیوں، سر؟''

میں نے شانے اچکا دیے۔ ''کوئی ملی نہیں۔''

اس نے سر جھٹکا۔ میں نے بات کا رخ بدل کر پوچھا۔

''کب سے آئی ہوئی ہو ادھر؟''

''سات...... یا آٹھ نہیں، شاید سات......'' وہ ذہن میں حساب کر رہی تھی۔

''اچھا...... یعنی ہفتہ ہو گیا ہے۔''

اس نے گہری سانس کو اندر کھینچ کر مجھے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''آٹھ دن نہیں، آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔''

میں نے بے یقینی کے عالم میں کپ میز پر واپس رکھا۔

''تم آٹھ ماہ سے ادھر ہی ہو؟''

''ادھر نہیں، لاہور میں تھی، پڑھ رہی تھی، ایف ایس سی بھی یہیں سے کی۔

''اور کینیڈا میں پڑھائی نہیں کی؟''

اس کا چہرہ پل بھر کو تاریک سا ہوا تھا۔

''نہیں سر دادو کی ڈیتھ کے بعد کینیڈا سے واپس لاہور آ گئی تھی، کینیڈا سے تو دو سال بعد ہی واپس آ گئی تھی۔ وہاں پڑھائی نہیں کی تھی۔''

مجھے یاد آ گیا تھا۔ ''مومو مجھے حیدر کا بہت......'' میں پل بھر کو رکا'' کیسے تعزیت کروں؟ وہ تو میرا دوست تھا...... میں'' میں کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

''اسے کیا ہوا تھا مومو؟''

''انجائنا کا ایک اٹیک تھا، ہم اسپتال لے کر گئے، مگر ایمبولینس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، پاپا کی ڈیتھ ہو گئی، مجھے چوٹیں آئی تھیں۔'' وہ سر جھکائے بتا رہی تھی۔

''اور تم لوگ کینیڈا چلے گئے؟ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔'' میں نے شکوہ کیا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔

''انتظار؟ پاپا نے انتظار ہی تو کیا تھا، آپ کا روز صبح شام چکر لگاتے تھے، وہ آپ کے گھر کے۔ مگر آپ نہیں آئے۔ دو ماہ تک وہ آپ کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ دو ماہ میں ساٹھ دن ہوتے ہیں سر! اور پھر دادو نے بھی آپ کا انتظار کیا تھا، لیکن جب وہ آپ کی جانب سے بالکل مایوس ہو گئیں تو ہم بین خالہ کے ساتھ چلے گئے۔'' وہ قدرے توقف سے ٹھنڈی ہوتی کافی پر نگاہیں جما کر بولی۔

''آپ کب آئے تھے سر؟''

''تمہارے جانے کے اگلے روز!''

''کیا، کیا آپ نے ان ساڑھے دس، گیارہ سالوں میں؟'' اس کے انداز میں برسوں کی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔

''میں نے آرٹ اکیڈمی کھول لی، پھر پی ایچ ڈی کی اور اب اکیڈمی کے ساتھ یونیورسٹی

میں پڑھاتا بھی ہوں۔"

"آرٹ اکیڈمی۔" اس نے حیرت سے مگ میز پر رکھا۔

"تمہیں رنگوں سے کھیلنا اچھا لگتا تھا نا، میں نے تمہارے لیے اکیڈمی کھولی مومو!" میں کرب سے مسکرایا۔

"تمہارے ہاتھ کہتے تھے کہ تم پینٹر بنوگی۔"

"میرے ہاتھ تو یہ بھی کہتے تھے کہ میں سرجن بنوں گی۔"

"تو......؟"

اس نے گود میں رکھا سفید سا کپڑا میرے سامنے کیا۔ وہ ایک آدورآل تھا۔

"مومو۔" میرے لبوں سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

"میں پینٹر نہیں بن سکی سر! میں سرجن ڈاکٹر بن گئی ہوں، ایک برس پہلے تعلیم سے فارغ ہوئی ہوں، پہلے کچھ عرصہ گنگارام میں جاب کی، پھر ادھر آ گئی۔

"تم......" میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس نے ان رنگوں کو بھلا دیا تھا، جن سے میں نے پچھلے اتنے برسوں بے تحاشا محبت کی تھی۔

"میں پچھلے کئی برس اپنی فطرت کے خلاف بھاگتی رہی ہوں سر! اور اب......" وہ دکھی دل سے مسکرائی۔

"اب تھک گئی تھی، اسی لیے واپس آ گئی۔"

"تمہارے ہزبینڈ اور فیملی؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میری جانب دیکھتی رہی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں نے شادی نہیں کی۔" وہ سر جھکائے بولی۔ اس کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

"کیوں؟" مجھے طمانیت بھی ہوئی تھی اور حیرت بھی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کوئی ملا نہیں۔" پھر اپنا آدورآل اٹھا کر وہ کھڑی ہوگئی۔

"چلتی ہوں سر! آپ کی اکیڈمی آؤں گی۔"

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے قدرے دکھ سے اس کے آدورآل کو دیکھا۔ "تمہیں تو پینٹر

بنا تھا، مومو!''

''زندگی میں سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا ہے، سر!''

وہ مغموم انداز میں کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''مومو!''

آدھا دروازہ کھول کر اس نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ ''کچھ نہیں۔''

''کہہ ڈالیں سر! آپ ہمیشہ باتیں ان کہی چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ بہت پرسکون انداز میں بولی تھی۔

''تم یقین نہیں کرو گی۔''

وہ کھل کر مسکرائی۔ ''کیا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ میرے گھر روز شام کو چھ بجے آیا کرتے تھے؟'' میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھے گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ مومو؟''

''بعض عادتیں فطرت بن جاتی ہیں سر! جب میں بین خالہ کے غیر مانوس گھر کی غیر مانوس لائبریری میں شام چھ بجے آپ کے انتظار میں کتابیں کھول لیا کرتی تھی تو آپ تو پھر بھی ان مانوس رستوں پر سفر کرتے تھے، کب تک آتے رہے تھے، میرے گھر؟''

''دو سال تک؟''

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ میں وہیں ساکت سا کھڑا دروازے کو دیکھتا رہا۔

* * *

اس شام میں اپنی کلاس کو پڑھا رہا تھا، جب ایک دم ٹھٹھک کر رک گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ تمام اسٹوڈنٹس نے میری نظروں کے تعاقب میں دروازے کو دیکھا، وہاں ایک دلنشین مسکراہٹ لبوں پر سجائے مومو کھڑی تھی۔

''میں آ جاؤں سر؟'' اس نے شرارت چھپاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''اسٹوڈنٹس! یہ آپ کی نئی کلاس فیلو ہیں، ڈاکٹر مہر النساء حیدر!'' میں نے اس نازک سی لڑکی کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر صاحبہ یہ میرے بہت اچھے اسٹوڈنٹس ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کو تنگ نہیں کریں گی۔'' میرے لہجے کی شرارت پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''بالکل نہیں کروں گی، میں بیٹھ جاؤں سر؟'' اس نے بچوں کی طرح اجازت مانگی۔ میں نے مسکراہٹ چھپا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کرسیوں کی جانب بڑھ گئی۔ تمام کلاس بھری ہوئی تھی۔ کرسی صرف ایک ہی خالی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی لکڑی کی، وہ کرسی جو دوسرے فرنیچر سے میچ نہیں کرتی تھی۔ موموا اس کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ جس لمحے وہ وہاں بیٹھنے لگی، ساتھ والی نشست پر بیٹھی اٹھارہ سالہ اسماء نے پریشان ہو کر اسے روکا۔

''آپ ادھر نہ بیٹھیں۔''

مومو بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ ''مگر یہاں اور کوئی خالی ہی نہیں ہے، یہ کیا کسی کی جگہ ہے؟''

اسماء نے میری جانب دیکھا اور پھر آہستہ سے مومو کو مخاطب کیا۔ ''یہ سیٹ مومو کی ہے، سر اس پر کسی کو نہیں بیٹھنے دیتے۔'' اسماء کی مدھم سرگوشی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

''مومو؟'' مومو نے بے حد چونک کر اسماء کو دیکھا۔

''سر کی کوئی چھوٹی سی بچی فرینڈ تھی، اس کا نک نیم مومو تھا۔'' ایک دم مومو کھل کر مسکرائی اور اپنا پرس اسی کرسی کے بازو سے لٹکا کر اس پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں پتا ہے یہ میری سیٹ ہے۔'' اس نے اسماء کو کہہ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خوشی، بے یقینی اور تشکر تھا۔ چند اسٹوڈنٹس نے پریشان سا ہو کر مومو کو دیکھا۔

''اٹس او کے...... یہ مومو کی سیٹ ہے۔ بیٹھی رہو، مومو!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

مومو بہت خوش تھی، وہ جو سمجھ رہی تھی، کیا وہ مجھے بتانے کی ضرورت تھی۔

کلاس ختم ہونے کے بعد مومو میرے پاس آئی۔ تمام اسٹوڈنٹس باہر جا رہے تھے، میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

''سر! آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟'' اس نے اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں شیور!'' میں نے اپنا سامان سمیٹ کر چھوٹے سے بیگ میں ڈالا، پھر ایک خیال کے

تحت پوچھا۔ ''آئی کیسی ہو؟''

''ٹیکسی سے!''

''موموا'' میں نے برہمی سے اسے دیکھا۔ ''اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں تھی تو مجھے کہہ دیتیں، میں تمہیں پک کر لیتا۔ ٹیکسی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب خبردار جو آئندہ تم نے پبلک ٹرانسپورٹ یوز کی تو۔''

وہ مسکراتے ہوئے میرے ساتھ باہر آ گئی۔

''تو آپ کو میری پروا ہے سر؟''

میں نے ایک لمحے کو رک کر اسے خفگی سے دیکھا۔

''کیا تمہیں واقعی یقین دہانی کی ضرورت ہے؟''

''نہیں سر!'' وہ فوراً بولی۔ "I Know You Care"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ کا لاک کھولتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم میری زندگی میں سب سے اہم شخص ہو موموا بلکہ میری زندگی میں صرف تم ہی تو ہو۔''
وہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

* * *

روز یونیورسٹی جاتے ہوئے موموکو اسپتال چھوڑ دیتا اور واپسی پر پک بھی کر لیتا۔ اس کا شیڈول روز بدلتا رہتا تھا، مگر میں ہمیشہ اس کے لیے حاضر رہتا تھا۔

اس روز جب اس کی اڑتالیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے اختتام پر میں لینے گیا تو وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

"اتنی لمبی ڈیوٹی؟" میں نے فرنٹ سیٹ پر تھکی ہاری بیٹھی مومو پر ایک نگاہ ڈالی۔

"میری تو کل ہی ختم ہوگئی تھی، مگر ڈاکٹر افشاں کو کہیں جانا تھا، اس لیے میں اس کی جگہ ڈیوٹی کر رہی تھی۔"

"ایک تو تمہاری مروت بھی نا!" مجھے اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔ "خوامخواہ دوسروں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کیا کرو۔"

"تو کیا ہوتا ہے سر؟ ہم دوسروں کے کام آجائیں، اس سے بہتر کیا بات ہوسکتی ہے؟" وہ سہولت سے بولی۔

"افسانوی بات مت کرو مومو! خبردار جو آئندہ تم نے کسی اور کی جگہ ڈیوٹی کی۔" میں نے گاڑی آہستہ کرلی۔ بینک قریب ہی تھا، مجھے بینک سے ایک ڈرافٹ نکلوانا تھا۔

"تم گاڑی پارک کرو ذرا، میں اپنا کام کرلوں، بینک بند ہی نہ ہوجائے۔" گاڑی کی چابی اسے تھما کر میں تیزی سے نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا بینک میں داخل ہوا۔

پانچ منٹ بعد ہی جب میں اپنا کام ختم کر کے باہر آیا تو پارکنگ ایریا میں عجب سماں تھا۔

"میرا دس ہزار کا نقصان کر دیا ہے آپ نے..... اب مجھے بتائیں، میرا نقصان کون پورا کرے گا؟ آپ کو گاڑی نہیں ڈرائیو کرنی آتی تو کرتی کیوں ہیں؟ بہتر ہے کہ آپ کسی ڈرائیونگ

انسٹی ٹیوٹ میں جا کر چند دن کچھ سیکھ ہی لیں۔''

میری سفید کرولا کے سامنے کھڑی مومو، چپ چاپ نچلا لب کچلتے ہوئے ایک درمیانی عمر کے آدمی کی ڈانٹ سن رہی تھی، میں نے ناگواری سے اس آدمی کو دیکھا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں اس آدمی کو مخاطب کیا۔ اس غصیلے آدمی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ ''ان محترمہ نے اپنی گاڑی ریورس کرتے ہوئے، میری گاڑی کی بیک لائٹس توڑ دی ہیں، خدا کی پناہ میں......''

''محترم، ایک منٹ، مجھے ان سے پوچھ لینے دیں۔'' میں نے مومو کو دیکھا۔ ''ہاں بتاؤ، کیا ہوا ہے؟''

''سر! ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ میری گاڑی نہیں تھی، وہ والی کرولا تھی۔'' اس نے اپنے دائیں جانب ہوبہو میری کرولا کی سی ماڈل ساخت اور رنگ والی گاڑی کی جانب اشارہ کیا، جس میں سے ایک فیملی نکل رہی تھی۔

درمیانی عمر کے آدمی نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا، پھر اس دوسری سفید کرولا کی جانب بڑھ گیا۔

''سوری! سر معاف کیجئے گا، مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

چند لمحوں بعد وہ غصیلا آدمی جھاگ کی طرح بیٹھ کر ہم سے معذرت کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' سرد مہری سے کہہ کر میں نے مومو کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

تمام راستہ میں لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ مجھے اس وقت مومو پر اتنا غصہ چڑھ رہا تھا کہ بہتر تھا، میں خاموش ہی رہتا۔

اس کے گھر کے سیاہ آہنی گیٹ کے باہر گاڑی روک کر میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''خدا حافظ۔''

اس نے قدرے شرمندگی سے مجھے دیکھا۔ اس کا بایاں ہاتھ لاک پر تھا، مگر اس نے لاک نہیں کھولا۔ ''سر!''

''خدا حافظ!'' میں بدستور اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ رہا تھا۔

''ناراض ہیں، سر؟'' اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

''ناراض؟'' میں نے ایک جھٹکے سے اس کی جانب چہرہ کیا۔'' مجھے تم پر غصہ آرہا ہے۔ موموا ایک شخص بھرے بازار میں تمہاری انسلٹ کرتا ہے اور تم گونگی بن کر منی رہتی ہو۔ زبردست!''

''میں اس کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہی تھی!''

''خود سے کوئی خاموش نہیں ہوا کرتا موموا غلط کہنے والے کو خاموش کرانا پڑتا ہے۔''

''پر وہ بول رہا تھا، میں بیچ میں کیسے بولتی؟''

''تم اب بڑی ہو گئی ہو ڈاکٹر مہر النساء! پریکٹیکل لائف میں اگر تم سچی ہونے کے باوجود دوسروں کی لعن طعن سنتی رہو گی تو اس سے تمہارے خلیل جبران کے اقوال سچے ثابت نہیں ہو جائیں گے، بلکہ لوگ تمہیں شرمندہ سمجھ کر اور اونچا بولیں گے۔ خود کو ڈیفینڈ کرنا سکھو، موموا!''

''رائٹ سر!'' وہ تابعداری سے سر ہلا کر گاڑی سے اتر گئی، مگر مجھے علم تھا کہ میں جتنا سر پیٹ لوں، وہ کبھی بھی اپنی اس سب سے بڑی کمزوری پر قابو نہیں پاسکتی۔

***

''ارے!'' صبح موموکو جاگنگ ٹریک پر دیکھ کر، میں جو بینچ پر بیٹھا سانس ہموار کر رہا تھا، خوشگوار حیرت سے بول اٹھا۔

''ڈاکٹر مہر النساء اور جاگنگ؟''

''ڈاکٹر حسان اور ریسٹ؟'' اس نے میرے یوں بینچ پر بیٹھنے پر تاک کر حملہ کیا تو میں بے اختیار ہنس دیا۔

''اب ڈاکٹر حسان بوڑھے ہو گئے ہیں موموبی! اب ریسٹ کرنا پڑتا ہے۔''

وہ میرے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس بینچ کے پیچھے لگے درخت کی ٹہنیاں قدرے جھک کر ہمارے سروں پر سایہ کر رہی تھیں۔ بادصبا کے خوشگوار جھونکوں سے ٹہنیوں پہ لگے پتے پھڑ پھڑا سے جاتے تھے۔ مومو نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتا توڑ لیا، پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر گرانے لگی تو میں نے ایک نظر اس کے سفید ہاتھوں اور ان کے درمیان پکڑے پتے پر ڈالی۔

''آپ کو یاد ہے سر! ہم روز ادھر بیٹھا کرتے تھے۔'' وہ پتے کو دیکھتے ہوئے دور کہیں کھوسی گئی تھی۔

''مجھے کچھ بھی نہیں بھولا موموا'' میں نے قدرے تھک کر ٹیک لگالی۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی، سر؟'' اس کے لہجے میں الجھن تھی، وہ سر جھکائے قدرے آگے ہو کر بیٹھی، پتے کے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اس کے کندھوں پر اس کے بھورے Streaking شدہ بال لہرا رہے تھے۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا، کوئی ملی نہیں۔'' میرے لہجے میں آزردگی سمٹ آئی۔

اس نے پتے کا آخری ٹکڑا بھی زمین پر پھینک دیا۔ میں نے اس کے سپید ہاتھوں کو دیکھا اور ایک دم میری نگاہیں ایک چیز پر ٹھہری گئیں۔ میں یک ٹک اس کی کلائی کو دیکھے گیا، وقت جیسے رک سا گیا تھا۔

اس کی مرمریں کلائی میں وہ پنک گھڑی آج بھی موجود تھی، اس کا رنگ پھیکا ہو چکا تھا۔ اس کے ڈائل نے وقت بتانا چھوڑ رکھا تھا، مگر مومو نے اب بھی اسے خود سے جدا نہ کیا تھا۔ اسی پنک رنگ کی گھڑی نے آخر مجھ سے وہ کہلوا دیا، جو میں خود سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جو میں حیدر سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا اور جو میں مومو سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔

''مجھ سے شادی کرو گی مومو؟'' اس خوب صورت پارک کے سنگی بنچ پر بیٹھے نگاہیں اس پنک رسٹ واچ پر جمائے، مجھے دنیا والوں کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی اڑتالیس برس کی عمر کے باوجود ایک چھبیس، ستائیس سالہ لڑکی کو پرپوز کرتے ہوئے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

مومو نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا آپ کو واقعی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے سر؟''

اس کا لہجہ شاکی تھا۔

اور بالآخر میں نے مہر النساء کو پا ہی لیا تھا۔

* * *

میری اور مومو کی شادی 26 نومبر، 1997ء کو بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

تمام گیدرنگ مومو کے گھر پر تھی، میری جانب سے میرے چند دوست تھے، رشتے داروں سے تو میں کب سے کٹا ہوا تھا۔ اور آنٹی کی وفات کے بعد مومو بھی کٹ گئی تھی، سو اس کی طرف سے بھی چند کولیگ ڈاکٹرز ہی تھے۔

البتہ سین کینیڈا سے اسپیشل آئی تھی، مومو کو تیار بھی اس نے ہی کیا تھا۔

جب میں نے حیدر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں سبین کو بجی سنوری مومو کا ہاتھ تھام کر اندر لاتے دیکھا تو ایک پل کو تو میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

لائٹ پنک اور سلور رنگ کی کامدار شلوار قمیص میں ملبوس نازک جیولری پہنے، اس نازک سی لڑکی کے حسن کو ذرا سے میک اپ نے دوآتشہ کر ڈالا تھا۔ باوجود اونچے جوڑے کے، اس کے ماتھے پر گولڈن براؤن اسٹریک شدہ، کٹے ہوئے بال نکل ہی آئے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے مومو کو قدرے سمٹی سمٹی اور نگاہیں جھکائے دیکھا تھا۔

بلیو ساڑھی میں ملبوس سبین نے مومو کو سہارا دے کر صوفے پر بیٹھا دیا۔ یہ وہی صوفہ تھا، جہاں بیٹھ کر برسوں پہلے مومو بہت روئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ، حسان!'' سالیوں کے سے شرارتی انداز میں سبین نے مجھ سے کہا۔ وہ میری سالی تھی، کم از کم وہ خود یہی کہہ رہی تھی، حالانکہ وہ مومو کی خالہ لگتی تھی۔

میں مومو کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ ان میں سے مہندی کی تازہ تازہ، بھینی بھینی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

جوتا چھپائی، دودھ پلائی، ڈھولک، ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس عمر میں مجھے وہ سب بہت بچکانہ لگ رہا تھا۔ بس چند ایک تصاویر اتاری گئیں، جو سبین نے ہی اتاری تھیں۔

رخصتی کے وقت مومو، سبین کے گلے لگ کر خوب روئی تھی، حالانکہ مجھے مومو سے یہ امید نہیں تھی، مگر وہ بہرحال روئی تھی۔

''خالہ! مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے مگر......'' وہ سبین کے گلے لگ کر آنسو بہاتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

''غیروں جیسی باتیں کیوں کرتی ہو...... مومو! تم تو میری بیٹی ہو۔ مائیں تو بیٹیوں کے لیے بہت کچھ کرتی ہیں۔''

سبین نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کیں۔ ''اچھا اب اپنے کزنز سے تو ملو۔''

مومو، مائی حلیمہ اور پھر اپنے تینوں کزنز سے خوب پیار سے ملی اور اپنے آنسو صاف کیے۔

میں نے ہولے سے مومو کا بازو تھاما۔ ''اب مومو میرے حوالے کرو، سبین تم فکر مت کرو۔''

سبین بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

یوں میری زندگی کے اس بہترین دن، خوشبوؤں میں بسی مومو میرے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آ گئی۔

* * *

"لیں یہ کاٹیں میں ذرا گوشت دھولوں۔" پیاز کی پلیٹ چھری سمیت، اس نے میرے سامنے میز پر رکھی اور خود کچن میں چلی گئی۔

میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر، ایک لمحے کو پیازوں کی پلیٹ کو دیکھا، پھر گردن پھیر کر پیچھے بنے کچن میں سنک کے آگے گوشت کو دھوتی مومو کو۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں، یعنی میں ڈاکٹر حسان رضا پی ایچ ڈی پیاز کاٹوں؟" مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

"جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

وہ گھر کے کپڑوں میں ملبوس تھی، بالوں کی پونی بنا رکھی تھی، مگر ماتھے والے بال پھر بھی چہرے پر آ رہے تھے۔ دوپٹہ گلے میں تھا اور آستین کہنیوں تک فولڈ کیے ہوئے تھے۔

"آر یو سیریس؟" میں مصنوعی حیرانی سے چیخا تھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! مجھے بریانی بنانی ہے، اس کا مسالا تیار کرنا ہے اور پیاز آپ کاٹیں گے۔" وہ تیزی سے گوشت کو دھو کر ٹوکری میں ڈالتے ہوئے نگاہیں، اپنے کام کی جانب مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

"واہ! مجھے کیا پتہ تھا کہ تم مجھ سے شادی کے دوسرے ہفتے ہی کام بھی کروانا شروع کر دو گی؟ وہ بھی پیاز اف؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے پیاز اٹھا لیے۔

"اتنی ساری پیاز سے تم ہم دو لوگوں کے لیے کھانا بناؤ گی؟" میں نے چھری سنبھال لی، مگر اپنی پیاری بیوی کو طعنے دینا نہ بھولا۔

"نہیں صرف ہمارے لیے نہیں۔ ساتھ میں مسز فاروق کے گھر بھی بھجوانے ہیں۔ اصل میں ان کا فون آیا تھا، ان کی نوکرانی نہیں ہے نا۔"

"تو انہوں نے تم سے یہ کہا کہ تم ان کو بریانی بنا کر بھیج دو؟ لاحول ولا قوۃ۔" میں نے سر جھٹکا دیا۔

''ارے نہیں وہ کیوں کہتیں۔ انہوں نے تو یونہی ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا تھا، کھانے کی فکر ہی نہ کریں، میں بنا کر بھیج دوں گی۔ بے چاری اتنا شکریہ ادا کر رہی تھیں، مجھے تو شرمندگی ہونے لگی تھی۔''

''استغفر اللہ مومو! وہ اپنا کام نکلوانے والی بے چاری ہیں اور شرمندہ تم ہو رہی تھیں۔'' میں نے پیازوں کا چھلکا اتارتے ہوئے اسے ٹوکا تھا۔

''اف او۔ ایسے تو نہ کہیں حسان!'' ٹماٹر کاٹتے ہوئے اس نے قدرے برا مان کر مجھے دیکھا۔ وہ اب مجھے حسان کہتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے تو اب یہ باقی بریانی تم مسز فاروق کو بھیجو گی؟''

پیاز کاٹتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو آ رہے تھے۔ آواز بھی بھیگ سی گئی تھی۔

''ساری نہیں۔ مسز طاہر کو بھی تو بھجوانی ہے۔'' میں تنک کر اسے دیکھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''وہی طاہر صاحب کی بیگم۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے، جن کی۔ وہ جو ابھی پرسوں ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔'' مجھے یاد دلاتے ہوئے اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں، مگر ہاتھ اسی رفتار سے چل رہے تھے۔

''ہاں یاد ہے تو ان پر کیوں کرم نوازیاں کر رہی ہو؟''

''حسان ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور وہ ابھی تو شفٹ ہوئی ہے۔ ان کو کھانے کی پرابلم ہوتی ہوگی نا!'' سادہ سے انداز میں کہہ کر اس نے کٹے ہوئے ٹماٹر ایک طرف رکھے اور ادرک اٹھا لی۔

''بس! مل گئی پوری کالونی کو مفت کی خادمہ، جو کام کر کے خود ہی شرمندہ بھی ہوگی اور وہ احسان کر کے تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا لے کر مزے اڑائیں گی۔ سبحان اللہ'' میں نے ستائشی انداز میں سر جھٹکا۔

''تم بھی نئی شفٹ ہوئی ہو اور تمہاری بھی ابھی شادی ہوئی ہے، مگر بہت سادہ ہو تم...'' میں گہری سانس بھر کر پیازوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''اوہو حسان!'' اس نے ادرک کاؤنٹر پر رکھی اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی، میرے پاس آ گئی۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا، وہ میرے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔

''اگر ہم کسی کا خیال کریں گے تو کل کو وہ بھی ہمارا خیال کریں گے اور آپ کو کہاں سے غلط فہمی ہوگئی کہ میں حال ہی میں شفٹ ہوئی ہوں؟'' اس نے ہنس کر میری جانب دیکھا۔ ''میں تو ایک برس کی عمر سے اس گھر میں آ جا رہی ہوں۔ میرے لیے تو کچھ بھی نیا نہیں۔''

میں نے سر اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''کیا یہ رشتہ بھی نہیں؟''

''ارے۔'' وہ ہنس پڑی۔ پھر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''رشتہ تو نیا ہے، مگر ہم تو پرانے ہیں نا!''

''اور تو بہت ہی پرانا ہوں۔'' بڑھتی عمر کے احساس کمتری نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، میری آواز میں خود بخود طنز در آیا تھا۔

''اب میں تو میں بھی پرانی ہوتی جا رہی ہوں۔'' وہ مصنوعی اداسی سے بولی۔ ''ستائیس سال کی ہوگئی ہوں۔ بڑی بمشکل سے شادی ہوئی، ورنہ اتنی اوور ایج لڑکی کو کون قبول کرتا؟'' اس نے ایک لمحے کو گالوں پر سے یوں فرضی آنسو پونچھے کہ میں سمجھا وہ رہی ہے، مگر اگلے ہی پل وہ ہنس پڑی۔

کہنے کو تو میں بھی ہنس دیا، مگر دور کہیں میرے دل میں عجیب سا خیال آیا تھا۔

''پتا ہے حسان!'' اس نے لاڈ سے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''میں جب کینیڈا میں تھی تو اکثر سوچا کرتی تھی، پتہ نہیں آپ کا انتخاب کون سی لڑکی ہوگی؟ اور دل ہی دل میں مجھے اس لڑکی سے جیلسی ہوتی تھی اور جب اس روز، پارک میں آپ نے کہا، موموتم مجھ سے شادی کرو گی؟ تو مجھے لگا، میں جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں آپ کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہوں۔''

وہ آنکھیں موندے، بہت جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی، یکدم چونک کر سیدھی ہوگئی۔

''اوہ، آئل گرم ہوگیا ہوگا۔'' وہ کچن کی طرف بھاگی۔

میں نے ایک نظر مومو پر ڈالی، وہ اب چولہا آہستہ کر رہی تھی۔ مجھے چند لمحے پہلے والی اس کی مصنوعی آنسوؤں والی حرکت یاد آ گئی۔

اس روز مجھے علم ہوا تھا کہ مومو بہت اچھی ایکٹریس ہے۔

* * *

''حسان!'' میں بیڈ روم میں بیڈ پر بیٹھا، تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے، ایک تھرلر پڑھ رہا تھا، جب مومو مجھے آوازیں دیتی اندر آ گئی۔

میں نے کتاب پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دیا ''جی شہزادی مہر النساء!''

''اونہوں۔ ایک تو اتنا بیک ورڈ نام رکھا ہے، آپ نے میرا، اوپر سے اس میں شہزادی کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔'' وہ بیڈ کے قریب کھڑی ہو کر خفگی سے بولی۔

''اچھا اچھا، ڈاکٹر صاحبہ فرمایئے۔'' اس کی کولیگز اور اسپتال کا اسٹاف اسے مہر کہتا تھا۔

''ہاں، مجھے ذرا بتائیں، یہ آپ نے بنایا ہے؟'' اس نے ایک سفید کاغذ میری جانب بڑھایا۔

''کیا ہے؟'' میں نے کتاب ایک سائیڈ پر رکھی اور کاغذ ہاتھ میں لے کر کھولا، عینک کو درست کر کے ایک نظر ہی کاغذ پر ڈالی، تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

وہ بارہ سالہ مومو کا اسکیچ تھا، جو بارہ سالہ ماریہ نے بنایا تھا۔

''یہ آپ نے کب بنایا، حسان؟ اور مجھے کیوں نہیں دکھایا؟ کتنا پیارا ہے نا! مگر آپ نے کلرز کیوں نہیں کیے، اس میں؟ اور یہ صرف ہونٹوں پر ریڈ رنگ کیوں کیا ہے؟'' وہ اپنی دھن میں مگن بولے جا رہی تھی۔ جو وہ سمجھ رہی تھی، کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے؟ میں نے ایک اداسی بھری سانس لے کر سر بیڈ کراؤن سے ٹکا دیا، پھر کاغذ کو چہرے کے سامنے کر کے دوبارہ دیکھا۔

''ویسے آپ نے کب بنایا یہ؟'' وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے کھلے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

''یہ میں نے نہیں بنایا۔'' میں نے کاغذ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

بال سمیٹتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔

''پھر......؟'' قدرے الجھن سے اس نے مجھے دیکھا۔

''یہ مومو نے بنایا تھا۔''

''مگر میں...... میں نے نہیں بنایا۔'' گود میں رکھے کیچر اٹھا کر بالوں کو اس میں جکڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔

''تم نے نہیں...... میری ایک اور موموبھی تھی۔''میں نے بغور مومو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ سوالیہ مگر سادہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''ایک لڑکی تھی ماریہ...... میری اکیڈمی میں آیا کرتی تھی۔ اس کا نک نیم بھی مومو تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔''میں نے پھر کن اکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت دھیان سے میری بات سن رہی تھی۔ ماتھے سے بال پھر نکل کر چہرے پر آگئے تھے، مگر وہ میری جانب پوری طرح متوجہ ہونے کے باعث محسوس نہیں کر پائی تھی۔

''مومو......!تمہیں برا نہیں لگا کہ میری ایک دوست بھی تھی؟''اس کے شفاف اور کسی قسم کی رقابت سے بے نیاز چہرے کو دیکھ کر میں نے تنگ آکر پوچھا۔

''برا کیوں لگے گا؟''اس نے حیران ہوکر مجھے دیکھا۔

''یہی کہ میں تم سے محبت کا دعوے دار ہوں اور دوسری جانب تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کی تھی۔''

''ارے نہیں حسان......! میں یہاں سے آپ کو کسی وعدے یا رشتے کا پابند کر کے تو نہیں گئی تھی، جس طرح میں آپ کی جانب سے آزاد تھی۔ اس طرح آپ بھی میری جانب سے آزاد تھے۔ خیر آپ اس لڑکی کا بتا رہے تھے، مومو کا کیا یہ وہی لڑکی تھی، جس کے لیے آپ نے سیٹ خالی رکھی تھی؟''مومو نے فوراً بوجھ لیا تھا۔ وہ جتنی سادہ لگتی تھی؟ تھی نہیں۔

''ہاں، یہ وہی بھی اور اس سے پہلے کہ...... تم واقعتاً کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ، میں تمہیں بتا دوں کہ وہ ایک بارہ سال کی بچی تھی اور مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز تھی۔''

''میں غلط فہمی کا شکار کیوں ہوگی؟ آپ کی طرح شکی ذہنیت نہیں ہے میری۔'' وہ ہنس کر بولی تھی۔''بہت اعتبار ہے آپ پر......''

میں اسے ماریہ کے بارے میں بتانے لگا۔ کس طرح اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال میں داخل کروا دیا اور کس طرح وہ ایک خطرناک آپریشن کی وجہ سے فوت ہوگئی۔ جب میں نے مومو کو بتایا کہ آخری رات میں اس کے ساتھ تھا اور اس نے میرے سامنے مومو کا اسکیچ بنا کر یہ کہا تھا کہ'' آپ اپنی مومو کو منالیں۔''تو مومو بے اختیار رونے لگی تھی، وہ ایسی ہی تھی، دوسروں کے دکھ درد پر رونے والی ہمدردی لڑکی۔

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ کر میں نے بے اختیار سوچا تھا، مومو نے یہ کیوں کہا کہ اسے مجھ پر اعتبار ہے؟

تو کیا مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے؟

* * *

مومو نے بچپن میں کبھی میرا اسکیچ نہیں بنایا تھا۔ یہ رویہ اس نے شادی کے بعد برقرار رکھا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ پہلے وہ مجھے اس خاص ''سلوک'' کی وجہ نہیں بتاتی تھی، البتہ اب اس نے جھینپتے ہوئے بتا دیا تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں غلط سلط نہ بنا دوں۔'' ہاں، مومو کے ڈر بہت لگا کرتا تھا۔

کبھی اس سے کسی سالن میں نمک مرچ تیز یا کم ہو جاتا، یا پھر چاول چپک جاتے تو وہ سارا کھانا اٹھا کر فریج میں چھپا دیتی اور میرے آنے سے قبل ہی ہوٹل سے کچھ منگوا لیتی، یا کوئی اور چیز پکا لیا کرتی تھی۔ اگر میں فریج سے خراب ہوا پکوان ڈھونڈ لوں تو ٹھیک، ورنہ خود سے وہ مجھے کبھی نہیں بتاتی تھی۔

ایک دفعہ سات سٹنگز میں مومو نے پڑوسن مسز طاہر کا پورٹریٹ بنایا، مگر آخری دن اس نے یہ کہا ''کینوس پر پینٹ گر گیا تھا، تصویر ضائع ہو گئی ہے۔'' چند دن بعد مجھے وہ پینٹنگ اس کی الماری سے مل گئی۔ اس میں وہ چہرے کی ساخت ٹھیک سے نہیں بنا سکی تھی۔ میں نے ہنس کر پینٹنگ واپس رکھ دی۔ اگر وہ عادت سے مجبور ہو کر اپنی غلطی کو چھپانا چاہتی ہے تو مجھے مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔

مومو بہت سی باتیں دوسروں کی ناراضی کے خوف سے انہیں نہیں بتایا کرتی تھی، وہ فطری طور پر بہت بزدل تھی۔

مگر مومو حساس بہت تھی، جہاں اسے میری ضروریات کا کہے بغیر علم ہو جاتا، وہاں وہ میرے احساسات تک بھی رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی، میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، اس لیے اگر کوئی فرد کسی پارٹی میں ہم دونوں کے عمروں کے تفاوت پر تبصرہ کر ہی لیتا تو وہ جو بہت نائس تھی، لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سنا دیتی تھی۔

مومو میرے ساتھ خوش تھی اور وہ خوش تھی تو میں بھی خوش تھا۔ عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے؟ ہماری عمروں میں بائیس برس کا فرق تھا، مگر ہماری شادی کے بعد گزرنے والا ہر برس پہلے

سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا تھا، ہم دونوں ایک مثالی جوڑی تھے۔ پرسکون، خوش اور مطمئن۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ میری اور مہر النساء کی کہانی، جو بعض لوگوں کو کسی بھی عام لو اسٹوری کی طرح لگے گی تو بعض کو محبت کی ایک طویل داستان۔

وہ کیا فقرہ ہوتا ہے، فیری ٹیلز کے آخر میں؟ ہاں..... یاد آیا۔

''اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔''

تو میں اپنی داستان کا اختتام بھی اسی فقرے سے کرتا ہوں۔ میں، ڈاکٹر حسان رضا، جس نے ڈاکٹر مہر النساء حیدر سے بے حد محبت کی، طویل مسافت کے بعد شادی کر لی اور یوں ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ یہ تھا ایک اچھی کہانی کا اچھا، خوشگوار انجام! مگر.....

کاش کہ میں یہ لکھ سکتا، کاش میں اپنی کہانی کو یہیں ختم کر سکتا..... لیکن نہیں، ابھی میری اور موموکی داستان اپنے اختتام کو نہیں پہنچی۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے، کیونکہ حقیقی زندگی میں ''ہنسی خوشی'' نام کی کوئی شے نہیں ہوتی.....

یہ موموکی کہانی ہے اور یہ مہر النساء کی کہانی ہے اور عورت کی محبت کی داستانوں کے اختتام پر ہنسی خوشی نہیں ہوا کرتا، یہی بتانے کے لیے تو میں یہ داستان آپ کو سنا رہا ہوں.....

اگر آپ کسی رومانٹک قسم کی افسانوی سی ''ہیپی اینڈنگ'' کے متلاشی ہیں تو یہ داستان یہیں ختم کر ڈالیں۔ صفحے پلٹ کر کوئی رومانوی سی کہانی کھول لیں، جس میں نوجوان اور بے تحاشا خوبصورت لڑکا، لڑکی معمولی رکاوٹوں کے بعد شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگ جاتے ہیں۔

لیکن اگر آپ عورت کی اصل محبت اور عورت کی محبت کے اصل کو جاننا چاہتے ہیں، اس کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ساتھ چند برس اور آگے چلنا ہو گا.....

* * *

میں نے جوں ہی سگریٹ کے پیکٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، مومو نے میرے سامنے میز پر ایش ٹرے رکھی۔

''کم پیا کریں، حسان!'' تھوڑی دیر بعد جب میں عادتاً سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، کچن میں کام کرتی مومو نے خفگی سے کہا تھا۔ ''آپ کو پتا ہے، یہ آپ کو نقصان دے گی۔''

میں نے ایک نظر کچن میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی مومو پر ڈالی۔ آدھے بازوؤں والی اسٹائلش سی قمیص، شلوار پہنے دوپٹہ ایک کندھے پر ڈالے، وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر اس کی بھوری پونی ٹیل سے، بال نکل کر لہرا رہے تھے۔ شادی کے بعد سے لے کر اب تک، اس نے بالوں کی لینتھ اور کٹنگ نہیں بدلی تھی۔

''روز نہیں پیتا۔'' میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے نہایت فرماں برداری سے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

''اب کیا فائدہ؟ اب تو ختم بھی ہو چکی تھی۔'' میری چیٹنگ کو بھانپ کر وہ برا سا منہ بنائے، رخ موڑ کر سبزی کاٹنے لگی۔

ہماری شادی کے ان آٹھ برسوں میں مومو نے کبھی نوکرانی نہیں رکھی تھی، وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ ڈسٹنگ سے گارڈننگ تک، کپڑوں کی دھلائی سے ککنگ تک، موموکو کبھی ہیلپر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا، وہ کہتی تھی۔ ''مجھے اس کے در و دیوار سے اس کے گملوں، اس کی مٹی تک سے پیار ہے۔'' اور وہ اتنے ہی پیار سے اس گھر کے تمام کام کرتی تھی۔ اس نے پریکٹس چھوڑ دی تھی، اس نے آرٹ اکیڈمی چھوڑ دی تھی، وہ بس اپنے گھر سے محبت کرتی تھی، اسے سجاتی، سنوارتی رہتی تھی۔

میں چینل بدلتے ہوئے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا، مجھے بھوک لگ رہی تھی، صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اور اب مومو دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''کھانے میں دیر ہے، فی الحال یہی کھائیں۔'' اسی وقت اس نے آملیٹ اور توس میرے سامنے رکھے۔

''تمہیں کیسے پتا چلا مجھے بھوک لگی ہے؟'' باوجود کوشش اور اتنے برسوں کی پریکٹس کے، میں ہر بار اپنی حیرت چھپا نہیں پاتا تھا۔ جواباً وہ مسکرائی۔ مسکرانے سے اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑ جاتی تھیں، ان لکیروں کے علاوہ کوئی علامت نہیں تھی، جو اس کو چونتیس برس کا بتاتی تھی، وہ اب بھی بائیس تیئس سالہ لڑکیوں کی طرح دلکش اور اسمارٹ تھی۔

''بس مجھے پتا ہے۔'' وہ کہہ کر کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے پلیٹ اپنی جانب کھسکائی اور نیوز دیکھتے ہوئے آملیٹ کھانے لگا، یکدم مجھے پیاس

لگی۔

''یہ لیں...... پانی......'' مومو نے پانی کا لبالب بھرا ہوا گلاس، میرے سامنے میز پر رکھا۔
''موموا تم......'' میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے آملیٹ کھاتے ہوئے چینل بدلا۔ ایک چینل پر ڈرامہ آ رہا تھا تو پتا نہیں کون سا تھا، مگر اس میں ایک اداکار (غالباً ہمایوں سعید) ایک روتے ہوئے، چھوٹے سے بچہ کو اٹھائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سبزی کاٹتے کاٹتے مومو کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ بچے کی رونے کی آواز پر اس نے مڑ کر ٹی وی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سفید سا پڑ گیا تھا۔ وہ چھری پلیٹ میں چھوڑ کر کچن سے نکل کر لونگ روم میں ٹی وی کے قریب آئی، اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی تھیں۔ اس کے لب ہولے سے کپکپا رہے تھے۔

میں نے اس کے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے چینل بدل ڈالا۔

اس کی محویت ٹوٹی تھی۔ اس نے چونک کر گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر سر جھٹک کر تیزی سے کچن میں واپس چلی گئی۔

اس کا یہ ''ردعمل'' میں پچھلے کئی برس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو میں نے کہا تھا نا، ہر کہانی کے اختتام پر ہیپی اینڈنگ نہیں ہوا کرتا تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

ہمارے ہاں اولاد نہیں تھی۔

اس بات کا مجھ پر نہیں، مومو پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

شادی کے بعد اکثر وہ ڈپریسڈ ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار ڈپریشن کے دورے بہت شدید ہوا کرتے تھے۔ وہ اکثر رات کو نیند میں بولتی بھی تھی، میں سننے کی کوشش کرتا، مگر اب میں بوڑھا ہو چکا تھا، میری حسیات کی کارکردگی 50 فیصد تک گھٹ چکی تھی۔ باوجود کوشش کے، میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔

پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''میں بانجھ ہوں، حسان!'' وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

''میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکوں گی۔''

''مجھے نہیں چاہیے اولاد موموا بس تم خوش رہا کرو۔'' وہ آنسو پونچھ کر سر ہلا دیتی، مگر میں جانتا تھا، یہ غم اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس کے وجود کا کوئی حصہ بیچ راہ میں گم ہو گیا تھا۔

خیالات کی رو میں بھٹکے، میں نے ایک دم چونک کر مومو کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے، نچلا لب بے دردی سے کچلتی ہوئی، سبزی کاٹ رہی تھی، اس کی آنکھیں بہہ نکلنے کو بے تاب تھیں۔

میں نے تاسف سے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

* * *

''کب لائٹ آف کرو گی؟'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی مومو کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جو چہرے کی کلینزنگ کر رہی تھی، میرے یوں دیکھنے پر جھینپ کر مسکرائی۔

''کر دیتی ہوں ڈاکٹر صاحب! ذرا کلینزنگ تو کر لوں۔'' وہ نگاہوں کو نیچے جھکائے چھپتے چھپاتے انداز میں بولی۔

میں نے مسکرا کر ساتھ رکھا، فیشن میگزین اٹھا لیا اور یونہی صفحے پلٹ کر نہایت غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

''مومو...... یہ اس ایکٹرس کا کیا نام ہے؟'' میں نے ایک اداکارہ کی تصویر دیکھتے ہوئے جیسے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔ ایکٹرز کے نام یاد رکھنے میں، میں ہمیشہ سے کمزور رہا تھا۔

موئسچرائزر چہرے پر ملتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور قدرے جھک کر صفحے پر دیکھا۔

''ڈیمی مور ہے، نیچے لکھا تو ہوا ہے۔'' وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر اب ڈیمی مور صاحبہ پر لکھا گیا چٹپٹا کالم پڑھنے لگی تھی، اس کے ہاتھ ابھی تک چہرے پر موئسچرائزر مل رہے تھے۔

''اچھا...... میری عینک نہیں تھی، اس لیے پڑھ نہیں سکا۔ اب لائٹ آف کر دو نا!''

وہ میری بات سنے بغیر میگزین پر جھکی قدرے حیرت سے کچھ پڑھ رہی تھی۔

''حسان! یہ لڑکا کون ہے؟'' اس کے چہرے پر متحرک ہاتھ اب رک چکے تھے۔ میں نے ڈیمی مور کے ساتھ تصویر میں کھڑے لڑکے پر بے توجہی سے نگاہ ڈالی اور کیپشن پڑھا۔

''کوئی ایشٹن صاحب ہیں۔''

''نہیں؟'' اس نے میگزین میرے ہاتھ سے لے لیا۔

''یہ تو بچہ ہے بالکل۔''

''تو کیا ہو گیا؟'' میں نے جمائی بمشکل روکی، مجھے نیند آ رہی تھی اور وہ محترمہ لائٹ آف کرنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

''کون ہے بھئی؟ ڈیمی مور کا بیٹا ہے کیا؟''

''ارے نہیں حسان بیٹا کہاں...... بوائے فرینڈ ہے، اس کا۔ مگر یہ تو بالکل ٹین ایجر لگتا ہے۔ اف توبہ...... یہ ڈیمی مور کو اس عمر میں کیا سوجھی!'' اب وہ بڑے شوق سے آرٹیکل پڑھ رہی تھی، میں بور سا ہو گیا۔

''اس عمر میں کیا مطلب؟ وہ تو اب بھی جوان لگتی ہے۔''

''جوان کہاں ہے؟ مجھ سے بھی بڑی ہو گی اور یہ ایشٹن تو اس سے آدھی عمر کا ہے، لو کر لو گل۔ پہلے ڈیمی مور نے اتنے ایجڈ بروس ولس سے شادی کی تھی، تب یہ جوان تھی اور بروس ولس بڑی عمر کا۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور اب بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں تو آدھی عمر کا بوائے فرینڈ! لا حول ولا قوۃ۔

''بس ہوتی ہیں کچھ عورتیں۔ جنہیں......'' ''الیکٹرا کمپلیکس کا شکار'' کہتے کہتے رک گیا۔ یکدم میں بالکل سن سا ہو گیا تھا۔

کئی سال پہلے میں نے موموکو کہا تھا کہ وہ الیکٹرا کمپلیکس کا شکار ہے، مگر اب مجھے یقین سا ہو چکا تھا کہ وہ بالکل نارمل ہے اور اس نے مجھ سے شادی کسی نفسیاتی حس کی تسکین کے لیے نہیں، بلکہ میری محبت میں کی ہے۔

لیکن اس رات، اچانک مجھے وہ بات یاد آ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں، میں ایک دم بے زار سا ہو گیا تھا۔

''لائٹ آف کر دو۔'' میں بستر پر کروٹ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گیا۔

''سو گئے؟'' میگزین سائیڈ پر رکھ کر مومو نے مجھے پکارا تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا، میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔

دن میں کتنی بار میں اپنی شکل دیکھتا تھا۔ کیا میں اس قابل تھا کہ مومو جیسی خوبصورت، پڑھی لکھی اور خود انحصار لڑکی مجھ سے شادی کرتی؟

میں ایک عام سی شکل کا مرد تھا، میرے اندر ظاہری طور پر سوائے ایک گریس فل پرسنالٹی کے کوئی خوبی نہ تھی۔

میرا احساس کمتری نہیں، بلکہ یہ کچھ اور تھا۔ جو مجھے یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک مبہم سا خیال، جسے میں ان گزرے برسوں میں بھلا چکا تھا، ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں واپس آ چکا تھا۔

وہ خیال کیا تھا، کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟

* * *

''ڈاکٹر صاحب کل میرے ساتھ شاپنگ پر تو چلیں۔''

میرے ساتھ پارک میں واک کرتے ہوئے ایک دم مومو نے فرمائش کی۔ جب اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا، وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتی تھی۔

''اچھا...... سوچیں گے۔'' میں نے ٹال دیا، وہ قدرے مایوس ہو کر پتھریلی روش پر چلنے لگی۔

وہ آگے چل رہی تھی، میں پیچھے تھا۔ اطراف میں شام کے نیلگوں سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ اسٹریٹ لیمپس جل اٹھے تھے، آفس سے گھر واپس آنے والوں کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلوں کا شور پارک کے پرسکون ماحول میں خلل ڈال رہا تھا۔ میں اور مومو روز اس ٹائم گھنٹہ بھر واک کرتے تھے۔ یہ وہ گھنٹہ ہوتا تھا، جب ہم دونوں بالکل خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے تھے، ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے، بس اپنی اپنی سوچوں کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ کبھی میں آگے نکل جاتا تو کبھی مومو...... وہ گھنٹہ بھر پرسکون ہوتا تھا۔ ہاں اگر مومو کو کوئی فرمائش کرنا ہوتی تو وہ اسی گھنٹے میں کرتی تھی، جیسے اس روز اس نے کی تھی۔

میں اس سے دو قدم پیچھے چلتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے شولڈر کٹ بال ہمیشہ کی طرح کیچر میں ہاف بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچتے ہوئے چل رہی تھی، جب دفعتاً ٹھٹک کر رکی اور دائیں جانب دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔ ہمارے سے چند قدم کے

فاصلے پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا، سات آٹھ برس کا بچہ اپنی ماں سے باتیں کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی اور چلتے ہوئے ماں کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ مومو ٹھٹک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں مخالف سمت سے آ رہے تھے، ہمارے قریب پہنچ کر ایک دفعہ پھر ہم سے دور جانے لگے تو مومو چہرہ موڑ کر ان کو دیکھنے لگی۔ میں ان سے چند قدم پیچھے تھا، اب مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس لمحے، اپنی نگاہیں اس سات آٹھ سال کے بچے کی پشت پر جمائے مومو کی بڑی، لانبی آنکھوں میں اتنی بے بسی، اتنی حسرت اور اتنا کرب تھا کہ میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

''چلو مومو! گھر چلو......'' میں اسے اس بچے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔

مومو نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اب بھی اس بچے کو اپنی ماں کے ساتھ دور جاتا دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''مومو!'' میں نے اسے دوبارہ پکارا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر ایک دم مڑی اور بھاگتی ہوئی پارک سے باہر جانے والے رستے کی جانب جانے لگی۔

میری عمر اب بھاگنے والی نہیں تھی، سو میں تیز تیز چلتا ہوا، اس کے پیچھے گیا۔ مجھے پتا تھا، وہ گھر جا رہی ہے۔ اس کے پاس رونے کے لیے وہی جگہ تھی۔

''مومو......!'' میں نے درواز بجایا۔

''مومو! دروازہ کھولو...... پلیز کھولو نا!''

مگر اس نے دروازہ نہ کھولا ...... شدید ڈپریشن میں وہ خود کو کمرے میں بند کر لیا کرتی تھی، آج بھی اس نے یونہی کیا تھا۔

''مومو! دروازہ کھولو۔'' میں نے ایک دفعہ پھر کہا، مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

میں نے دروازے میں نصف لاک کی ہول سے اندر جھانکا۔ وہ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر اس کے گھٹنوں پر تھا، اس کا کیچر کہیں گر گیا تھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، وہ خود بھی ٹوٹی ہوئی بکھری بکھری۔ لگ رہی تھی اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز اور ہولے ہولے لرزتا وجود، بخوبی بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

شادی کے بعد یہ پہلی دفعہ تھا، جب وہ بے اولادی کے غم میں یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی

تھی۔ اس طرح ہچکیوں کے ساتھ تو وہ صرف ایک دفعہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر روئی تھی۔ کیا مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ کیوں روئی تھی؟

''مومو.....!'' میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، مگر مومو نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ اب مجھے سسکیوں کے بجائے اونچی آواز میں رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی، میری مومو رو رہی تھی۔ وہ جسے میں نے صرف ایک دفعہ ایسے روتے دیکھا تھا، وہ آج دوسری دفعہ ویسے ہی رو رہی تھی۔ پہلی دفعہ جب وہ ایسے روئی تھی، اس کے باپ نے چپ چاپ اس کی بات مان لی تھی، وہ کہتا تھا۔ ''عمروں کے بے تحاشا فرق والی شادیاں غیر فطری ہوتی ہیں اور جو چیزیں غیر فطری ہوتی ہیں، وہ ایک دن ناکام ہو کر اپنی جگہ واپس آ ہی جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں سے صرف دل ٹوٹتے ہیں۔'' وہی حیدر میرے لیے موموکی بات مان گیا تھا۔

آج اس کا باپ زندہ نہیں تھا، ورنہ اس کو چپ کرا دیتا۔ اس کو منا لیتا۔ میں تھا تو، مگر مجھے اس کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ میں تو کبھی موموکے پیچھے اسے پکارنے بھی نہیں گیا تھا، پھر بھلا میں اب کیسے اسے مناتا؟

اس رات میں اسٹڈی روم میں سو گیا تھا، موموپوری رات روتی رہی تھی۔

* * *

''جلدی آجایئے گا، حسان!'' میں اس صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ مومو نے پیچھے سے آکر کہا۔

میں نے کنگھی کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے پیچھے کھڑی اپنی سمارٹ سی بیوی کا عکس دیکھا۔

''آجاؤں گا جلدی۔ خیر تو ہے نا؟'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھائی۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لے لی، میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''وہ اصل میں آج صارم آرہا ہے نا، اس کی چھٹیاں ہیں۔ خالہ نے اسے پاکستان بھیج دیا ہے۔ میں نے کہا، خوامخواہ وہ لاہور میں دوسرے رشتے داروں کے پاس کیوں رہے۔ اس لیے خالہ کو کہہ دیا کہ چھٹیوں میں وہ ادھر ہی رہے گا۔ آخر میں اور دادو بھی خالہ کی طرف رہتے تھے۔ میں

نے ٹھیک کہا نا حسان؟'' وہ اب پرفیوم مجھ پر اسپرے کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں بالکل ٹھیک کہا۔'' میں ہولے سے اس کا گال چھوکر، اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا۔

صارم کے بارے میں مجھے اتنا یاد تھا کہ وہ ہماری شادی پر موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا، پیارا سا، دس بارہ سالہ بچہ، چلو اچھا تھا، وہ آرہا تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی اور موموجو اپنے کزنز کو اتنا مس کرتی تھی، وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

یونیورسٹی میں کلاس کے دوران اور پھر بعد میں بھی صارم کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ میرا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد مجھے بینک میں کسی کام سے جانا پڑ گیا۔ وہاں سے نکلا تو ایک پرانا دوست راستے میں مل گیا، اسی چکر میں شام ہوگئی۔ مومو کی تاکید میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ سو آرام سے پانچ بجے کے قریب گھر پہنچا۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی، میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ اپنی کتابیں سینٹر ٹیبل پر رکھ کر، میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ یکا یک کچن کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے اس اجنبی کو دیکھ کر چونک سا گیا۔

چھ فٹ سے نکلتا، چوڑے کندھے، اتھلیٹک جسم، وہ جو بھی تھا، اچھا خاصا باڈی بلڈر لگ رہا تھا۔ وہ میری جانب پشت کر کے کھڑا غالباً جوس پی رہا تھا۔ بلیک پینٹ پر سفید ٹی شرٹ میں ملبوس اجنبی نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

''ایکسکیوزمی......؟'' میری آواز پر وہ جوس پیتے پیتے کسی خیال سے چونکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس نے شاید میرے آنے کی آہٹ نہیں سنی تھی۔

پشت سے دیکھنے پر وہ مجھے پورا مرد لگا تھا، اس کی شکل پر ابھی لڑکپن تھا۔ لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مسلز کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا بڑا لگتا تھا۔

''السلام علیکم سر......! میں صارم ہوں۔'' اس نے جوس کا گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر قدرے لاپروا انداز میں تعارف کرایا۔ مجھے تو گویا جھٹکا لگا تھا۔ صارم تو میرے ذہن میں صرف دس گیارہ سال کا بچہ تھا، مگر یہ تو بھرپور مرد لگتا تھا۔ ہماری شادی کے وقت وہ نو یا دس سال کا تھا تو اب سترہ اٹھارہ برس کا ہوگا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔

''اوہ صارم......! سوری میں پہچانا نہیں۔ مومو کے کزن ہو تم، رائٹ......؟'' میں نے

مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، مگر میرے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔ صارم نے بھی قدرے سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔

"ارے حسان، آپ آ گئے؟" اسی لمحے مومو بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا، اس نے مجھے جلدی آنے کو کہا تھا۔

"حسان! یہ صارم ہے۔ بڑا ہو گیا ہے، نا؟" وہ خوشی خوشی تعارف کرا رہی تھی۔ "اور صارم! یہ میرے ہزبینڈ حسان ہیں۔" اس نے ایک دفعہ بھی میرے دیر سے آنے پر شکوہ نہ کیا۔

"میں مل چکا ہوں۔" میں نے آواز میں گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر مجھے وہ لاتعلق نظر آنے والا مغرور سا لڑکا پتا نہیں کیوں، پسند نہیں آیا تھا۔

"مومو......!" میں اندر کمرے میں ہوں، کھانا لگے تو بلا لینا۔" میں کوٹ اتار کر اندر چلا گیا۔

نہا کر میرا خیال تھا کہ میں فریش ہو جاؤں گا، مگر پتا نہیں کیوں، عجیب سی بے زاری میرے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ میں یونہی بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا، جب میں ٹینشن میں ہوں، یا پریشان ہوں تو یونہی لیٹ جاتا تھا۔ مومو فوراً میرے پاس آ کر فکرمندی سے وجہ پوچھتی تھی اور میں اسے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا، مگر اس شام مومو پوچھنے نہیں آئی۔ وہ اپنے کزن کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ اگر وہ پوچھتی تو میں کیا بتاتا، مجھے تو خود نہیں پتا تھا کہ مجھے پریشانی کس بات کی ہے۔

رات کھانے پر وہ مجھے بلانے آئی تو میں خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچن میں رکھی، ٹیبل کے گرد رکھی چار کرسیوں میں سے میری مخصوص سیٹ پر صارم بیٹھا تھا، مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ میں ایک دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مومو کھانا لگانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ صارم میری کرسی پر بیٹھا ہے۔ یا شاید مومو میری جگہ کسی اور کو دینے پر رضامند ہو گئی تھی؟

میں نے ذہن میں آئے وسوسوں کو جھٹک کر اپنی توجہ میز پر رکھی ڈشز پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔

میکرونیز، رشین سلاد، فرائیڈ فش اور چکن ود پائن ایپل۔ اس نے غالباً صارم کے لیے بنائے تھے۔ میرے لیے اس نے الگ سے اچار گوشت بنایا تھا، مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ

میری بیوی کو گھر آئے مہمان کا کتنا خیال تھا، مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''یہ لونا صارم!'' اس نے میکرونیز کی ڈش صارم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔'' اور ذرا فرائیڈ فش ٹیسٹ کرو، تم فش شوق سے کھاتے ہونا۔''

اس کو صارم کی پسند ناپسند کا بخوبی علم تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی، مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ صارم کا بہت خیال رکھ رہی تھی، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''حسان! یہ لیں نا!'' س نے مجھے صرف ایک دفعہ فش کھانے کی آفر کی، مگر میں نفی میں سر ہلا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ میں مچھلی نہیں کھاتا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔

چند لقمے کھا کر ہی میں اٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا گیا کیا؟ مجھے اٹھتا دیکھ کر مومو نے حیرت اور فکرمندی سے مجھے دیکھا تھا۔ صارم اسی طرح لاتعلقی سے کھانا کھاتا رہا۔

''نہیں، اچھا ہے، بس میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ اچھا میں سونے جا رہا ہوں۔'' میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

مجھے افسوس تھا کہ آج ہم دونوں واک پر نہیں گئے تھے۔ کئی سالوں کی روٹین آج صارم کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ پتا نہیں اور کیا کیا ٹوٹنا باقی تھا۔

* * *

چھٹی کے دن میں دیر سے اٹھتا تھا، پھر بھی مومو کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے صبح سویرے اٹھا کر واک پر لے جائے۔ مومو صبح کی واک شام کی واک کی طرح روز نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف چھٹی والے روز کرتی تھی۔ میں ورکنگ ڈیز میں واک پر جاتا تھا اور چھٹی والے دن عموماً سونا پسند کرتا تھا، مگر مومو ہمیشہ اٹھا دیتی تھی۔

اس چھٹی کے روز اس نے مجھے نہیں اٹھایا اور میں خود ہی آٹھ سوا آٹھ بجے جاگ گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا تو صارم اور مومو کچن میں کھڑے تھے۔ مومو آٹا گوندھتے ہوئے بہت دھیان سے صارم کی گریجویشن کا کوئی قصہ سن رہی تھی۔ جب کہ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں چھری تھی، جس سے وہ آملیٹ کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا۔

میں خاموشی سے آ کر لونگ روم کے وسط میں کھڑا ہو گیا، ان دونوں کی جانب پشت تھی۔

"اب آگے کیا کرو گے؟ لاء؟" موموا سے مخاطب کر کے پوچھتی ہوئی، بقیہ آٹا فریج میں واپس رکھنے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ "اتنی جلدی اٹھ گئے آپ؟"

پیاز کاٹتے صارم نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" میں چاہنے کے باوجود بھی لہجے کو شگفتہ نہیں کر سکا اور رخ موڑ کر مومو کو مخاطب کیا۔

"واک پر نہیں چلنا؟"

"آج رہنے دیں حسان! آج تو صارم آیا ہوا ہے۔"

وہ سہولت سے کہہ کر صارم کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کی بڑی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سا رنگ تھا، جو میرے لیے انوکھا تھا۔ یہ بہت پیار بھرا، مگر منفرد سا رنگ تھا۔

"کل بھی واک مس کر دی تھی۔" میں نے دبا، دبا شکوہ کیا، مجھے کوئی پروا نہ تھی کہ صارم لب بھینچتے تمام گفتگو سن رہا تھا۔

"اٹس او کے حسان! واک تو ہوتی رہے گی، مگر صارم تو صرف چند دنوں کے لیے آیا ہے۔"

اس کے انداز میں اطمینان تھا، میں اندر ہی اندر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا۔

میں لونگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ کوئی نئی خبر نہ تھی، ایل ایف او، صدارتی انتخاب، صدر کے وردی اتارنے کا دباؤ، عراق جنگ۔

کچن سے مومو اور صارم کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے اخبار قدرے بے زاری سے میز پر پھینک دیا اور تیزی سے داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مومو مجھے بھلا کیوں روکتی، اس کے خیال میں، میں واک پر جا رہا تھا۔

* * *

"میں تو چیلسی کے ساتھ ہوں اور آپ......؟"

صارم کی آواز پر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ لونگ روم میں بچھے کارپٹ پر رکھے کشن پر بیٹھا، مومو سے مخاطب تھا۔ میں نے ٹی وی اسکرین کو دیکھا، چیلسی اور مانچسٹر یونائیٹڈ کا میچ آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔

''مانچسٹر یونائیڈ کا میچ ہے؟'' قدرے خوشی سے میں نے ریموٹ اٹھا کر آواز اونچی کی۔ مانچسٹر یونائیڈ میری فیورٹ ٹیم تھی۔

موموہاتھ میں چلغوزوں کی پلیٹ لے آئی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ چلغوزوں کی ڈش خود لے کر ایک ایک چلغوزہ نکال کر مجھے پکڑایا کرتی تھی۔ خود وہ کبھی نہیں کھاتی تھی، وہ صوفے پر میرے ساتھ بیٹھ ہی رہی تھی کہ صارم نے پوچھ لیا۔

''آپ کس کے ساتھ ہیں، مہر؟'' وہ موموکو مہر کہتا تھا اور یہی بات تھی، جو مجھے بری لگتی تھی۔ ٹھیک ہے، دونوں کزنز تھے اور آپس میں از حد بے تکلفی تھی، مگر اس کو خود سے عمر میں بڑی موموکو ''آپی'' یا ''باجی'' کہنا چاہیے تھا، لیکن وہ لڑکا......

''کس کا میچ ہے؟'' مومو نے ٹی وی اسکرین کو غور سے دیکھا، جب بھی کسی فٹ بال کلب کا میچ ہوتا، میں اور مومو ہمیشہ مانچسٹر یونائیٹڈ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مجھے پتا تھا، اب بھی وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔

''چیلسی اور ایم یو کا۔ میں چیلسی کے ساتھ ہوں اور آپ؟'' وہ گردن موڑے پوچھ رہا تھا۔

''چلو میں بھی چیلسی کے ساتھ ہوں، خوش؟'' اس نے مسکراتے ہوئے چلغوزے کی گری نکالی۔ صارم نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ مومو نے گری اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس لمحے مجھے اپنا وجود اتنا غیر ضروری، بے وقعت اور بے مول لگا تھا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کتنی آسانی سے مومو نے کہہ دیا تھا کہ وہ چیلسی کے ساتھ ہے۔ وہ کتنی جلدی میرا ساتھ چھوڑ کر صارم کے ساتھ مل گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے، مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اخبار میز پر رکھ کر میں کٹیلے لہجے میں کہتا ہوا، اندر کمرے میں آ گیا، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا اور بازو سے آنکھیں ڈھانپ لیں، مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر مجھے اندازہ ہوا کہ مومو کمرے میں داخل ہوئی ہے۔

''حسان! کیا ہوا ہے؟'' وہ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

میں نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا، مگر اس کی آواز سن کر میرے اندر لگی آگ پر ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔ میری مومو نہیں بدلی تھی، وہ ایسی ہی تھی۔

''حسان!'' اس نے زبردستی میری آنکھوں سے بازو ہٹا دیا۔ میں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟ آپ اٹھ کر کیوں آ گئے؟'' اس نے آہستہ سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر میری طبیعت چیک کرنے کی سعی کی۔

''مجھے نیند آئی ہے۔''

''آپ کو شاید برا لگا کہ میں نے صارم کی سائیڈ کیوں لی۔ ہے نا؟'' وہ میرے دل کی بات جان گئی تھی، میں نے جواب نہیں دیا۔

''وہ بہت Sensitive ہے حسان! اگر میں اسے تنہا چھوڑ دیتی تو وہ ہرٹ ہوتا۔'' وہ دھیرے سے میرے ماتھے پر آئے بال ہٹا کر بولی تھی۔

''کیا وہ واقعی نہیں بدلی تھی؟ اسے صارم کے ہرٹ ہونے کی پروا تھی، مگر میرے ہرٹ ہونے کی نہیں۔'' دل نے کہا تھا۔

''یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہاری پروا کرتے ہوئے پریشان ہو کر اندر آئی ہے۔'' میرے اندر جیسے کسی نے مجھے سمجھایا۔ میں قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

''اٹس او کے مومو! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے واقعی نیند آ رہی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''اچھا چلیں، پھر آپ سو جائیں۔''

''اور تم......؟'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''صارم کہہ رہا تھا کہ اسے پرانی کینیڈا والی البم دکھاؤں تو اب میچ ختم ہونے کے بعد ہی دکھاؤں گی۔ کچھ دیر لگ جائے گی مجھے۔ پھر باتیں بھی تو بہت کرنی ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور میرے اندر دل و دماغ کی جنگ ایک دفعہ پھر چھڑ چکی تھی۔

پتا نہیں وہ کون سی باتیں تھیں، جو ان تین دنوں میں ان لوگوں نے نہیں کی تھیں۔

''آپ میرا انتظار مت کیجئے گا، سو جائیے گا۔''

اس نے کمبل ٹھیک سے میرے اوپر ڈالا۔ لائٹ آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

''الیکٹرا کمپلیکس کا شکار عورت جب عمر کی تیسری دہائی میں پہنچتی ہے تو اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس کو اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں......'' میں نے سر جھٹکا۔ کافی عرصے پہلے کتابوں میں پڑھی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

مگر مومو کو تو الیکٹرا کمپلیکس نہیں ہے۔ وہ ایک نارمل لڑکی ہے، اس نے مجھ سے محبت کی شادی کی ہے، کسی نفسیاتی گرہ کے باعث یہ بندھن نہیں باندھا۔

''محبت کی شادی؟'' کوئی جیسے میرے اندر ہنسا تھا۔

''کبھی خود کو آئینے میں دیکھو، کیا تم اس کے ساتھ سوٹ کرتے ہو؟''

وہ رات بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزری۔

* * *

حالانکہ اس روز یونیورسٹی میں زیادہ کام نہیں تھا، پھر بھی میں نجانے کیوں بے حد تھک گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل و دماغ عجیب بوجھل پن کا شکار تھے۔ فضول وسوسوں سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی مجھے گھیر لیتے تھے۔

گھر آیا تو مومو ہمارے بیڈ روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی، کانوں میں بندے پہن رہی تھی۔ اس نے بال کھول رکھے تھے اور غالباً انہیں بلو (Blow) ڈرائی کر کے سیٹ بھی کیا تھا اور ہلکا ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا، کافی پنک شفون جارجٹ کے ڈریس وہ میں وہ سجی سنوری سی بہت دلکش لگ رہی تھی۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو، مومو!'' بہت عرصے بعد اسے یوں اپنے لیے سجا سنورا دیکھ کر، میری جیسے پورے دن کی تھکن دور ہو گئی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر اپنے مخصوص دلنشین انداز میں مسکرائی۔'' میں تو ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی ہوں۔'' اس کا لہجہ شوخ تھا، میں ایک دم چونکا۔

مومو ایسی شوخ کبھی بھی نہیں رہی تھی، بہت کم عمری میں وہ بوڑھوں کی طرح سنجیدہ رہنے لگی تھی، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس کی آواز میں ایک کھنک سی در آئی تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں

کے مقابلے میں زیادہ خوش اور زیادہ جوان لگی تھی۔

''بہت خوش لگ رہی ہو؟'' بظاہر میں مسکرا رہا تھا، مگر اندر سے میں ناخوش تھا۔

''ہوں۔'' اس نے مسکرا کر شانے اچکا دیئے، پھر دوپٹہ کندھے پر سیٹ کر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولی۔ ''میں صحیح لگ رہی ہوں نا، حسان؟''

میں نے اس کے پیچھے اس کے آ کے اس کے دونوں کندھوں کو تھام لیا۔ ''بہت اچھی لگ رہی ہو مومو......!'' آئینے میں مجھے اس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ چلیں گے؟'' بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں ایک دفعہ پھر سیٹ کرتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''اوہ میں بتانا بھول گئی۔ میں اور صارم دامن کوہ جا رہے ہیں، اس کو میں دراصل پاکستان گھمانا چاہ رہی تھی۔ آپ چلیں گے ساتھ؟''

اس کے شانوں پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ''تو تم اس لیے تیار ہو رہی تھیں؟''

''جی...... آپ آئیں گے؟'' اس نے گردن میں موجود نیکلس کو ٹھیک کیا۔

میں نے اپنے ہاتھ ایک دم اس کے شانوں سے ہٹا دیئے۔ ''نہیں، تم جاؤ۔'' میں اپنے کپڑے نکالنے الماری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی مجھے برچھیوں سے زخمی کر رہا تھا۔

''چلیں...... آپ کی مرضی۔'' اس نے پرس اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ ''کھانا کھا لیجئے گا، ہم تو شاید رات دیر سے آئیں۔'' وہ مجھے جاتے ہوئے ہدایات کر رہی تھیں، میں خاموشی سے الماری میں کپڑے ادھر ادھر کرتا رہا۔

''مہر...... چلیں نا!'' باہر سے صارم کی آواز آئی تھی۔

''ارے آ رہی ہوں نا، اچھا حسان، خدا حافظ!'' وہ عجلت میں کہتی وہاں سے چلی گئی۔

میں الماری کا پٹ کھلا چھوڑ کر کھڑکی کی جانب آیا اور پردہ سرکا دیا۔ وہ دونوں ہنستے بولتے، باتیں کرتے گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے، اتنے خوش کہ انہیں میری کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے، بہت خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

* * *

''صبح سو کر اٹھا تو لونگ روم سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، میں ان دونوں آوازوں کو پہچانتا تھا۔

''اگر اس کا کزن چند دن کے لیے آ ہی گیا ہے تو مجھے یوں جیلسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بے چارہ آخر میرا کیا لیتا ہے؟'' میں نے اپنے دل کو صارم کی طرف سے نرم کرنے کی کوشش کی۔ ''مجھے ان کے ساتھ جا کر مہمان داری نبھانی چاہیے۔'' یہی سوچ کر میں اٹھا اور فریش ہو کر باہر چلا آیا۔

رات وہ دنوں دامن کوہ اور شکر پڑیاں سے خاصے دیر سے لوٹے تھے۔ مومو آئی تو میں سوتا بن گیا، اس نے بھی مجھے نہیں جگایا۔ حالانکہ اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ میں رات دو تین بجے سے قبل نہیں سوتا تھا، سب سے پہلے بڑھاپا نیند ہی تو چراتا ہے......

میں فضول خیالات کو جھٹک کر لونگ روم میں آیا تو مومو اپنا کینوس اور ایزل سیٹ کر کے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں برش تھا، جب کہ دوسرے میں پینٹ کی پلیٹ۔

صارم اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

مومو، جو بہت غور سے کینوس کو دیکھ رہی تھی میری بات پر چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''صارم کا پورٹریٹ بنا رہی ہوں۔'' بات مکمل کرتے وہ برش سے کینوس پر اسٹروک لگانے لگی۔

میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔

مومو نے کبھی میرا پورٹریٹ نہیں بنایا تھا، کتنی منتیں کی تھیں میں نے اس کی، مگر وہ نہیں مانی تھی اور اب...... وہ صارم کا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔ کیا اس کے لیے صارم مجھ سے زیادہ اہم تھا؟

میں کچن کی جانب بڑھ گیا، میں آئینہ نہیں دیکھ رہا تھا، مگر مجھے معلوم تھا کہ میرا چہرہ پل بھر میں تاریک پڑ گیا تھا۔

میری اندرونی توڑ پھوڑ ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

''مومو۔ ناشتا!'' میں نے اسے پکارا تو آواز میں خود بخود سختی اور بے زاری سمٹ آئی تھی۔

''میز پر لگا دیا ہے حسان!...... ہلو نہیں، صارم!'' اس کی توجہ اپنے کینوس پر تھی۔

واقعی میز پر ہر شے سیٹ تھی، میں ناشتا کر کے اٹھا تو کمرے میں استری شدہ کپڑے اور پالشڈ جوتے پہلے سے رکھے تھے۔ میرا ہر کام وہ اب بھی اتنی ہی تندہی سے کرتی تھی، جیسے صارم کے آنے سے پہلے کرتی تھی۔ مگر اب اس کی توجہ بٹ چکی تھی اور مجھے اس کا صارم کو اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا، مجھے مومو مکمل چاہیے تھی، مگر وہ بہت مصروف تھی۔

میں اس سے کوئی بات کہے بنا ہی چلا گیا۔

* * *

''تمہیں یاد ہے صارم! جب میں کینیڈا میں ہوتی تھی تو اکثر سبین خالہ کے پوچھے بغیر، تمہیں باہر لے جاتی اور......'' مومو اور صارم پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میں لونگ روم میں رکھے بڑے صوفے پر بیٹھا، بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا، مگر متوجہ ان ہی کی طرف تھا۔

مومو میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی تھی اور صارم ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں کے قریب رکھے کشن پر بیٹھا، بہت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں مومو کے چہرے پر تھیں اور مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے مجھے اور الجھن ہو رہی تھی۔

''میں بہت چھوٹا تھا۔ اس وقت اس لیے یاد نہیں، مگر مجھے وہ بسکٹ پھر بھی یاد ہیں، جو آپ نے بنائے تھے۔'' مومو نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔

''ممی اکثر ان بسکٹوں کا قصہ سناتی رہتی ہیں۔'' صارم مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

''مہر......! آج پھر وہی بسکٹ بنائیں نا!'' اسی دم صارم نے بچوں کی طرح کہا، مومو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''چلو بنا لیتے ہیں، ویسے میں نے بڑا عرصہ ہوا بسکٹ نہیں بنائے، لیکن چلو، اب تمہارے لیے بنا لیتے ہیں۔'' وہ کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، صارم بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''مگر آدھا کام تم کرو گے، سمجھے؟'' وہ اب مختلف اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں جی، میں آپ کا خادم جو ٹھہرا۔ مفت کا خادم۔'' وہ کچھ جل کر بولا۔ مومو بے اختیار ہنس دی۔

کچن میں کچھ پکاتے وقت مومو اکثر دوپٹہ اتار دیتی تھی، جیسے دوسری خواتین کرتی ہیں، ویسے بھی گھر میں صرف ہم دو ہی ہوتے تھے، کوئی مرد ملازم تو تھا نہیں۔

لیکن اس وقت مجھے کرنٹ لگا، جب صارم کے ساتھ بسکٹ بناتے ہوئے مومو نے لاپرواہی سے کندھے پر لہراتا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا اور دونوں آستینیں کہنیوں تک فولڈ کر لیں۔

'' آپ اس عمر میں بھی کتنی اسمارٹ ہیں مہر!'' صارم بے اختیار کہہ اٹھا تھا اور میں بے یقینی سے اپنی ''حیادار'' بیوی کو دیکھ رہا تھا جو مسکراتے ہوئے تعریف وصول کر رہی تھی۔

جس مومو کو میں جانتا تھا، وہ باہر سر پر دوپٹہ تو نہیں لیتی تھی، مگر جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لیتی تھی۔ کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی در آتی تھی۔

وہی مومو، صارم کے ساتھ ایسے کھڑی تھی؟ ٹھیک ہے کہ وہ اس کا کزن تھا اور چھوٹا تھا، مگر اس کو آپی یا باجی نہیں کہتا تھا۔ وہ نامحرم اور جوان تھا، کوئی بچہ نہیں تھا۔

میں مومو کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، میں اس سے کیا کہتا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر میں ریموٹ صوفے پر پھینک کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مومو اتنی مصروف تھی کہ اسے میرے پیچھے آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

* * *

ان دنوں میں بہت چڑچڑا اور بے زار رہنے لگا تھا، ہر وقت میرا دماغ فضول وسوسے سے بنا رہتا۔ میں جتنی کوشش کرتا کہ ان سے پیچھا چھڑا لوں، وہ اتنے ہی میرے دماغ کو جکڑ لیتے اور کبھی کبھار مجھے وہ فضول نہیں "درست لگتے" تھے۔

مومو بدل رہی تھی، وہ میری مومو نہیں رہی تھی۔ وہ اب صارم کی مہر بنتی جا رہی تھی۔

صارم سبزی نہیں کھاتا تھا، وہ اب چکن بناتی تھی۔ صارم کو پرفیوم بہت اچھے لگتے ہیں، وہ جناح سپر سے کتنے ہی پرفیومز اس کے لیے لے آتی تھی۔ صارم کو بلیو اور گرے کلر اچھا لگتا ہے، مومو ان رنگوں کی بے تحاشا شرٹیں خرید کر اسے گفٹ کر چکی تھی۔ اس کی زبان پر نام ہوتا تو صرف صارم کا، اس کو خیال ہوتا تو صرف صارم کا۔

وہ بن بلایا مہمان اگر ٹھیک سے کچھ نہ کھاتا تو مومو پریشان ہو جاتی۔

"کھا کیوں نہیں رہے؟ میں کچھ اور بنا دوں۔"

اور وہ منع بھی کرتا، تب بھی وہ اس کے لیے مچھلی تلنے لگتی۔ مومو کو پراٹھے بنانا بہت برا لگتا تھا اور اب پچھلے تین ہفتے سے وہ روز صبح صارم کے لیے پراٹھے بناتی تھی۔ صارم کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز میں بے حد نرمی اور آنکھوں میں ایک پیار بھرا تاثر ہوتا تھا۔ میں اس تاثر کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ میرے دماغ میں بار بار خطرے کی گھنٹی بجتی تھی، مگر میں اس کو سننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ شاید میں بے غیرت ہو گیا تھا۔

اپنی اسی کیفیت کے باعث اس روز ان آٹھ برسوں میں پہلی دفعہ میری مومو سے پہلی لڑائی ہوئی۔

میں نے اس سے رات کو کہا تھا کہ وہ میری سفید شرٹ استری کرے، مگر اس نے گرے والی

کردی تھی۔

''یہ کیوں کی ہے؟ میں نے تمہیں بتایا تو تھا!'' بات اتنی بڑی نہیں تھی، مگر میرے اندر ابلنے والے لاوے کو راستہ مل گیا تھا۔

''اوہ سوری حسان! وہ میں صارم کی گرے شرٹ لائی تھی نا تو وہ میرے ذہن میں وہی تھی۔'' وہ ہنس کر اپنی بے وقوفی بتا رہی تھی۔

''میں صارم نہیں ہوں موموٗ!'' ایک دم میں شرٹ پھینک کر غصے سے بولا تھا۔

اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''حسان!''

''میں صارم نہیں ہوں، میں تمہارا عام شکل وصورت والا بوڑھا شوہر ہوں، تم کیوں بھول جاتی ہو؟'' میری آواز میں زہر بھرا تھا۔

''حسان! میرے ذہن میں نہیں رہا، میں.....'' وہ یک دم خاموش ہوگئی۔ ڈانٹ سنتے وقت وہ ایسے ہی ہو جاتی تھی۔

''ہاں، تمہارے ذہن میں صارم کے علاوہ اور رہ کون سکتا ہے، تمہیں کہاں اپنا چھپن سالہ شوہر یاد ہوگا؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ وہ الجھن بھری حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''سنو، یہ میرا گھر ہے، سرائے نہیں ہے۔ تم سبین سے کہو، وہ اپنے بیٹے کے لیے الگ گھر لے لے۔ بہت کماتا ہے، اس کا شوہر۔ مگر خدا کے لیے میری لائف ڈسٹرب نہ کرے۔''

''حسان!'' وہ شاکڈ تھی۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بے چارہ چار دن بعد چلا ہی جائے گا، میں خالہ کو کیسے کہہ سکتی ہوں؟''

''میں امید رکھوں گا کہ چار سے پانچ دن نہ ہوں، ورنہ سبین سے میں خود ہی کہہ دوں گا۔''

اپنی سفید شرٹ اٹھا کر میں واش روم میں گھس گیا۔ یہ امر ہی میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھا کہ صارم چار دن بعد میرے گھر سے دفع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔

* * *

وہ صبح بہت عجیب تھی، میں ایک اچھی نیند لے کر اٹھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے فضا میں کسی انہونی کی بو آئی۔ یوں لگتا تھا، جیسے ہوا مجھے کوئی پیغام دے رہی ہو۔

دل بھی عجیب سا ہو رہا تھا، طبیعت اور بھی بے زار تھی، میں نے ڈریسنگ روم سے اپنے کپڑے اٹھائے اور نہانے چلا گیا۔

یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلا تو یونہی آئینے میں ایک نگاہ خود پر ڈالی۔

گندمی رنگت، عام نقوش، کنپٹیوں کے سفید بال، آنکھوں کے گرد بے تحاشا جھریاں...... میں مومو کے ساتھ ''سوٹ'' نہیں کرتا تھا۔

سر جھٹک کر میں اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا، تب مجھے یاد آیا کہ رات میرے پین کی نب ٹوٹ گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے مومو کے پاس کوئی پین پڑا ہو، جس سے میں آج کے دن کام چلا لوں۔'' مگر مومو، صارم کے لیے پراٹھے بنا رہی تھی۔ میں اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اس الماری کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی الماری میں چار خانے کپڑوں کے تھے، درمیان میں ایک دراز تھی اور سب سے نچلا خانہ جوتوں کا تھا۔ مجھے نہیں علم تھا، وہ اپنی چیزیں کدھر رکھتی تھی۔ میں نے اس کی دراز کھول لی۔ وہاں بے تحاشا برش، پینٹس کے ڈبے، آئل پینٹس کی شیشیاں، رولز، پینسلز اور بہت سے کاغذ رکھے تھے۔ میں الٹ پلٹ کر کوئی قلم تلاش کرنے لگا۔

یک دم میرے ہاتھ کسی شیشی سے ٹکرائے۔ میں نے اسے آئل پینٹ کی شیشی سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا، مگر دفعتاً میری نگاہ اس شیشی پر لگے لیبل پر پڑی۔ وہ آئل پینٹ کی شیشی نہیں تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کا نام پڑھا...... اور اس لمحے، ہاں یہ وہی لمحہ تھا، جب میری بہت خوشگوار زندگی برباد ہوگئی تھی۔

میں نے اس کا نام پڑھا، زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، مجھے چکر سا آیا، میں نے دیوار کو تھام لیا، اگر نہ تھامتا تو گر جاتا ......

مگر گر تو میں گیا تھا۔ میں آسمان سے زمین پر پٹخا گیا تھا۔

وہ شیشی جو میرے ہاتھ میں تھی، وہ مجھے اپنی حیادار، وفاشعار بیوی کی الماری سے ملی تھی۔ وہ برتھ کنٹرول ٹیبلٹس کی تھی۔ بہت سے مناظر، بہت سی باتیں اور بہت سی سسکیاں مجھے یاد آئی تھیں۔

''میں بانجھ ہوں حسان! میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔'' وہ روتے ہوئے کہتی تھی۔
''میں ماں نہیں بن سکتی!'' وہ سسکتی تھی۔
کسی دوسرے کے بچے کو دیکھ کر روتی تھی، کمرہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔
میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری بیوی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں سے مسلسل بے وقوف بناتی آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی، میں بانجھ ہوں اور میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنی رپورٹس نہیں دکھائی تھیں، اس نے کبھی کسی قسم کے علاج کی بات نہیں کی تھی۔

اگر آپ کو میری بات پر جھٹکا لگا ہے تو میں اصل بات آپ کو بتاتا ہوں۔ مومو دراصل کبھی میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ہمدردی اور محبت میں آپ اس بات کو بھلا چکے ہوں، مگر میں نہیں بھولا تھا۔
مجھے یاد تھا، مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ الیکٹرا کمپلیکس کا شکار تھی اور وہ خود بھی یہ بات جانتی تھی۔ اسے پتا تھا، وہ ساری عمر میرے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ بڑھتی عمر اس کے احساسات کو الٹا دے گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، مومو ایک بہت سمجھ دار لڑکی تھی۔ اسے علم تھا کہ تیس چالیس برس کی عمر میں کوئی نوجوان ایسا ہوگا، جس کے آگے وہ ہار جائے گی۔ اس سمجھ دار لڑکی نے بہت سمجھ داری سے ساری پلاننگ کی تھی۔ وہ ماں بن سکتی تھی، مگر وہ ماں بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اولاد کی زنجیر کو پاؤں میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا، ایک نہ ایک دن وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اپنی نفسیاتی حس کی تسکین کے لیے اس نے اپنی ممتا قربان کر ڈالی تھی۔ یہی وہ احساس جرم تھا، جو اسے سکون سے سونے نہیں دیتا تھا۔ بانجھ عورتیں کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کر رویا نہیں کرتیں۔ وہ اکثر نیند میں بڑبڑاتی تھی۔

"I donot wanna do this. Some one help me please!"

اس کا احساس جرم اسے کچوکے لگاتا تھا، کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک مخلص لڑکی تھی، مگر اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔
کتنی ہی دیر شیشی ہاتھ میں تھامے میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

چونتیس برس میں نے اس عورت سے محبت کی۔ چونتیس برس میں سمجھتا رہا کہ میری ماں مجھے چھوڑ سکتی ہے، منگیتر نائمہ بے وفائی کر سکتی ہے، مگر مومو کبھی ایسا نہیں کرے گی۔

اگر مجھ میں غیرت اور عقل ہوتی تو پچھلے تین چار ہفتوں سے جو میرے گھر میں ہو رہا تھا، وہ مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ مومو کا صارم کے لیے التفات میری نگاہوں سے چھپا نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں خود کو کوس کر، اپنی شکی طبیعت کو موردِ الزام ٹھہرا کر خاموش ہو جاتا تھا۔

مگر وہ شیشی...... اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔

بہت دیر میں دیوار کے سہارے ٹیک لگائے، ماؤف ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ کھڑا رہا، پھر جیسے کچھ ہوش آیا تو میں نے انگلیوں میں جکڑی مانع حمل گولیوں کی شیشی جیب میں ڈال لی۔

بہت تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے میں باہر آیا تھا۔ مومو اور صارم کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، میں صرف زمین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے، وہ جوان تھے، زندگی ان کے لیے ہنستی مسکراتی تھی اور میں بوڑھا، بے وقوف مرد دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر آ گیا۔

میں یونیورسٹی نہیں جا رہا تھا، مجھے خود نہیں علم تھا، میں کہاں جا رہا ہوں۔ تمام راستے انجانے لگ رہے تھے۔ جن راستوں کا میں راہی تھا، انہوں نے مجھے کہاں پہنچا ڈالا تھا۔

پتا نہیں، کب اور کیسے میں چلتا ہوا پارک آ پہنچا۔ یہ وہی پتھریلی روش تھی، جہاں میں چودہ برس کی اس لڑکی کے ساتھ جاگنگ کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی کدھر چلی گئی؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟

میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔ میری واحد متاع ''نیک بیوی'' تھی، جواب کہیں بھی نہیں تھی...... میں، چھپن سالہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا، مگر مومو نے تو مجھ سے آنسو بھی چھین لیے تھے۔ میں نے اس کو کئی برس پہلے ''آئی ہیٹ یو'' کہا تھا، وہ اس دن بہت روئی تھی اور پھر اس نے بہت اچھا انتقام لیا تھا، مجھ سے۔

''رضوی صاحب کی بیوی کا پتا ہے، تم لوگوں کو؟'' میری سماعت سے ایک معمر آواز ٹکرائی۔

جس درخت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس کے پیچھے بنچ پر ہماری کالونی کے چند معمر، ریٹائرڈ بوڑھے روز کی طرح گپ شپ کے لیے جمع تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں تھا، ان کی ویسے بھی

میری جانب پشت تھی، وہ...... میری موجودگی سے لاعلم، سی فائیو والے رضوی صاحب کو ڈسکس کر رہے تھے، میری ذہنی کیفیت مجھے ان کی کوئی بات نہ سننے دیتی، اگر میں عارف صاحب کا اگلا فقرہ نہ سنتا۔

''ہاں بھئی، رضوی صاحب نے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن دنوں وہ فیکٹری کے کام سے فیصل آباد گئے تھے، ان کی بیوی ان کے دوست کے گھر آتی جاتی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے رضوی صاحب کو آتے ہی بتا دیا۔ اب بتاؤ، کنوارے، اکیلے رہنے والے مرد کے گھر میں بھلا اس عورت کا کیا کام؟''

''ہاں بھئی، دنیا بڑی فریبی ہے۔ شکلیں جتنی معصوم ہوتی ہیں، کرتوت اتنے ہی گھناؤنے۔ اب یہ ڈاکٹر صاحب کی جوان بیوی کو ہی دیکھ لو تم!'' صبیح صاحب کہہ رہے تھے اور مجھے لگا، میں اگلا سانس نہیں لے سکوں گا۔

''کون ڈاکٹر صاحب؟'' عارف صاحب کو یاد نہیں تھا۔

''سی نائن والے ڈاکٹر صاحب، جنہوں نے اس عمر میں جوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ بھئی۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، ایسی غیر حقیقی اور غیر فطری شادیاں نہیں چلا کرتیں۔ بوڑھا مرد، جوان عورت کو نہیں سنبھال سکتا۔''

مجھے لگ رہا تھا، کوئی مجھے چوک پر کھڑا کر کے کوڑے مار رہا ہو۔

''کیا ہوا احسان صاحب کی بیوی کو؟ وہ تو بڑی اچھی ہے۔ تمہاری بھابی جب بیمار ہوئی تھیں تو روز سوپ بنا کر بھیجا کرتی تھی۔''

''ارے یہ...... ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سوپ بنا کر، معصوم ادائیں دکھا کر اپنے جال میں پھنسانے والی۔ دیکھتے نہیں ہو، کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اس ولایت والے کزن کے ساتھ ادھر پھر رہی ہوتی ہے؟ ہم آنکھیں رکھتے ہیں میاں، کوئی بچے نہیں ہیں۔''

صبیح صاحب کے الفاظ مجھے چھلنی کر رہے تھے، میرا رواں رواں زخمی ہو چکا تھا۔

''صحیح کہتے ہو صبیح! محبت بے غیرت اور بے وقوف بنا دیتی ہے۔''

یہ انتہا تھی، میں اس سے آگے نہیں سن سکتا تھا۔ میں بے وقوف تھا، میں بوڑھا تھا، میں بے غیرت نہیں تھا۔

جس کو مفروضہ سمجھتا تھا، وہ چوک میں بیٹھے لوگوں کے لیے گوسپ بن چکا تھا۔

میرے اندر کا مرد جاگ اٹھا تھا۔ میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے درختوں کے جھنڈ سے نکلا اور ان دونوں کے پیچھے سے تیز تیز قدم اٹھاتا، پارک سے نکل گیا۔

میرا رخ گھر کی جانب تھا، مجھے مومو سے بات کرنا تھی، مجھے اس سے صرف دوٹوک بات کرنا تھی۔ میں مومو کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، میں اس بات کا بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کو معاف کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں بوڑھا ہو چکا تھا، مجھے اس کی ضرورت تھی، اس قسم کے خیالات سے میں نے، اپنے اندر کے غیرت مند مرد کو اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کی، آپ مجھے بے غیرت کہیں گے، آپ کہہ سکتے ہیں۔

بہت آہستگی سے میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا۔ دبے قدم اٹھاتا، میں اندر داخل ہوا۔

مومو اور صارم، میری آمد سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں، میں یونیورسٹی جا چکا تھا۔

میں آگے بڑھنا چاہتا تھا، مگر لونگ روم کا منظر دیکھ کر مجھے اوٹ میں ہونا پڑا۔

صوفے پر بیٹھا صارم تھا، اس کے بہت قریب مومو بیٹھی تھی، اس کا سر صارم کے کندھے پر تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ صارم کا دایاں بازو مومو کے شانوں کے گرد تھا۔

کبھی ان آنسوؤں سے میں بھی ہار گیا تھا اور حیدر بھی۔

''میں تمہیں بہت مس کروں گی، صارم!'' وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''مہر! آپ میری بات کیوں نہیں مان لیتیں؟ آپ میرے ساتھ کینیڈا آ جائیں۔ میں وہاں جلد ہی الگ اپارٹمنٹ لے لوں گا، بس پھر میں ہوں گا اور آپ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔''

''کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے، میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واقعی تمہارے ساتھ چلی جاؤں...... مگر حسان......'' وہ متذبذب تھی۔

''آپ ان کو ایک دفعہ ہی بتا دیں، دوٹوک انداز میں بتا دیں۔'' وہ جیسے چڑ کر بولا تھا۔

''کیا بتا دوں؟''

''یہی کہ آپ ان جیسے خودغرض اور سیلف سینٹرڈ بندے کے ساتھ نہیں، بلکہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔''

''صارم! ایسے مت کہو، میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔'' میرے دل میں خوش گمانیوں

نے سر اٹھایا تھا۔

''ٹھیک ہے، پھر میرے بغیر رہ لیں گی آپ؟'' وہ جیسے خفا سا ہو گیا تھا۔

''نہیں رہ سکتی ناں! یہی تو مسئلہ ہے۔ تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں صارم! میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت ہی تم سے کی ہے۔''

میری خوش فہمیوں کا گھڑا چکنا چور ہو گیا تھا۔

''حسان صاحب سے بھی زیادہ؟''

''آف کورس، صارم! کیا تمہیں شک ہے؟'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

زندگی میں پہلی دفعہ مجھے مومو سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ میرا دل اس پر تھوکنے کو چاہا تھا۔

میں اوٹ سے نکلا۔ وہ دونوں میرے سامنے تھے، مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

''آئی لو یو ٹو مہر!'' صارم اس پر جھکا تھا، مومو نے آنکھیں موند لیں، اس نے مومو کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیئے۔

''میں نے بھی اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' وہ اس پر جھکا، نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

''تو پھر لے جاؤ اپنی مہر کو۔'' ان دونوں کے بالکل سامنے آ کر میں بلند آواز میں بولا تھا۔

کرنٹ کھا کر مومو اس سے علیحدہ ہوئی۔

''حسان آپ!'' وہ کھڑی ہو گئی، اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس نے بے اختیار کندھے پر آیا دوپٹہ، درست کیا، پھر قدرے گھبرا کر چہرے پر بکھرے بال سمیٹنے لگی۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

''تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں، پھر چلی کیوں نہیں جاتیں؟'' میں ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر جیسے جبراً مسکرائی۔

''آپ کب آئے؟ یونیورسٹی نہیں گئے...... جج...... جلدی آ گئے ہیں نا؟''

''نہیں مومو! مجھے تو بہت دیر ہو گئی ہے، اس مقام تک آتے آتے!'' میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر میرا چہرہ دیکھا۔ ''کک..... کیا ہوا حسان؟''

میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

''چونتیس برس، مومو، چونتیس برس میں نے تم سے محبت کی اور تم..... تم گھٹیا عورت.....''

میں نے ایک اور زوردار تھپڑ مارا تو وہ چکرا کر گر گئی، میں نے اسے اپنے پاؤں میں موجود جوتوں سے بھی ٹھوکر ماری۔

''ذلیل..... بدکردار..... حرافہ.....'' میں اسے گالیاں بک رہا تھا۔ وہ صوفے پر گری، چپ چاپ پٹ رہی تھی۔

پھر ایک دم میں نے اپنا ہاتھ روک لیا، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا، اس کا کچر ٹوٹ چکا تھا، مگر مجھے مومو پر ترس نہیں آیا تھا۔

صارم ششدر کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''حسان مجھے معاف کر دیں.....؟'' صوفے پر بیٹھی، مومو میرے قدموں میں آ گئی۔ ''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں..... مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میں.....''

وہ رو رہی تھی، میں نے اپنے بھاری بوٹ سے اس کے چہرے پر ٹھوکر ماری، وہ پیچھے کو گر گئی۔

''غلطی؟ تم اسے غلطی کہتی ہو؟ تم سمجھتی رہیں، یہ بوڑھا ہو گیا ہے تو شاید بے غیرت بھی ہو گیا، مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔''

''بس کریں حسان صاحب! چھوڑیں مہر کو۔'' میں اسے مارنے کو آگے بڑھا تو صارم نے بے اختیار مداخلت کی۔

''شٹ اپ صارم! تم جاؤ یہاں سے۔'' مومو نے ایک دم چیخ کر اسے روکا۔ اس کے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔

وہ اب صوفے کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا۔ اور اس کا چہرہ اپنے بالکل سامنے کیا۔

''آٹھ سال تم مجھے دھوکا دیتی رہیں، کیوں؟ مجھے جواب دو!'' میں چیخ رہا تھا، اس نے ہونٹوں سے رستا خون ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا اور کچھ کہنے کو لب کھولے.....

''مم.....مم.....میں.....'' وہ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دوائی کی وہ شیشی نکال کر اس کے سامنے کی۔

''یہ کیا ہے، مہرالنساء؟''

وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، جیسے دوسو والٹ کا کرنٹ کھا کر لمحے کو دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس کا پورا وجود ایک لمحے کو لرز اٹھا۔

''یہ تم استعمال کرتی ہو نا مومو؟'' میں شیشی اس کے چہرے کے قریب لے جا کر پوچھ رہا تھا۔

وہ اسی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیشی کو دیکھتی رہی۔

''مجھے جواب دو؟'' میں حلق کے بل دھاڑا تھا۔

کچھ کہنے کے لیے کھلے لب، اس نے بند کر کے زور سے آنکھیں بھیچ لیں، پھر انہیں کھول کر میری جانب دیکھا۔

اس لمحے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاید وہ شیشی کسی اور کی ہو۔ موموڈاکٹر تھی، اس نے کسی کو دینی ہوگی۔ شاید میں بالکل غلط ہوں..... کاش ایسا ہو جائے، کاش موموکہہ دے کہ یہ کسی اور کی ہے۔

''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، موموا یہ تم استعمال کرتی ہو؟''

اس نے بہت بے بسی سے میری جانب دیکھا اور پھر مومو، میری مومو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے زور سے شیشی دیوار پر دے ماری۔ میرا سب کچھ جل کر ختم ہو چکا تھا۔

''چلی جاؤ تم یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔''

میں نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آیا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون رس رہا تھا، چہرہ متورم اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، وہ چپ تھی، بالکل چپ۔

''میں نے تم سے محبت کی، بے پناہ محبت، مگر تم بدکردار عورت، تم نفسیاتی مریض..... تم نے میرا مان توڑ دیا موموا نکل جاؤ میرے گھر سے، دفع ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے.....''

میں نے بیرونی دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دینا چاہا۔

''نہیں۔'' وہ ایک دم چیخی تھی۔ ''یہ میرا گھر ہے، میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، اس نے اپنی انگلیوں سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔'' میں وحشیانہ انداز میں اسے باہر دھکیل رہا تھا، وہ میرے تھپڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی، دروازے کا کنارہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میں آپ کی بیوی ہوں، مجھے ایک دفعہ'' وہ روتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

''شٹ آپ۔'' میں نے اسے اپنے بوٹ کی ایک اور ٹھوکر ماری۔

''میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''میں نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اس کی انگلیاں درمیان میں آ کر کچلی گئیں، ان سے خون نکل کر وہیں چوکھٹ پر گرتا رہا۔

میں نے دروازے کھول کر اس کے خون آلود ہاتھ وہاں سے ہٹانے چاہے، وہ دروازے کو پکڑے بیٹھی تھی، جب کہ میں اسے دھکیل رہا تھا۔ اس کی پنک گھڑی اس کشمکش میں وہاں گر گئی۔

''اس گھر سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔'' اس کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں میرے اپنے ہاتھ خون آلود ہو چکے تھے۔

''نہیں آپ ایسے نہیں کر سکتے۔ چونتیس برس کا تعلق یوں ختم نہیں کر سکتے۔ حسان! آپ نہیں......'' وہ دروازہ پکڑ کر رونے لگی۔

''یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا، جب تم میرے گھر میں، میری ناک کے نیچے، اپنے کزن سے افیئر چلا رہی تھیں؟ جب میری غیر موجودگی میں تم مجھ سے بے وفائی کر رہی تھیں؟ تب تمہیں اس چونتیس برس کے تعلق کا خیال نہیں آیا؟'' میں بھڑک اٹھا تھا۔

یک دم مومو نے دروازے کی دہلیز چھوڑ دی، وہ صرف اور صرف مجھے دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ بالکل ساکت ہو چکی تھی۔

''کیا کہا آپ نے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''تم کیا سمجھتی تھیں، مجھے پتا نہیں چلے گا؟ تم میرے گھر میں ایک غیر مرد کے ساتھ افیئر چلاتی رہو گی اور میں، میں بوڑھا اور بے غیرت بن کے تماشا دیکھتا رہوں گا؟ تم جھوٹی، بدکردار، ذلیل

عورت......‘‘ بولتے بولتے میرا سانس پھول گیا تھا۔

اسی لمحے موموز مین سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا، مگر اس کو درد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

’’میں جھوٹی ہوں؟ میں بدکردار ہوں؟ ہاں میں جھوٹی اور بدکردار ہوں، میں آپ کے گھر میں اپنے کزن کے ساتھ افیئر چلاتی رہی ہوں...... ہاں میں بہت بری ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کہا تھا، تم نادان ہو۔ پاپا نے بھی یہی کہا تھا، آپ دونوں نے درست کہا تھا۔ ہاں میں نادان تھی، پاگل تھی، بے وقوف تھی، جو چونتیس برس آپ سے محبت کرتی رہی۔‘‘

وہ مجھے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹی، صارم تو پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔

’’میں......‘‘ اس سے آگے بولنے کی ہمت مومو میں نہیں تھی۔ وہ کب لڑائی جھگڑوں میں بولا کرتی تھی۔

لب بھینچ کر وہ اپنے خون آلود ہاتھ لیے بھاگتی ہوئی صارم کے پاس چلی گئی، میں نے دروازہ بند کر دیا۔

میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ اعتبار اور اعتماد کا ہی تو ہوتا ہے، ہمارے درمیان وہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

میری مومو اپنی بدکرداری، اپنے جھوٹ کا اقرار کر کے میرے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔

* * *

مومو ایک دفعہ پھر میری زندگی سے چلی گئی تو میں زندگی کو آٹھ برس پہلے کی اسٹیج پر لے آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب مجھے مومو کا انتظار نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے آرٹ اکیڈمی بند کر دی اور اپنا خرچ صرف یونیورسٹی سے چلانے لگا۔

وہ گئی تو میرا گھر ایک دفعہ پھر ویران ہو گیا۔ میری ہر شے بے ترتیب ہو گئی، کوئی چیز بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے بالآخر ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔

اس ملازم لڑکے نبیل کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے ناشتے میں تلا ہوا انڈہ اور کافی نہیں دے گا، نہ ہی وہ لونگ روم میں ان ڈور پلانٹس رکھے گا۔ مومو کے تمام پودے میں نے اپنے گھر

سے باہر نکال دیے تھے۔

جس صبح وہ میرے گھر سے گئی تھی، اسی شام میں نے تمام سامان، کپڑے، جوتے، پاسپورٹ وغیرہ بیگ میں ڈال کر حیدر کے گھر پہنچادیا تھا۔ یہ کام میں نے خود نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ملازم کی مدد لی تھی۔

ہر روز صفائی کرتے وقت نبیل دروازے کی چوکھٹ پر لگے سیاہی مائل سرخ دھبوں کو صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ وہ دھبے صاف نہیں ہوتے تھے۔ موموا پنی یادیں میرے گھر میں بکھیر کر چلی گئی تھی۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ ایک بے وفا ماں سے شروع ہوکر بے وفا بیوی پر ختم ہونے والی داستان

میں نے آپ سے کہا تھا نا، میں آپ کو کوئی افسانوی قسم کی Happy ending (خوشگوار اختتام) نہیں دے پاؤں گا، آپ کو چند کڑوے حقائق اپنے حلق سے نیچے اتارنے پڑیں گے۔

تو یہ میری کہانی کا اختتام تھا۔ اگر میں کوئی رائٹر ہوتا تو اپنی اور مومو کی کہانی یہیں ختم کر ڈالتا کیونکہ رائٹر کے پوائنٹ آف ویو سے آگے کچھ بچا نہ تھا۔

لیکن......

میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ باقی ہے، وہ ''کچھ'' جس کے لیے میں آپ کو یہ کہانی سنا رہا تھا۔

* * *

مومو کے جانے کے چار، ساڑھے چار برس بعد، یعنی کل شام میں کینیڈا آیا ہوں۔

مجھے یہاں ایک دنیائے آرٹ کے سیمینار میں شرکت کرنا تھی، ایک جگہ لیکچر دینا تھا اور بس میری کل صبح واپسی ہے۔

کل کی پوری شام سیمینار میں گزر گئی، آج کی صبح یونیورسٹی میں اور بالآخر میں ابھی گھنٹہ پہلے فارغ ہوکر ٹورنٹو کے مال پر آیا ہوں۔

مال کے ایک قدرے مہنگے سے اسٹور سے کچھ شاپنگ کرنے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، ٹورنٹو کی سڑکوں پر پھرتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ میں سرِ راہ مومو سے ٹکرا جاؤں گا۔ وہ رہتی بھی ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہی تھی، اگر اس نے الگ گھر لے لیا ہو تو الگ بات تھی، مگر بین کا

گھر یہیں آس پاس ہی ہوتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مومو، صارم کے ساتھ چلی آئی تھی۔

ایک گارمنٹس شاپ سے لیدر جیکٹ پسند کرتے ہوئے، میں مسلسل اطراف میں دیکھ رہا تھا، مگر وہاں مومو کہیں نہیں تھی۔ بالآخر میں اپنی جیکٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جس لمحے میں کاؤنٹر پر کھڑا پے منٹ کر رہا تھا، مجھے اپنے دائیں جانب ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔

وہ مومو نہیں تھی، وہ صارم تھا۔

وہ بھی اپنے لیے جیکٹ پسند کر رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بڑا اور ہینڈسم ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی داڑھی بطور فیشن رکھی ہوئی تھی۔ اس کا قد اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔

کتنے ہی لمحے میں صارم کو دیکھتا رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور وہ لڑکی مومو نہیں تھی۔

وہ شکل سے ایشین لگتی تھی، مگر شاید پلی بڑھی وہیں تھی۔ مجھے بہر حال صارم کو کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

جیکٹ کی پے منٹ کر کے صارم اپنا شاپر تھامے کسی بات پر ہنستے ہوئے اس لڑکی کے ہمراہ باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

اس کی ہنسی رک گئی، صرف ایک لمحہ لگا تھا، اسے مجھے پہچاننے میں، پھر اس نے منہ پھیر لیا۔

''صارم!'' اپنی انا، عزت نفس کو پس پشت ڈال کر میں نے اسے پکارا تھا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ آ گیا تھا۔

''یس۔'' اس نے یوں مخاطب کیا، جیسے ہم اجنبی ہوں۔

میں ایک قدم آگے بڑھا۔ ''مجھے تم سے بات کرنا ہے۔''

میں نے چونکہ انگریزی میں کہا تھا، اسی لیے اس کے ساتھ موجود لڑکی ''اوکے میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں'' کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

صارم نے تنفر سے مجھے دیکھا۔ ''جی۔ کیا بات کرنی ہے، آپ کو؟'' اس کا انداز کھڑا کھڑا سا تھا۔

''میں مومو کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں، وہ کیسی ہے؟'' ہم دونوں ایک ساتھ شاپ سے

باہر نکلے تھے۔ وہ میری جانب دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کیسا ہونا چاہیے؟" اس نے الٹا مجھ سے پوچھا۔ ہم دونوں روڈ کے کنارے پر کھڑے تھے۔

"شادی کر لی اس نے؟ شاید نہیں کی، کیونکہ تمہارے ساتھ تو کوئی اور لڑکی ہے۔" میں نے طنزیہ کہا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔

"وہ میری منگیتر ہے زیب۔"

"زبردست صارم، بہت اچھا۔ میرا گھر برباد کر کے تم نے منگنی رچا لی، کسی اور سے؟ تمہارے لیے مومو نے مجھے چھوڑا اور تم......!" مجھے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

"سب سے پہلے تو حسان صاحب، آپ اپنی یہ غلط فہمی دور کر لیں کہ، مہر نے آپ کو چھوڑا تھا۔ انہوں نے آپ کو چھوڑا نہیں تھا، آپ نے ان کو گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا اور دوسری بات......" وہ سرد اور کٹیلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار نہ ٹھہرائیں۔ آپ نے اپنا گھر خود برباد کیا تھا۔"

"میں نے؟" میں نے بے یقینی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "میں نے اپنا گھر برباد کیا تھا، یا تم نے؟"

"آپ نے...... آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی۔" وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

"اور تمہارا کوئی دوش نہیں؟"

اس نے ایک جھٹکے سے میری جانب دیکھا "کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے میری بیوی کے ساتھ میرے گھر میں افیئر چلایا۔ صارم! تم نے میری اس بیوی کو مجھ سے چھین لیا، جس سے میں نے چونتیس برس محبت کی تھی۔ اور تم کہتے ہو کہ تم نے کیا کیا؟" شدت ضبط سے میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"حسان صاحب! آپ نے مہر سے "صرف" محبت کی تھی اور محبت "صرف" نہیں ہوا کرتی، محبت اعتبار اور اعتماد کے بنا ادھوری ہوتی ہے۔ آپ نے چونتیس برس مہر سے محبت کی، مگر

اعتبار نہیں کیا، بلکہ آپ نے تو شاید ان سے محبت بھی نہیں کی، آپ کو صرف ان کی ضرورت تھی۔ محبت تو صرف آپ نے اپنے آپ سے کی ہے۔ آپ ایک خودغرض سیلف سینٹرڈ اور خود پسند انسان ہیں۔ آپ کو ہمیشہ سے اپنا مفاد عزیز رہا ہے۔ اور مہر۔ حسان صاحب، آپ چونتیس برس اس عورت کو نہ سمجھ سکے؟ آپ جانتے ہیں مہر کون تھیں؟ آپ نہیں جانتے، آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں سرخی تھی، کرب تھا۔ اس کی آواز سے میرے لیے نفرت چھلک رہی تھی۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں، حسان صاحب! مہر کون تھیں، وہ عوت جسے آپ نے بے عزت کر کے، دھکے دے کر مجھ سے افیئر چلانے کے الزام میں گھر سے نکالا تھا، وہ عورت، حسان صاحب.....وہ عورت میری ماں تھی۔ میری سگی ماں!"

مجھ پر کسی نے آسمان توڑا تھا، میں جیسے کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

"نن.....نن.....نہیں....." میں نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ غلط کہہ رہا تھا، مومو کیسے.....اس کی ماں.....نہیں.....

"یقین نہیں آیا نا آپ کو؟ کیسے یقین آ سکتا ہے، آپ کو؟ آپ تو اپنے شک میں بہت دور تک نکل چکے ہیں۔ آپ تو میرے اور ممی ان کے تعلق کو، ہماری محبت کو اس گندی نظر سے دیکھتے رہے، جس کے بارے میں مجھے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

مجھے لگا صارم رو رہا ہے.....اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔

"میری ماں نے زندگی میں صرف ایک غلطی کی تھی۔ میرے نزدیک یہ غلطی نہیں تھی، مگر ان کے نزدیک تھی۔ جس دن آپ نے ان کو رلایا تھا، ان کی عزت نفس کو کچلا تھا، اس دن انہوں نے روتے ہوئے اپنے پاپا سے کہا تھا کہ اگر حسان نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی مرضی سے کسی سے بھی شادی کر کے خود کو برباد کر ڈالوں گی، شاید تب "سر" کو دکھ ہو اور انہیں میرا خیال آئے۔ یہی پریشانی میرے نانا کی موت کا سبب بنی تھی اور اس کی وجہ بھی آپ تھے۔ صرف آپ! آپ نے ان کو دھتکارا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے صرف آپ کو دکھ دینے کے لیے کینیڈا جاتے ہی سین آنٹی کے دیور سے شادی کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ وطن واپس آئیں اور آپ کو یہ سب کچھ بتا کر دکھ دیں۔ مگر ان کی شادی دو ماہ ہی چل سکی تھی۔ سین آنٹی کے دیور، یعنی میرے فادر

کا دو ماہ بعد ہی ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔

جب سترہ سال کی عمر میں ماں بنیں تو انہیں لگا، انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ وہ مجھے سبین آنٹی کے حوالے کر کے پاکستان چلی گئیں۔ ان کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید باقی تھی کہ آپ ایک نہ ایک دن ان کی محبت کا یقین کر کے ان سے شادی کر لیں گے۔ یہی امید اور یہی خواہش تھی، جس نے ان سے جھوٹ بلوایا۔ یہاں کسی کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔ سبین آنٹی نے سب سے چھپا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں، مہر کی شادی ہو جائے، اس لیے یہ بات مشرقی پوائنٹ آف ویو سے چھپانا ضروری تھی کہ وہ ایک بیوہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہیں اور آپ سے چھپانا تو اور بھی ضروری تھا۔ وہ کہتی تھیں۔

''میں نے حسان سے اس لیے چھپایا کہ وہ شخص تو باسی کھانا نہیں کھاتا تھا، کسی دوسرے کے استعمال شدہ تولیے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، وہ بھلا کسی کی بیوہ کو کہاں قبول کرے گا؟''

میری نزدیک یہ ان کی غلطی تھی، لیکن غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ وہ کوئی پرفیکٹ قسم کا افسانوی کردار نہیں تھیں، وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھیں۔ ان سے بھی حماقت ہوئی تھی اور اس حماقت کا ثبوت میں تھا۔

سترہ برس میں کینیڈا میں سبین آنٹی کے پاس پلا بڑھا، سترہ برس میں ماں کی محبت کو ترسا۔ میری ماں اپنا گھر بسانے کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی، بالکل ایسے جیسے آپ کی ماں آپ کو چھوڑ گئی تھی۔ مگر میں نے حسان رضا کی طرح اپنی ماں کو بے وفا قرار نہیں دیا، میں ان کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ انہوں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا اور اسے چھپانے کے لیے اور بھی کتنے جھوٹ بولے۔

وہ بہت سچے اور حساس دل کی مالک تھیں۔ انہوں نے اپنے بچے کو اس کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ محبت نہیں دی تھی، جس کا وہ حق دار تھا۔ اس لیے ان کے دل میں احساس جرم تھا۔ وہ جب بھی کسی بچے کو دیکھتی تھیں۔ یہ احساس جرم انہیں بری طرح ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ پھر وہ دوسرا بچہ کیسے کر سکتی تھیں۔ مہر کو قدرت نے محبت سے تخلیق کیا تھا، انہوں نے اپنے ہر رشتہ کو پوری محبت اور خیال سے نبھایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھول جاتیں۔ وہ اپنی پہلی شادی کو بھی اپنی غلطی سمجھتی تھیں، احساس جرم اور آپ سے محبت کی اس کشمکش میں وہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں اور شاید اپنے بچے کو ممتا سے محروم رکھنے کے جرم میں وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی

ستاتا تھا، دوبارہ ماں بننے کے عمل میں کہیں یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ پہلے بھی ماں بن چکی ہیں۔ اگرچہ بین آنٹی انہیں سمجھاتی تھیں، لیکن میری ماں کے دل میں ڈر تھا، خوف تھا، اس محبت کے کھو جانے کا خوف، جو اس نے بہت کڑی ریاضت کے بعد پائی تھی، ہاں، میری ماں ڈرتی بہت تھی۔ صرف اسی ڈر خوف کے پیچھے، صرف اپنا گھر بچانے کی خاطر، انہوں نے اپنی ممتا قربان کر ڈالی۔ انہوں نے مجھے خود سے دور رکھا۔"

وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا تھا، وہ رو رہا تھا، وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"سترہ برس میں بن ماں باپ کے اپنے تایا، تائی کے پاس پلتا رہا۔ سترہ برس میں اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا اور وہ بھی پرسکون نہیں تھیں۔ وہ ہر دوسرے بچے میں اپنا صارم ڈھونڈتی تھیں، وہ صارم جسے وہ روتا، بلکتا ٹورنٹو میں چھوڑ کر آئی تھیں..... صرف اور صرف آپ کی خاطر..... آپ کی وجہ سے میں سترہ برس اپنی ماں سے دور رہا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ آپ کی محبت انہیں صارم کو، اپنے بیٹے کو بھولنے پر مجبور کر دے گی، مگر ماں کی ممتا کے آگے ہار گئی تھیں۔"

صارم نے اپنا سر لیمپ پوسٹ کے ڈنڈے سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"پھر انہوں نے مجھے بلوا لیا۔ سترہ برس بعد صرف اور صرف ایک ماہ کے لیے میں ان سے ملنے آیا۔ وہ تیس پینتیس دن ان کی زندگی کے لیے خوشگوار ترین دن تھے۔ ان کا جوان بیٹا، جوان کے کندھے سے بھی اونچا تھا، ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کیوں نہ خوش ہوتیں؟

چونتیس برس انہوں نے آپ کی خدمت کی، حسان صاحب! اور پھر چونتیس برس بعد صرف چونتیس دن اپنے بیٹے کو پیار دینا چاہا، مگر آپ اتنے تنگ دل، خود غرض اور گھٹیا انسان تھے، آپ نے اس پر بھی شک کیا۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بعد جس تیسری محبت کو اس دنیا کی سب سے عظیم اور خالص محبت کہا جاتا ہے، جس سے اللہ اپنی محبت کا موازنہ کرتا ہے، آپ نے اس محبت پر بھی شک کیا۔

صرف آپ کی وجہ سے میں ان کو کبھی "ماں" نہیں کہہ سکا۔ صرف آپ کی وجہ سے میں سترہ برس محرومیوں میں گھرا رہا۔ سترہ برس بعد مجھے میری ماں ملی تھی، مگر آپ نے کیا کیا؟ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔"

وہ سر گھٹنوں پر رکھ کر ہچکیوں سے رو رہا تھا اور میں...... میں...... ساکت سا کھڑا، اس اونچے لمبے لڑکے کو روتے دیکھ رہا تھا، میرے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا تھا۔

''مومو نے...... کیوں نہیں بتایا، یہ سب مجھے؟ صرف...... صرف ایک بار تو اعتبار کیا ہوتا مجھ پر! ایک بار تو کہا ہوتا کہ اس کا بیٹا بھی ہے، کیا تب میں اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھ کر نہ پالتا؟'' میری آواز دور کہیں سے کسی کھائی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''ہاں!'' صارم نے تنفر سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔'' میں نے بھی یہی کہا تھا ان سے، جب آپ نے ان کو نکال دیا تھا۔

اور جانتے ہیں، انہوں نے آگے سے کیا کہا؟ انہوں نے کہا'' صارم! تم نہ بھی ہوتے تب بھی حسان مجھے مجرم ثابت کر ہی دیتے، میں انہیں اپنے پہلے شوہر کا بتا دیتی تو وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کے طعنے دیتے، میں سوچ میں گم ہوتی تو وہ مجھ پر اپنے سابقہ شوہر کو یاد کرنے کا شک کرتے۔ شک اس آدمی کی رگ رگ میں بھرا ہے۔'' اور آپ کہتے ہیں، وہ آپ پر اعتبار کرتیں؟ انہوں نے تو آپ پر بہت اعتبار کیا تھا، بس آپ نے ان پر نہیں کیا تھا۔

جس دن آپ نے ان کو گھر سے نکالا تھا، اس رات وہ میرے کندھے سے لگ کر بہت روئی تھیں اور میں...... میں ان کے ساتھ رویا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں۔

''صارم! مجھے جگا دو، میں نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔'' وہ اپنے چہرے پر ہاتھ لگا کر روتی تھیں۔

''صارم! حسان نے میرے منہ پر بوٹ مارا......''

وہ اپنے زخمی ہاتھ دیکھ کر روتی تھیں۔ ''انہوں نے میرے ہاتھ دروازے میں کچل ڈالے...... وہ تو میرے آرٹسٹک ہاتھوں سے بہت محبت کرتے تھے، مجھے کانٹا بھی چبھ جاتا تو تکلیف انہیں ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے یہ کیا کر دیا۔

اس رات میری ماں بہت روئی تھی اور اس رات مجھے پہلی بار آپ سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میرا دل آپ کو قتل کرنے کو چاہا تھا۔''

صارم روتے ہوئے، بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا اور کوئی مجھے دو دھاری تلوار سے ذبح کر رہا تھا۔

یہ میں نے کیا کر ڈالا؟ میرے خدا...... یہ میں نے کیا کر ڈالا؟

میں نے اپنی موموکو اپنے گھر سے نکال دیا؟

اس موموکو جس کے لیے میں کتابیں لاتا تھا، جس کے ساتھ میں کافی پیتا تھا، جس کے رنگوں اور تتلیوں سے میں محبت کرتا تھا...... میرے اللہ...... میں نے اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کے ساتھ کیا کر ڈالا؟

سترہ برس بعد اسے اس کا بیٹا ملا تھا اور میں نے اس کو کیا سزا دے ڈالی؟ میں نے اس کے چہرے پر اپنا بھاری جوتا مارا، وہ جوتا اس کی پلکوں سے بھی تو لگا ہوگا، اس کی ان پلکوں سے جن سے مجھے محبت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ لہولہان کر ڈالے، وہ ہاتھ جن کو میں دنیا کے خوبصورت ترین ہاتھ کہا کرتا تھا۔ میں نے اس کو ایک دفعہ پھر رلایا، یہ کیا کر دیا میں نے؟

اپنی خودساختہ تصوریوں میں، اپنی فضول سوچوں سے میں نے اپنے آنگن کو جلا ڈالا؟ یہ کیا کر دیا میں نے؟

''آپ نے مجھ سے میری ماں چھین لی، حسان صاحب! اب آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

وہ سرخ، گیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا، میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں تھا۔

''صارم......! مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔ میں...... میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ...... وہ...... مجھ سے ناراض نہیں ہوسکتی۔ وہ کبھی مجھ پر ناراض نہیں ہوئی۔''

میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا تھا، میرے ہاتھ صارم کے آگے جڑے تھے۔

''سوری حسان صاحب......! اب آپ کو دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ کو روزِ حشر اپنے کیے کا جواب دینا ہوگا۔ میری ماں دو سال پہلے تھائی راڈ گلینڈ کے کینسر سے مر گئی۔ آپریشن کے دوران ان کے تھائی راڈ کے پیچھے والی رگ کٹ گئی تھی، نہ بھی کٹتی تو بھی اندر سے تو، آپ نے انہیں مار ہی ڈالا تھا۔''

اس نے بے حد نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"آپ جو خود کو بہت ذہین سمجھتے تھے، ایک ماں کی محبت کو نہ پہچان سکے، مگر آپ بھی کیسے پہچانتے، آپ نے ماں کی محبت دیکھی کب تھی؟"

میں گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھا ہوں اور صارم..... صارم جا چکا ہے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا، آپ کو۔ مجھے میرا علم مجھے دھوکا دے گیا تھا۔ کتابوں میں لکھی ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ صرف علم کا سہارا بہت کمزور ہوتا ہے۔ کتابوں میں جو تھیوریاں ہوتی ہیں، انہیں جیتے جاگتے انسانوں پر اپلائی کرنا، کتنا غلط ہوتا ہے۔ ہم ایک جہاں کا علم حاصل کر لیتے ہیں، دنیا بھر کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں، لیکن ایک انسان کو نہیں جان پاتے، اسے نہیں سمجھ پاتے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا، آپ کو کہ اس دنیا میں فلمی اور افسانوی رومانس بھری جذباتی کشش جسے آپ اور میرے جیسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک محبت ہوتی ہے، وہ محبت جس کا مقام اس دنیا کے تمام رشتوں میں پائی جانے والی محبت سے ارفع ہے۔ وہ محبت ماں کی محبت ہوتی ہے اور میں وہ بدقسمت انسان ہوں، جو کسی بھی محبت کو نہیں پہچان سکا۔ پہچانتا بھی کیسے ماں کی محبت تو دیکھی ہی نہیں تھی، تھیوریوں پر یقین کر کے میں موموکی محبت پر بھی یقین نہیں کرتا تھا۔

اور اب..... صارم میرے پاس سے جا چکا ہے، جاتے ہوئے وہ کہہ کر گیا ہے کہ جس مومو کے بارے میں آپ کو فخر تھا کہ وہ آپ کے پکارنے سے پہلے ہی آ جاتی تھی، آج آپ اس کو جتنا پکاریں گے، وہ نہیں آئے گی۔

میری مومو بھی اس بیماری سے مر گئی، جس سے کئی برس پہلے ایک اور مومو مر گئی تھی۔

میں، جس نے کبھی مومو کو نہیں منایا، آج ٹورنٹو کی اس مصروف سڑک کے کنارے، گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس لڑکی کو کیسے مناؤں، جس سے میں نے چونتیس برس محبت کی؟

میں اپنی مومو، حیدر کی مہر النساء اور صارم کی مہر کو کیسے پکاروں؟

اسے کہاں ڈھونڈوں؟

* * *